

ایک چھاپا

ایک چھاپا

(جملہ حقوق بحق منیر اقبال ستین محفوظ)

پہلی بار ————— ۱۰۰۰

اگست ۱۹۶۰ء

قیمت :- چار روپے پچاس نئے پیسے

ناشر :- مکتبہ ”صبا“ حیدرآباد (آندھرا پردیش)

اپنے بارہ سالہ بچے فرید

کے نام

جس کی اچانک موت نے

میرے دست و بازو کی ساری

قوت سلب کر لی

کتابت محمد منظر

تزیین عنوانات قیصر سرمست

حسن کار سعادت

طباعت نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

گردپوش ونکیٹیشور پریس

رائٹس انتخاب پریس

فوٹو ریگل

بلاک ڈوان

محمد مظہر کی پُر خلوص شخصیت، اس کی شرافت نفس اس کی متخل ہی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ فنِ کتابت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے۔ کاتبوں کے ساتھ جو روایات منسوب ہیں ان سے وہ اس طرح شرم محسوس کرتا ہے جیسے یہ روایات فنِ کتابت ہی سے منسوب ہو گئی ہوں اور اسی بات کے ردِ عمل کے طور پر وہ بڑے فخر سے اپنے نام کے ساتھ مظہر کاتب لکھتا ہے تاکہ آپ اس کی اپنی شخصیت کے تعلق ہی سے نہیں بلکہ اس کے ہم پیشہ ہر فرد سے متعلق اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔

محمد مظہر نے ”ابلی پر چھائیاں“ کے بہانے مجھے اپنی کتنی ہی محبتیں دیں۔ اتنے چاؤ سے اس نے میری کتاب لکھی جیسے وہ خود اس کی اپنی تخلیق ہو۔ یہ بھی ہوا کہ ایک بار لکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیجا گئیں۔ سوچتا ہوں کہ اس کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کی اجرت ادا کر سکوں بھی اس قرض کو کیسے چکا سکوں گا جو بے اندازہ خلوص کی صورت میں اس نے مجھے دیا ہے۔

مظہر نے ۱۹۵۶ء میں آندھرا پردیش خوش نویس یونین کی بنا ڈالی۔ وہ اس انجمن کا روح رواں ہے۔ پچھلے سال وہی سکریٹری تھا، اور اس سال اس کے ساتھیوں نے جن میں اس کے ہم پیشہ بزرگ بھی شامل ہیں اسی نوجوان کو اپنا پریسڈنٹ چنا ہے۔

قیصر سر مست

بچپن ہی سے اسے آرٹ سے دلچسپی رہی لیکن ۱۳ سال کی عمر تک اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جو اس کے اس دے ہوئے شوق و جذبے کو جگاسکے۔ جب یہ تیرا سال کا ہوا اس وقت ایک فلمی بنیز بنتا ہوا دیکھ کر اچانک اسے اپنے دے ہوئے شوق کا احساس ہوا۔ اس کے بعد سے یہ پنٹنگ کر رہا ہے باضابطہ اس نے آرٹ کی تعلیم نہیں پائی۔ بس اپنے شوق کو پورا کرتا رہا آرٹ کے دو امتحان بھی پاس کیے۔ حال ہی میں کل ہند صنعتی نمائش میں اس کو ایک STILL LIFE پرسکند پرائز کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس کا پسندیدہ مضمون STILL LIFE ہے، وہ پاکستانی فنکاروں میں زین العابدین سے کافی متاثر ہے اور ہندوستانی فنکاروں میں حسین اس کا پسندیدہ آرٹسٹ ہے۔ خود کو آرٹسٹ کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ اس کا ابتدائی فن "عنوانات کے روپ میں آپ کے سامنے ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنی حیثیت منوالے گا۔ فی الوقت اپنے گھر ہی کو اپنی پنٹنگ سے آراستہ کر کے غوش ہوتا ہے۔ میں اس وقت کے انظار میں ہوں جب کہ ہر گھر اس کا اپنا گھر ہو گا اور اس طرح اس کی پنٹنگس ہر گھر کی زینت بنیں گی۔

نیمہ سیرہ
سلیمان اریب ۹

۱۷

۳۵

چنگن چاچا

۵۷

گرتی دیواریں

۷۵

وام ہر موج

۹۱

بیمار

۱۱۷

برہان قاطع

۱۳۳

ملب

آدمی اور آدمی

۱۶۱

۱۹۵

۲۱۷

۲۳۳

۲۶۱

۲۷۱

۲۹۹

اچلی پر چھائیاں

سوارے

سجھوتہ

اجنبی

روزن در

گرمیہ یارو

ہیں کو اکب کچھ



اقبال متين

چشمہ

میں ذاتی طور پر کسی تخلیقی فن پارے پر خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ، ناول ہو یا ڈراما کسی اور سے دیباچہ یا مقدمہ لکھوانے کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں مصنف خود لکھے تو لکھے بلکہ بعض صورتوں میں تو مصنف کا دیباچہ ”ضروری“ ہو جاتا ہے اور ایسی سچی دو چار مثالیں موجود ہیں کہ بجائے خود دیباچہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اصل تصنیف سے ہٹ کر ادب میں اس کی سچی ایک علاحدہ حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے۔

گو کسی اور سے دیباچہ یا مقدمہ لکھوانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ دراصل اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں پڑھنے والوں کی رائے کو ہموار کیا جائے، گویا مقدمہ نگار مصنف اور قاری کے درمیان ایک شخص رابطہ کا فرض انجام دیتا ہے اور عام طور پر دیباچہ یا مقدمہ کسی ادیب کی پہلی پیش کش پر محض اس وجہ سے سچی لازمی سمجھا جاتا ہے کہ ادبی حلقوں میں اس ادیب کا بھرپور تعارف ہو جائے اور اس کی پہلی پیش کش کی پذیرائی میں آسانی پیدا ہو لیکن مقدمہ نگار جو

فرض اپنے سر لیتا ہے وہ بھی کچھ کم اہم اور نازک نہیں۔ اسے بہت ذمہ داری کے ساتھ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں اظہار خیال کرنا چاہیے اور حتی المقدور ادبی دیانت داری کے رشتے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے لیکن ادھر یہ رسم چل پڑی ہے کہ اس سیدھے سادے مقصد کے حصول کے لیے ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو بڑے نام رکھتے ہیں لہذا ہوتا یہ ہے کہ وہ یا تو مصنف کی حوصلہ افزائی کی خاطر یا پھر ”شرف“ اور مروت میں ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں لکھ جاتے ہیں جن کا تعلق دور دور تک نہ تصنیف سے ہوتا ہے اور نہ مصنف سے چنانچہ اکثر کتابیں پڑھنے کے بعد مقدمہ نگار کی حیثیت گواہ کی اور مصنف کی حیثیت مدعی کی نظر آتی ہے۔ لیکن اس مقدمے کا دردناک پہلو یہ ہے کہ اس سے نہ مصنف کا بھلا ہوتا ہے اور نہ مقدمہ نگار ہی کا اعتبار باقی رہتا ہے۔ دونوں کی ”رسوائی“ ہوتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جس ادب پارے میں جان نہ ہوگی اس میں کسی بڑے سے بڑے ادیب یا نقاد کا قلم معجز رقم بھی روح نہ پھونک سکے گا۔ ادب پارے میں خود زندہ رہنے کی صلاحیت ہوگی وہ کسی عیسائی نفس کی تلاش نہیں کرے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں ”اجلی پر چھائیاں“ پر جو دیباچہ لکھ رہا ہوں تو کس حیثیت میں اور کیا سمجھ کر۔ حیثیت میری یہ ہے کہ میں اقبال متین کا دوست ہوں اور اس کے زیر نظر افسانوی مجموعے کا ناشر بھی، اور سمجھتا یہ ہوں کہ میری دیباچہ نگاری سے اسے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا البتہ اقبال متین نے کیا سمجھ کر یہ گھٹاے کا سودا کیا یہ میں نہیں جانتا۔ شاید یہ بھی دوستی ہی کی کوئی ادا ہو۔

اقبال متین کی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا۔ یہ کوئی ۳۳ء، ۳۴ء کی بات ہوگی لیکن وہ شاعر جس کے مستقبل سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کی جاتی تھیں آہستہ آہستہ کھلانے لگا اور چار پانچ سال کے بعد پھر جو اقبال متین سامنے آیا تو وہ شاعری کا لبادہ اتار کر افسانہ نگار بن چکا تھا۔ شکر ہے کہ افسانہ نگار اقبال متین نے ہمیں مایوس نہیں کیا اور ”چوڑیاں“ جیسی (پہلی ہی) کہانی لکھنے کے بعد ادھر بسیوں کو بصورت کہانیاں تخلیق کر کے اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ شاعری ترک کر کے افسانہ نگاری اختیار نہ کرتا تو یقیناً اردو افسانہ ایک اچھے فنکار سے محروم رہ جاتا۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو شاعری اور افسانہ نگاری کی اصناف ہی ایسی ہیں کہ ان میں ہمارے اہل قلم نے زیادہ جولائیاں دکھائی ہیں اور آج بھی اردو شعر و افسانہ کا ایک قابل لحاظ حصہ اتنا بلند ہے کہ ہم اسے فخر کے ساتھ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے شعری و افسانوی ادب کے مقابلے میں کیا دنیا کی بہت سی زبانوں کے شعری و افسانوی ادب کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں اور میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار سمجارت اور پاکستان میں ابھرے ہیں اور جنہوں نے اردو افسانہ نگاری کی ناک کو اونچا کیا ہے ان میں ایک اقبال متین بھی ہے۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ حیدر آباد کی مٹی کی منکسر المزاجی اور آج بھی اردو ادب میں پھیلی ہوئی صوبہ واریت، گروہ بندی اور احباب نوازی نے اقبال متین کو قابل اعتناء سمجھا ہوا اور وہ بھی ان ”غیر ادبی مظاہروں“ کی پروا کیے بغیر لکھے جا رہا ہو۔

اقبالِ متین فکر کے لحاظ سے رومانی اور عقیدے کے لحاظ سے ترقی پسند ہے لیکن وہ ادب میں کسی ازم کا قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے پھر سب کچھ اور جو اچھا ادب ہو گا وہ کسی رنگ کا ہوتے ہوئے بھی سب کے لیے قابلِ قبول ہو گا۔ اس میں درد مندی بھی ہوگی اور انسان دوستی بھی اور اس میں غم ذات سے لے کر غم کائنات تک ہر غم کے لیے گنجائش ہوگی۔ اگر ادب کی مندرجہ بالا تعریف کی تائید میں اقبالِ متین کی کوئی کہانی پیش کی جائے تو آپ کو اس میں اچھے ادب کی بہت سی خوبیاں مل جائیں گی۔

یوں اقبالِ متین کہانی کی کسی بندھی ٹکی تنک کا پابند نہیں لیکن وہ کہانی کو ایک مشاق مشاطہ کی طرح بنا سنوار کر اور نوک پلک سے آراستہ کر کے اہل نظر کے سامنے لاتا ہے۔ وہ کہانی کے ضروری اجزاء کے ساتھ دوسرے فنی نکات پر بھی پوری توجہ صرف کرتا ہے اور خاص طور پر کردار نگاری اور جزئیات نگاری میں تو اسے یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ وہ اپنی کہانی کے لیے کبھی کوئی ایسا کردار نہیں چنے گا جس سے وہ نہ مل چکا ہو بلکہ جب تک خود کردار کی طفسر سے یہ اصرار نہ ہو کہ جب تم مجھ سے مجھ سے زیادہ واقف ہو تو پھر مجھ پر کیوں نہیں لکھتے۔ اس پر اقبالِ متین کہے گا کہ تمہاری خواہش ہو تو میں تم پر آج ہی کہانی لکھوں گا مگر ایک شرط پر کہ میکریمہ جس میں اکسری کی مشین بھی لگی ہے اگر تمہارے ظاہری مد و خال کے ساتھ تمہاری روح کے ڈھلکے چھپے گوشوں کو بھی اجاگر کر دے تو مجھے برا بھلا نہ کہنا اور جب کردار کی طفسر سے اقبالِ متین کو اجازت مل جائے گی تو پھر وہ بڑی بیدردی اور بڑی ہمدردی سے اس کردار کو کاغذ پر منتقل کر دے گا۔

چنانچہ آپ جھگن چاچا سے گاؤں میں بیٹے یا برہان سے اسٹیشن والی سڑک پر رام دیال سے آروند و گھوش کی تعلیمات پر تبادلہ خیال کیجئے یا شیکھر کے ساتھ ہرن کے شکار پر جائیے، بیگم سے راست اس کے جسم کا مول تول کیجئے یا ہارڈنگ کے ساتھ کوالٹی میں آخری بار و سکی پیجئے آپ کو کوئی کردار اجنبی نہیں لگے گا سب آپ کے شناسا، دوست، عزیز رشتہ دار اور پیارے نکلیں گے اور ہو سکتا ہے کہ کسی کردار کے روپ میں آپ کو خود اقبال متین نظر آجائے اور آپ جھجکا کر پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر کہانی میں کردار نگاری کی کوئی اہمیت ہے اور اپنے زندہ کرداروں کے بل بوتے پر کوئی افسانہ نگار زندہ رہ سکتا ہے تو اس مجموعے کی حد تک ہی جھگن چاچا برہان، ماسٹر صاحب اور رام دیال اقبال متین کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

بعض شاعروں کی طرح بعض افسانہ نگار بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس موضوعات کی کمی ہوتی ہے، اور ان کے فن کا انحصار محض طرزِ ادا اور حسن بیان پر ہوتا ہے۔ وہ متضاد اور مختلف موضوعات پر یکساں قدرت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے اور بعض افسانہ نگار ایسے ہوتے ہیں کہ تنوع اور بوقلمونی کے شوق میں ایسے موضوعات پر بھی کمندیں ڈالتے ہیں جو ان کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں اگر ہم کسی ایسے افسانہ نگار کے دو چار افسانے پڑھ لیں تو پھر ہم اس کا کوئی بھی افسانہ پڑھیں یہ محسوس ہوگا کہ یہ افسانہ تو پڑھا ہوا ہے اور دوسری صورت میں ہم کسی ایسے افسانہ نگار کے سب افسانے پڑھ بھی لیں تو دو چار افسانے ہی کام کے نکلیں گے لیکن اقبال متین نہ پہلی شق کے افسانہ نگار

میں ہے نہ دوسری شق کے اس کے ہاں موضوع کی یکسانیت بھی نہیں ملتی اور ہر طرح کے موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے کا شوق فضول بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ ایسے ہی موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جن سے وہ بوجہ احسن عمدہ برا ہو سکتا ہے، یہ احتیاط یہ سنبھلا سنبھلا ہوا انداز دراصل اقبال متین کا مزاج ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں اس کی آبرو بچائے ہوئے ہے۔

شاعری، افسانہ اور دوسری اصناف ادب کے لیے بھی یہ مسئلہ ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے کہ زبان کیسی ہونی چاہیے۔ عام طور پر سادہ اور سہل زبان کی تائید شدہ دوسرے سے کی جاتی ہے لیکن زبان سے خیال اور نفس مضمون کے تعلق سے قطع نظر حقیقت تو یہ ہے کہ کسی شاعر، افسانہ نگار یا ادیب کی شخصیت کا اظہار اس کی زبان اور طرزِ تحریر ہی سے ہوتا ہے لہذا کسی فنکار یا ادیب سے یہ مطالبہ کس طرح کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایسی ہی زبان لکھے۔ اقبال متین کی تحریر میں بھی اس کی شخصیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے جو عبارت ہے آرتنگی، سلیقہ مندی اور ایک پر تکلف رکھ رکھاؤ سے، ساتھ ہی اقبال متین اپنے افسانوں میں حیدر آباد کے محاورے اور مقامی زبان کے الفاظ بھی بڑے چاؤ سے استعمال کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اہل زبان اس پر ناک سبھوں چڑھائیں گے۔ اس خصوص میں اس کا استدلال یہ ہے کہ جب اہل دہلی اور اہل لکھنؤ اپنے محاورے اور روزمرہ پر اصرار کر سکتے ہیں تو ہم کو کیوں اپنی زبان استعمال کرنے کا حق نہیں دیا جاتا؟ اور کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس استدلال میں کوئی وزن نہیں ہے؟

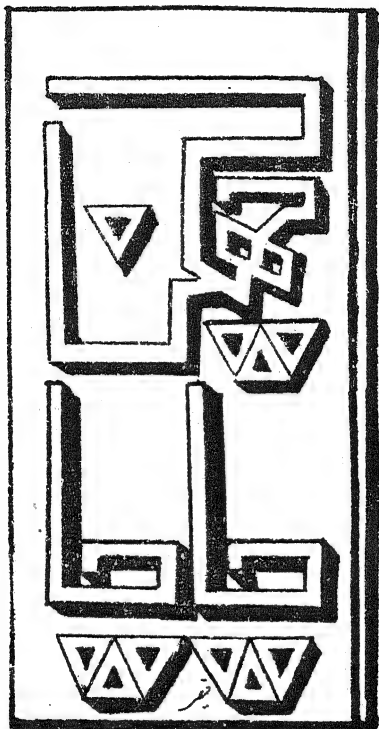
پوری انسانی تاریخ حق و باطل، نیکی و بدی اور تعمیر و تخریب کی آویزش کا ایک ایسا موقع ہے جس میں انسان کہیں یزداں کی صورت میں خیر محض بنا ہوا ہے تو کہیں اہرمن کے روپ میں مجسم شر اور کبھی کبھی تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دراصل وہ ہے کیا؟ لیکن ایک ابن آدم ابن مریم کو صلیب پر چڑھاتا ہے تو ایک ابن آدم رحمت اللعالمین بن کر آتا ہے اور میرے نزدیک اقبال متین کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ انسان کی تصویر کے تاریک ترین رخ کو سامنے لانے کے باوجود انسان کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ اقبال متین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ مکتبہ ”صبا“ کی جانب سے پیش کیا جا رہا ہے اور میرا یقان ہے کہ روز بروز متین کا فن اور نگہ بے صفا اور سنورے گا۔

سلیمان اریب

۲۹ جولائی ۱۹۶۰ء

اے سی گارڈز۔ سیف آباد۔ حیدر آباد دکن



چاچا چھلکن کے تو بار بار تھے، کوئی گھر ہو، کوئی کنبہ ہو گاؤں بھر میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں چھلکن چاچا کا بول بالا نہ تھا طبیعت بھی کچھ ایسی ہی پائی تھی انہوں نے۔ ورنہ بات بے بات میں کوئی کسی کا دم کیوں بھرے۔ اب اسی کو ہی لے لیجئے۔ امام دادا اور کریم بخش میں تو بار حواں چاند تھا۔ کریم بخش جس راہ سے گذریں گے امام دادا اس طرف متھوکیں گے بھی نہیں کریم بخش کا اکلوتا، نوجوان بھگتا، دوبارہ زندگی ہوئی ہے اس کی لیکن کیا مجال جو امام دادا ایسے میں بھی پیچھے ہوں۔ نا بھئی ایسی بھی کیا بخش مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا۔ آدمی آدمی کا دشمن اور چاچا چھلکن لگ گئے میل ملاپ کی فکر میں۔ یہ اور بات ہے کہ امام دادا اور کریم بخش کے دلوں کا میل نہ گیا لیکن چھلکن چاچا نے تو وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ امام دادا نے دبی زبان میں چھلکن چاچا کو بھی کریم بخش سے میل جول رکھنے پر روک ٹوک کی تھی۔ مگر واہ رے چھلکن چاچا یوں دان بچا گئے کہ ہاتھ میلانہ ہوا اور رنگ چوکھے کا چوکھا۔ امام دادا کو آخر ہتھ ہی نہ بی کہ بھائی تم اپنے جی کے راجہ ہو، آپ اپنے مختار ہو میں شرمندہ ہوں جو یوں بے وجہ تمھاری طبیعت میں دخل دینا چاہا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ چاچا چھلکن نے دونوں سے میل ملاپ جاری رکھا کیوں نہ رکھتے آخر کوئی کسی سے ٹوٹے وہ تو سب کے تھے، سارے گاؤں کے۔

اُجلی پر چھائیاں جھگن چاچا

یہ جھگن چاچا کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ گاؤں میں جہاں کسی میں ٹھنی اور وہ لگے اپنی دھن میں نہ کھانے پینے کے رہیں گے نہ سونے کے، فریقین میں جب تک گھٹ بندھن نہ ہو جائے وہ نچلے نہیں بیٹھنے کے۔ کلو مادھو کی توجھو ٹریے، ان دونوں میں تو بنتی بگڑتی ہی رہتی ہے۔ آج ٹریں گے تو کل مل لیں گے کل مل لیے ہوں تو آج ضرور لڑیں گے۔ صرف ان کا ہی جھگڑا ایسا تھا کہ جھگن چاچا بھی لوٹ پوٹ ہو جاتے کبھی ایسا بھی ہوا کہ چاچا نے خود چھوڑا ہے ان دونوں کو۔ اب پرسوں ہی کی بات ہے مادھو کو چوپال کی طرف آتا دیکھ کر چاچا یوں بیٹھے رہے جیسے منوں بوجھ دھرا ہوا ان کے سینے پر۔ اور ہم سب سمجھ گئے کہ چاچا گل کھلائیں گے اب۔ مادھو نے چاچا کو اس رنگ میں دیکھا تو حسب توقع خیر خیریت پوچھی۔ چاچا کہاں چوکنے کے بولے۔ مادھو بٹیا وہ میرے اصل ہیں نادرہوں۔ لال بھبھو کا اور گٹر گوں جانے کیا بات ہے دو دن سے بہت میل ملاپ ہے ان میں۔ مادھو بولا تو کیا بُرائی ہے چاچا۔ چاچا کہنے لگے۔ دولڑا کو یوں سر جوڑ لیں تو سمجھو خون میں گرمی نہیں رہی ان کے۔ آختہ ہو گئے بس، اور سارا چوپال کھل کھلا اٹھا۔ مادھو تاڑ گیا۔ یوں کھسیا نا ہوا کہ اب رو پڑے گا۔ اس دن سے گاؤں والوں میں کلو اور مادھو کا نام لال بھبھو کا اور گٹر گوں پڑ گیا۔

چاچا کی یہی باتیں گاؤں بھر میں مشہور تھیں۔ جہاں کچھ آما کافی ہوئی کہ چلے سب چاچا کے گھر۔ گاؤں کے کسی باسی نے چاچا کے تیور پر بل پڑتے نہیں دیکھا۔ چاچا میں خوبیاں یوں تو بہت سی تھیں۔ بات کرنے کا انداز ایسا دلکش جیسے ہٹل کار ٹیڈیو بول رہا ہے آواز میں گرمی بھی نرمی بھی۔ جو بولیں گے دل میں اتر کر رہے گی۔ عجیب شخصیت تھی ان کی بچہ جوان، بوڑھا، عورت، مرد سبھی خوش ان سے، چاچا کیا تھے چلتا پھرتا جادو تھے بوڑھا سا دھوکھتا تھا جھگن چاچا اس کے ہم عمر ہیں لیکن دیکھنے میں تو وہ اتنے سال خود

ہنیں معلوم دیتے تھے۔ یوں اسخوں نے بیٹیک پر اس آندھی کا ذکر تو کئی بار کیا تھا جو سنتے ہیں کوئی پچیس سال پہلے آئی تھی۔ وہ کہتے تھے تمہارا چاچا آنکھوں دیکھی باتیں کرتا ہے۔ کانوں سنتی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چاچا اتنے ہی بُرے ہوں جی جی نہیں مانتا تھا اور مانے بھی تو کیسے۔ چوڑی چھاتی، گھٹلا بدن، چال ڈھال میں ایسا ظنہ جیسے فوجی افسر چل رہا ہو۔ بالوں پر ہمیشہ خضاب مگر موخچیں نہ ڈاڑھی۔ سینک کٹا کر جھگڑوں میں مل گئے تھے پر کیا مجال جو کوئی اس بہروپ کی ہنہ تک پہنچ سکے۔ دل کی جوانی کا یہ عالم کہ بدن کے کس بل سے کچھ ٹرے چڑھ کر ہی۔ آس پاس کے گاؤں میں کہیں میلہ لگتا اور چاچا گاؤں کے گبروؤں کی ٹولی بنا کر چل پڑتے۔ کبڈی کی شریں ہوتیں اور چاچا کھلاڑیوں کے چناؤ میں مگن ہو جاتے۔ جہاں چاچا نے ان باتوں میں دلچسپی لی کہ ہم میں گھن پن شروع ہو گئی۔ چاچا بنا رہے ہیں ٹیم۔ اچھا جی۔ پھر تو مزے ہیں مزے۔ چاء بسکٹ، پان بیری سبھی کچھ رہے گا۔ اور واقعی سبھی کچھ رہتا۔

چاچا ہاتھ کے بہت کھلے تھے۔ کہتے پسیہ ہاتھ کا میل ہے۔ سرکار سے پچانوے روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ آندھے اور یوں جی ان کا تھا کون جس کی حق تلفی ہوتی۔ دھرم تپتی تھیں سو انھیں سو رگبازش ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ چاچا کی جوانی ہی میں وہ داغ بھارت دے گئی تھیں۔ رہ گئی مالتی بہن سوان کا بیاہ چاچا نے کیا۔ اچھے کھاتے پیتے دیکھ گھر انے میں کیا تھا۔ مالتی بہن کو وہ جان سے زیادہ پیار کرتے تھے اور انھی کی تصویریں تو جب دیکھو ان کے جیب میں پڑی رہتیں۔ باوجود اتنے چاؤ کے وہ مالتی بہن کے گھر جانے سے گریز ہی کرتے۔ ان کی منطقی ہی جدا تھی۔ کہتے بیٹی پر یادھن ہوتی ہے اور بیٹا اپنا دھن۔ اپنا دھن تو ہے نہیں۔ پر اے دھن کی کیا میت۔ اس پر زرتیوں، کلثوم، پر ماسب کی سب

ابلی پر چھایاں
بگڑتیں۔ تو کیا چاچا۔ مالتی کے لیے آپ کے من میں کچھ نہیں —؟ ہے کیوں نہیں

لیکن تم سب سبھی تو ہو۔ ایک من میں کس کس کا پریم لیے پھروں گا، اور چاچا یوں رچھا لیتے سب کو، گاؤں کی چھوریاں اس بات کو طول دیتے ہوئے بھی دیتیں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی نہ جانے چاچا کیوں کرتا تھے اس قصے سے جہاں یہ بات چلی کہ لگے چاچا زمین گھورنے زمین گھورنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی ہوں ہاں کہیں گے۔ ہوں ہاں بھی نہ ہو سکے تو وینکٹ کے بیل پیل کا بھوت ڈپٹی صاحب غرض کہ کچھ نہ کچھ بات نکال دیں گے، یہ بھی نہ چلے تو یوں زمین گھوریں گے جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ نظریں زمین پر گڑی ہوئیں۔ پنکٹ پر چو پال پر چاچا سب میں موجود ہوتے ہوئے بھی سب سے غائب۔ دور بہت دور کہیں گچھاؤں میں کھو جائیں گے، غلاؤں میں بھٹکیں گے۔ اور ی پدما میں بھٹیں ہو گئے وہ تو۔ سفر کر رہے ہیں پنجاب میں پدما کچھ کا دے گی۔ پدما، زیتون، کھس بھس۔ غرض پنکٹ پر چاروں سمتوں سے نظریں اٹھیں گی۔ ایک دوسرے سے ٹکرائیں گی۔ رام جانے۔ اللہ توبہ۔ اور چاچا غائب۔ دور بہت دور۔

اس بات سے ہٹ کر چاچا کو کبھی کسی نے کھو یا کھو یا نہیں دیکھا۔ بات بات پر ہنستے چرخ سے پیک کی بچکاری ماری اور لگے دانت کریدنے۔ سیر سپاٹوں کے دلدادہ۔ کہتے کیسی جوانیاں ہیں جویوں نچلے بیٹھے رہتے ہو۔ جوانی تو ٹوپی کا پھندا ہونا چاہیئے مضطرب بے کل، بارہ۔ سنا ہوں ندی ٹپڑی ہوئی ہے۔ سمے ایسا کہ مجھ بوڑھے کا بدن کس مس کرتا ہے۔ آنکھ اٹھاتا ہوں تو متوالا ہوا جاتا ہوں۔ نا بھئی مجھ سے تو نہیں رہا جاتا۔ ہم کوئی ماں کے پیٹ میں تھوڑا ہی ہیں جویوں ٹپڑے بھگتیں۔ دنیا نہ ہوئی کال کو ٹھہری ہو گئی۔ نا بھئی ان جوانیوں سے تو بڑھاپا ہی جلا۔ اور ہم سب سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے۔ چرخ پان کی پیک

اجلی پر چائیاں

چھلکن چاچا

زمین پر آرہی اور زردہ کا ایک بھپکا ہمیں مسح کر دیتا۔ تو شے تیار ہوتے۔ چاچا نگر کے بیٹھائی والے کو چوپال پر سے پکارتے۔۔۔ ”گولی پہلوان ذرا سنا تو۔۔۔“ اکم کرنا چاچا۔ ”وہ جواب دیتا۔“ جلیبیاں اور لڈو کل سویرے سویرے چاہئیں۔۔۔ تازہ گھی کے پیرے سویرا، اور دوسرے دن سویرے سویرے گولی پہلوان کو لڈو اور جلیبیوں کی قیمت سے کچھ اوپر ہی مل جاتا۔۔۔ وہ ان کا سویرا جو ٹہرا۔۔۔ چاچا اس کو اپنا سویرا کہا کرتے۔۔۔ بات یہ تھی کہ سویرا نے واقعی ہمارے گھاؤں کی لاج رکھ لی تھی۔۔۔ سیتاپور والوں کے آسامی نے چاچا کے پاس چٹنی بھیج دی تھی کہ کشتی میں اگر ہمارے گھاؤں کو ہر ادیس تو مان لیں گے وہ اوجنی کے گبروؤں کو۔۔۔ سیتاپور ہمارے اوجنی کے کوئی چار سیل اتر میں تھا۔ ہر سہ ماہی کو سیتاپور اور اوجنی والوں میں دھڑلے کی کبڈی ہوتی۔ اس سال ہم نے انھیں مسلسل تین بار جیتا تھا۔ چٹنی دیکھی تو فوراً لکھ جیجا۔۔۔ سو موادر کو ہم آرہے ہیں، پر اس شرط سے کہ جو ہمارے گاؤہ جلسہ بھی دے گا۔۔۔ آسامی چلا گیا۔۔۔ پر چاچا لڑے گا کون۔۔۔ ہم حیرت سے بول اٹھے۔۔۔ لڑے گا کوئی بھی میرا لال یا گٹرگوں۔۔۔ سارا چوپال کھل کھلا اٹھا۔ پھر چاچا سنبھل کر بولے ہاں کر دی ہے تو پیچھے نہیں ہٹنے کے ہم۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ اور ہاں وہ کیا کم ہے ہمارا گولی پہلوان۔۔۔ موچھوں پر تاؤ دیتا پھرتا ہے۔۔۔ مونچھیں منڈوا دوں گا بچہ کی۔ انھوں نے اس انداز سے تن کر کہا جیسے اپنی اہمیت کا احساس دلارہے ہوں۔ ”پھر تو جلسے کی تیاری کیجیے چاچا۔ ہو مکی کشتی۔“ بیٹیک کے کونے سے کسی نے کہا۔ ہم پیچھے پلٹے تو بندہ علی کہہ رہا تھا۔ تین سال ہوتے ہیں اس کو لنگوٹ کھول کر اور حساب سے تین ہی تچے بھی ہیں اس کے۔ سچ۔ چاچا نے مسکراتے ہوئے زمین پر پچکاری چلائی۔۔۔ پان کو

چھلکن چاچا

اُجلی پر چھائیاں

دہننے جڑے میں برابر کرتے ہوئے بولے عورت کے آگے لنگوٹ کھولا تھا اس نے کچھ مرد کے آگے تو نہیں کھولا تھا، اور سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔

سوموار کو دھڑے پٹے، پنگیاں باجے جب ہم سنیا پور پہنچے ہیں تو سارا گاؤں زنگل پر جمع تھا، عورتیں بھی چھتوں پر گھاس کی گری پر چڑھی ہوئی ہماری منظر تھیں۔ گنپت کو دیکھا تو ہمارے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ دل ایسے دھڑکنے لگے جیسے گاؤں میں بجتے ہوئے دھڑے ہمارے سینوں کے اندر پٹ رہے ہوں۔ کشتی شروع ہوئی تو گولی پہلوان چوڑی بھول گیا تھا۔ گرتے گرتے یوں سنبھلتا جیسے سال بھر کا بچہ چلنا سیکورہا ہو۔ ایک بار تو بس حد ہی کر دی اس نے کشتی کرتے کرتے اتنی حسرت سے ہماری طرف دیکھا ہے جیسے کہہ رہا ہو، میں نے کیا قصور کیا تھا۔ کیا چاچا، میرے منہ سے چیخ ہی تو نکل گئی کجخت نے جو اس بھی تو کھو دیئے ہیں۔ لڑتا کہاں ہے اور دیکھنا کہ صر ہے چاچا کا یہ عالم کہ گولی کے ساتھ ساتھ خود بھی اچھل کود رہے ہیں۔ جیسے کٹرے داؤں چچ سکھا رہے ہوں۔ مار دیا۔ مار دیا۔ مار دی۔ آ میرے سورما۔ اور گنپت ساڈ کی طرح چت پڑا تھا۔ سپر کیا تھا سورما کبھی کسی کے کندھے پر تھا تو کبھی کسی کی گود میں، کبھی گردن میں لٹکا مانگیں جھاڑ رہا تھا۔ چاچا نے اپنی طرف سے چاندی کا کڑا سورما کے ڈنڈ پر چڑھایا تو اس نے چرن چھو کر آہستہ سے چاچا کے کان میں کہا۔ چاچا آج سے میں نے مرد کے آگے بھی لنگوٹ کھول لیا ہے۔ سب ہنس پڑے۔

چاٹوری میں کھارے بیٹھے اور چاء پانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہمارے سورما کو پھول پہنائے گئے، باجوں اور روشنی سے جب گھرواپس ہوئے ہیں تو بہت ساروں نے فیصل کے باہر ہی استقبال کیا۔ آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ گولی پہلوان پھول پہنے آ رہا ہے۔ ضرور

اُعلیٰ پر چھائیاں چھگن چاچا

جیت لی ہوگی اس کے شتی لوگ جلوں میں شامل ہونے لگے۔ سمجھی واہ مار دیا ہمارے سورمانے۔
سورما کا کوئی یاریوں چچا۔ جندہ باز میرے پٹھے عورت بھی چیت۔ مرد بھی چیت۔ اور چاچا
نے جواب میں کہا بھگوان کی کرپا ہے ورنہ دونوں پٹ گئے ہوتے ذرا کی ذرا میں۔

چاچا کی یہی زندہ دلیاں تو گاؤں کی زندگی تھی۔ مہینوں میں برسوں میں کبھی کبھار جب
وہ مالتی بہن کے پاس چلے جاتے یا بیمار پڑ جاتے تو سارا گاؤں سونا سونا ہو جاتا۔ ہم سب کچھ
ایسا محسوس کرنے لگتے جیسے پرندوں کی چچا ہٹ اور کھیتوں کی لہلہا ہٹ ختم ہو گئی ہو اور جیسے
ڈھوڑ ڈنگرنے دانہ چارہ چھوڑ دیا ہو۔ حالانکہ سارے کاروبار اسی ڈھنگ سے جاری رہتے
لیکن شاید دلوں کی ویرانی گاؤں کی ویرانی بن کر سارے گاؤں پر مسلط ہو جاتی۔ ماحول ہی کچھ
بجھا بجھا سا ہو جاتا جیسے کوئی اہم ترین چیز ہماری زندگیوں میں سے کم ہو گئی ہو۔ چاچا کیا
تھے گاؤں والوں کا دل تھے۔ ہمدرد تھے کہ ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے۔ کبھی انہوں
نے کسی کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کیا بلکہ سچ پوچھتے تو وہ ایسے وقت کی تلاش میں رہتے
کہ انہیں کسی کی خدمت کرنے کا موقع ملے۔ آپ یقین کیجئے جب وہ ہمیں حکایات شیریں میں جُھپ
چُھپ کر گھروں میں تمہیلیاں پھینکنے والے وزیر کا قصہ پڑھاتے تو اس وزیر کو چاچا کے
روپ میں دیکھنے لگتا۔ میرا مقصد اس سے یہ نہیں کہ چاچا بھی یوں ہی کرتے لیکن جانے کیوں
یہ سبق یاد کرتے وقت میں چاچا کو باوجود ان تھک کوشش کے خیال سے ہٹانے سکتا چاہنے
سارے گاؤں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے
اوجہ میں ایک ہی بہت بڑا خاندان یا کنبہ رہ بس گیا ہے۔

بوڑھی بھگن کا نواسہ بیمار ہوا تھا تو چاچا نے سو سو جتن کیے تھے اس کے لیے
اس زمانے میں سردیاں کڑا کڑی پڑ رہی تھیں۔ آگ تاپتے ہوئے چاچا نے شعلوں کو

جھگن چاچا

اُجلی پر چھائیاں

گھورتے ہوئے کہا تھا جہاں آگ انسان کے سرد جسم کو حرارت بخشی ہے وہیں ایک ایسی بھی آگ ہے جو متحرک جسم کی حرارت کو سرد اور بے جان کر دیتی ہے ہم نے چاچا کی ان بے وقت فلسفیانہ باتوں کو سمجھ نہ پا کر پوچھا تھا — کون سی آگ؟ — پیٹ کی — اور ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — سچ کہتے ہیں چاچا — تو پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے جھگن کے نواسے کے لیے — اور دوسرے دن اتنا چندہ جمع ہو گیا تھا کہ قصبہ کا ڈاکٹر بلا یا گیا۔ ایک کبیل خریدی گئی اور اناج سے بھری پوری دو بوریوں کی جھگن مالکن ہو گئی —

میری ماں کہتی تھی جھگن چاچا آدمی کے روپ میں دیوتا ہیں وہ اس بات کے جواز میں ہمیشہ ایک قصہ لے بیٹھتی۔ کہتی کہ جب میں چھوٹا سا تھا اور میرے باپ کو ابھی کہیں نوکری نہیں ملی تھی ان دنوں کئی کئی دن کے فاقے ہوتے تھے ہم پر۔ فاقوں کی وجہ سے ماں کی چھاتیاں سوکھ جاتی تھیں تو دودھ کی بوند بوند کے لیے میں بھی بلکتا تھا زمینیں تو ہماری متھی نہیں جو کھیتی باڑی کرتے۔ میرے ماں باپ جو لاپے کا کام کرتے تھے ان دنوں۔ یہ دھندل کچھ چلتا چلاتا نہیں تھا۔ پہلے تو ایک ایک رو مال ایک ایک لنگی بنانے میں کئی کئی دن بیت جاتے اور جو مال تیار ہوتا اس کی کھیت ان دامنوں نہیں ہوتی جو لاگت اور ان کی کڑی محنتوں کا معاوضہ ہو سکے۔ نفع کا ایسے میں سوال ہی کیا۔ میری ماں اور باپ اس مفلسی کی زندگی سے تنگ آچکے تھے۔ آدمی بھوکا ہو تو شاید اس کے سارے انسانی جذبے دم توڑ دیتے ہیں میری ماں کہتی کہ میرا باپ ان دنوں اپنی زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ ہمیشہ چڑچڑا رہتا۔ بے وجہ مجھے گھر کتا، مال کو گالی دیتا، اور میرے بڑے بھائی کو علانیہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستا، اس پر ماں کچھ کہتی تو لڑکھڑکھ کر

دو دو دن گھر سے کہیں چل دیتا اور سدھ بدھ تک نہ لیتا ہماری۔ وہ کہتی کہ چھگن بھیاکو شاید یہ واقعات معلوم ہوئے۔ ایک بار میرا باپ بٹنیے کے تقاضے سے تنگ آکر گھر سے غائب تھا اور وہ ٹیچی رو رو کر مجھے تھپک تھپک کر سلا رہی تھی اس وقت چھگن چاچا اپنے مخصوص انداز میں پان کی گھوری جڑے میں دبائے مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے ماں کو روتا دیکھ کر وہ باتیں کی ہیں کہ پیٹ خالی ہونے پر سبھی ہنسنی کل پڑی۔ پھر کہنے لگے قاسم سب میں اچھی طرح جانتا ہوں اس بخشو کو۔ میرا بچپن کا ساتھی ہے ناباؤلا اور دیکھ بھن تو اپنے من میں کچھ اتنا پریم رکھتی ہے اس کے لیے کہ وہ تجھے تڑپا تڑپا کر شانت ہوتا ہے۔ گیا ہے تو آپ ہی چلا بھی آئے گا، یوں اس کے لیے روتی بیٹھے گی تو تیری آنکھیں آنسو بن کر بہ جائیں گی اک دن۔ جیسے انھیں ماں کے رونے کا سبب معلوم ہی نہ تھا۔ جاتے ہوئے کہنے لگے کچھ اپنے بھائی بھادج کا بھی تو خیال کر گا ہے ماہ۔ ایکلی پڑی رہے گی لیکن ذرا کی ذرا ہماری سچی پوچھ گچھ کی ہے کبھی۔ مالتی کی ماں ہے کہ یاد کیے جاتی ہے بیچاری — ان دنوں چاچی زندہ تھیں۔

تیرے چاچا چلے گئے تو میں نے تجھے کھاٹ پر سلانے کے لیے اٹھایا تیرے تیکے کے نیچے پیلا پیلا نوٹ دھرا تھا۔ اور ماں کی آنکھیں سیر آئیں۔ سنتی ہوں اگلے زمانے میں بادشاہ اور وزیر اپنی پر جا سے ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔ پر اب کہاں ایسے بادشاہ بھی۔ تب تو مجھے یقین سامہونے لگتا کہ ”حکایات شیریں“ کے وزیر نے چاچا کے روپ میں دوسرا جنم لیا ہوگا۔ میں ان خیالوں میں کھو جاتا اور وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں پونچھ لیتی۔

چاچا کے ایسے ہی اور سبھی دو ایک قصے مشہور تھے جنہیں دے سکتے انھیں کھینڈ

اصلی پر چھائیاں

چمکن چا چا

سچی دے دیا کرتے لیکن خود ان کو کسی نے کبھی اپنی حاجت بیان کرتے نہیں سنا۔ کیسی ہی افتاد پرے ہنستے ہنساتے سہم لیں گے کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ چا چا فکر مند ہیں یا کوئی بات انہیں اندر ہی اندر کھول رہی ہے۔ ایسے میں بھی صرف ایک ہی چیز تھی جس سے کبھی کبھی ان کی حالت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ وہی باتیں کرتے کرتے یا ہنستے ہنستے زمین پر کچھ تلاش کرنے کی عادت۔ کبھی چا چا قہقہہ لگاتے لگاتے ایک دم ایسے خاموش ہو جاتے جیسے کسی نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ ہمیشہ کی بلشاشت ان کے چہرے سے کچھ اس طرح غائب ہو جاتی جیسے یہ پل بھر کی سنجیدگی اور متانت ہی ان کے چہرے کی خصوصیت ہو۔ سنجیدگی اور تمکنت کا یہ غول ان کے وجود کو اس طرح ڈھک لیتا کہ ان کی شخصیت پر کچھ شبہ ہونے لگتا، اصلی چا چا کونسا ہے۔ ؟ یہ جو اس وقت سامنے ہے یا وہ جو ابھی ابھی زندہ تھا، اور اگر اس چہرے کے توسط سے کوئی ان کے قریب ہو رہا ہوتا کوئی ان کے اندر جھانک رہا ہوتا کہ وہ ایک دم کھل کھلا اٹھتے۔ جیسے پل بھر پہلے مارے ہوئے قہقہے کا تسلسل ابھی ٹوٹا ہی نہ ہو۔ جیسے یہ قہقہے ان کے وجود کا جز ہوں اور شاید سب ہی سوچنے لگتے کہ اصلی چا چا کونسا ہے۔ وہ جو ابھی مردہ تھا یا یہ جو اب زندہ ہے۔ کہلنڈرا منس مکھ جو ان۔ پنج۔ زردہ کی خوشبو کا ایک مچھکا سب کو مسحور کر دیتا اور کوئی بھی چا چا کے اندر تک نہ پہنچ سکتا۔

وہ یوں جب کبھی خاموش خاموش نظر آتے تو نہ جانے کیوں میرا خیال مالتی بہن کی طرف رجوع ہوتا۔ میرا دل بولتا کہ چا چا کی ان بھجتی اور سلگتی ہوئی آنکھوں سے مالتی بہن کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہو گا۔ میں جتنا ہی اس بات کو سوچتا اتنا ہی میرے دل کو یقین ہوتا جاتا میں نے بار بار اپنی ماں سے مالتی بہن کے لیے الٹ پیچ کر پوچھا تھا لیکن وہ

ہمیشہ ہی مجھے اس کا یقین دلاتی رہی کہ وہ بڑے ٹاٹھ سے ہیں۔ ساون گاؤں کے دیسکھ کی بہو۔ بڑی بڑی زمینیں، جائداد، نوکر چاکر سبھی کچھ — اللہ رکھے ایک نہیں دو بچے، بھتیہ کہتے ہیں پاؤں پھر سجاری ہو گئے ہیں اس کے۔

میں خود بھی سوچتا کہ اس سے زیادہ آخرو کیا آرام چاہیے کسی کو۔ رہ گیا میاں بیوی کا پریم سوا اس کے تو چرچے تھے۔ وہ تھیں بہت محبت والی۔ چاچی کو تو بھی کچھ پتہ تھا مالتی بہن تو باپ پر گئی تھیں جس کے باپ نے سارے گاؤں کو موہ لیا ہو، اس کی بیٹی اپنے تپ کو نہ اپنالے۔ جی نہیں مانتا تھا۔

میں پھر کھوجتا ”ماں پریم تو ہے نا جوڑے میں“ کیوں نہیں سننتی ہوں پاؤں دھو کر پتیا ہے اس کے۔ کھل میری ہنسی نکل جاتی، یہ پاؤں کا دھوؤں پینے کی بھی خوب رہی، لیکن جی چاہتا کوئی مسکے بھی پاؤں دھوے۔ یا میں ہی کسی کا۔ اور یوں ہی جو بات چاچا اور مالتی بہن کے بارے میں چلتی وہ اکثر مجھ پر آکر ختم ہوتی مجھے اس پاؤں دھونے والی بات سے اتنا لطف آتا کہ ماں میری منگنی کی باتیں لے بیٹھتی، اور میں جانتا تھا کہ میری ماں اس موضوع پر جب کبھی آتی ہے تو روتی ضرور ہے اور اسی سبب میں اس سے پہلے کہ اس کو اپنی مفلسی اور نکبت کا احساس ہو وہاں سے کھسک جاتا۔

ہاں چاچا کے بارے میں ایک اور بات مجھے کھٹکتی تھی۔ حوالدار مرحوم کی بہن نوراں دادی کی نواسی کا بیاہ تھا۔ ہمارے ہی ضلع میں کہیں بات چیت ہوتی تھی۔ بیاہ سے دو ایک دن قبل چاچا بھی اتنے مصروف رہے کہ چوپال کا رخ نہیں کیا۔ بیاہ کا دن آیا تو ہم سب ہی شریک تھے۔ چاچا اس طرح خوش خوش کام دھندے میں لگے تھے جیسے یہ تقریب ان ہی کے پاس ہو رہی ہو۔ ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ، چہل اور دو لہا والوں سے

اُجلی پرچھائیاں

چھگن چاچا

نوک جھونک وہ ہر بات میں شریک تھے لیکن جب بارات جانے لگی تو نوراں دادی اور گھسروالی عورتوں کے رونے چلنے سے چاچا بھی اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی سب چہرسل آن کی آن میں غائب ہو گئی۔ جانے عورتیں شادی بیاہ کے مواقع پر بھی رونے سے کیوں نہیں چوکتیں۔ پال پوس کے پروان چڑھانے کے بعد اپنے جگر گوشہ کو کسی اجنبی کے حوالے کرتے ہوئے دکھ تو ضرور ہوتا ہوگا۔ سنتے ہیں بڑے شہروں میں لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو خود ہی پسند کر لیتے ہیں شاید ایسے میں شہر کی بڑی بوڑھیاں یوں چلا چلا کر روتی بھی نہ ہوں گی۔ سچ پوچھیے تو رونے دھونے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ رونا دھونا ہی ٹہرا تو یوں کر کے دینا ہی کیا ضروری ہے۔ ان بوڑھیوں کا تو اللہ بلی۔ ادھر روتی بھی ہیں ادھر دکانے بھی ادا کرتی ہیں کہ سینے کا بوجھ سہرا۔ نوراں دادی کی اوموشی تو میری ہنسی نکل گئی۔ بارات روانہ ہوئی تو چاچا باہر نکلے۔ میں نے جو آنکھ اٹھائی تو چاچا منہ موڑ کر آنسو خشک کر رہے ہیں — مجھے اپنی آنکھوں پر بھر دس نہ تھا۔ وہ چاچا جس کی آنکھیں بڑی سے بڑی مصیبت میں نہ ہوئی تھیں آج یوں بچوں کی طرح ٹسوے بہا رہا ہے۔ مجھے اس کی حرکت پسند نہ آئی مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی معمولی باتوں پر کبھی رو ہی نہیں سکتا اور یہ صرف دکھاوا ہے شاید نوراں دادی کے لیے۔ لیکن چاچا اتنا عام آدمی بھی تو نہیں ہے جو شخص کسی کی خاطر دکھاوے کے لیے ہنس نہیں سکتا وہ رو کیسے سکتا ہے؟ — اور نہ جانے کیوں مالتی بہن میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔

اس وقت میرے ذہن میں چاچا کے خلاف مورچہ قائم ہونے لگا۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے چاچا کی شخصیت میں میرے لیے وہ لچھی ختم ہو رہی ہے جو کبھی تھی۔ ماں کہتی تھی کہ چاچا کے اس پر بہت سے احسانات ہیں لیکن مجھے جب مالتی بہن کا خیال آتا تو چاچا کے سارے احسانات کو بھول کر میرا ذہن ان کے خلاف سوچنے کو تیار ہو جاتا، ایسے میں خصوصیت

سے مجھے وہ بات یاد آ کر تڑپاتی جو چند ہی ماہ پیشتر اس ضمن میں پیش آئی تھی۔ مالتی بہن نے بوڑھے کا کاکے ساتھ ننھی کو شہرے بھیجا تھا کہ وہ اپنے نانا کو کسی طرح پکڑ لائے۔ لیکن چاچا نے پھسلا کر ننھی کو اکیلے لوٹا دیا تھا۔ خود نہ جانا تھا نہ گئے۔ جب تک ننھی یہاں رہی چاچا اس پر وارے نیا رے ہوتے رہے اور جانے لگی تو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتے رہے اور جاچکی تو زمین پر کچھ تلاش کرنے لگے۔ اس دن سے کوئی دو تین روز تک میں نے غور کیا تھا کہ چاچا پھر کچھ کھوئے کھوئے سے رہے، پھر چند دن تک مجھے ان کی مسکراہٹیں ان کی دلی کیفیات کو جھٹلاتی ہوئی معلوم ہوئیں جیسے ان کی خارجیت ان کی داخلیت کا کفن ہو ایسے میں نے یہ مناسب بھی نہ سمجھا کہ ننھی کے اکیلے لوٹا دینے کا سبب پوچھوں ورنہ یوں تو میرا جی چاہتا تھا کہ اس معاملے میں چاچا سے کھرے کھرے سوالات کر ہی لوں، کیوں کہ مجھے مالتی بہن بہت پیاری تھیں اس لیے بھی کہ میں نے چاچی کا دودھ پیا تھا۔ پھر بھی جب ننھی جا رہی تھی میں نے دبی زبان میں چاچا سے التجا کی تھی۔ لیکن وہ زمین پر نظریں گاڑے جانے کہاں پہنچ گئے تھے۔ جب ان کی نظریں اٹھیں تو میں نے دیکھا پلکیں بھیگی ہوئی تھیں لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ تو چلی گئی ننھی؟۔ کیونہ جلمے گی۔ آخر وہ چونکے۔ تب میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی کا انھیں احساس بھی نہ تھا۔ اس واقعہ کے تین چار مہینے کے بعد وہ یکایک مالتی بہن کے پاس جلنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں کے لیے یہ ایسی کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ البتہ مالتی کی سہیلیاں اس کے پاس اپنے اپنے پیام اور سندش بھیج رہی تھیں۔ میری خوشی بے پناہ تھی۔ ماں مگر خوش نہ دکھائی پڑتی تھی۔ چاچا صبح کو بکھلنے والے تھے۔ انہوں نے میری ماں سے توشہ کی تیاری کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔ جب انھیں کسی لمبے سفر پر جانا ہوتا تو وہ میری ماں سے

اُعلیٰ پر چھایاں

چھلکن چا چا

ہی تو شے کے لیے کھانا بنواتے۔ میری ماں کو ایسی چیزیں بنانے میں مہارت تھی جو رکور کو کر کھاتی جا سکیں۔ اس شام وہ بہت دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ چلتے وقت کہنے لگے "آٹھ میل تو پیدل چلنا ہو گا قسوس ہن تب کہیں جا کر گاڑی ملے گی۔ وہ بھی دن ڈھیلے ڈوبے ڈبولی ہو تو اسلم پہنچا دے گا جیتا۔ ہاں ہاں پہنچا دے گا کیوں نہیں سلو میرا، اور وہ کو اڑ کھول کر باہر نکل گئے۔"

دوسرے دن صبح کو جب میں تو شے لے کر چا چا کے دروازے پر پہنچا ہوں تو تالا پڑا تھا۔ پہلے تو میں ٹھٹھا۔ پھر یہ سوچ کر کہ شاید چا چا بھی تو شے ہی کی غرض سے ہمارے گھر گئے ہوں۔ لوٹ گیا۔ بظاہر تو اس کا بھی امکان نہ تھا اس لیے کہ اگر وہ ہمارے ہاں جاتے تو ان سے راستہ میں میری مدد بیٹھ رہنا ضروری تھا۔

میں گھر لوٹنے لگا تو راستے میں برج لال بنیے کے مکان پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اسی کے گھر میں ٹیس ٹیری تھی۔ پندرہ سو روپے کی نقدی غائب تھی۔ اس کی پتی چھاتی کوٹ رہی تھی۔ گاؤں والے آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے سمجھی کو ہمدردی تھی۔ کوئی کچھ پوچھتا، کوئی کچھ سوال کرتا۔ برج لال نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ رات گئے صرف چھیل داس جی آئے تھے انھیں ہزار روپیہ قرض کی ضرورت تھی۔ بہت منتیں کیں لیکن میں ٹال رہا تھا۔ اور وہ رونے لگا۔

چھیل داس جی آئے تھے۔ رات گئے۔ انھیں ہزار روپے کی ضرورت تھی — اور چا چا گھر پہنچے نہیں ہیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے گاؤں پر بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ بہت بڑی مصیبت۔ اور ماں میرے کانوں میں چلا رہی تھی جیسا آدمی نہیں دیتا ہے — مجمع میں کوئی چیخ رہا تھا۔ چا چا گھر نہیں ہیں۔ چا چا غائب ہیں۔

چھلکن چاچا

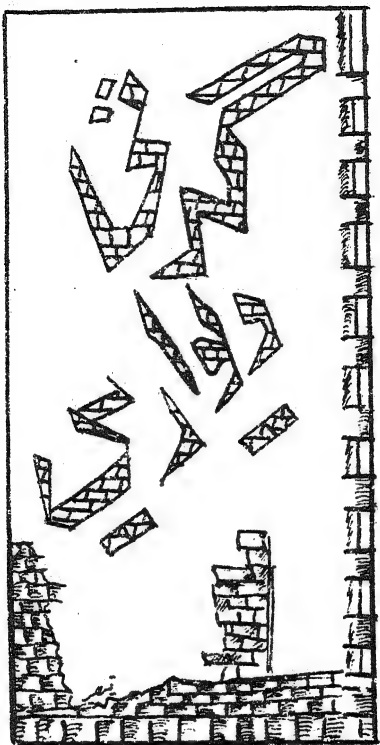
اجلی پر چھائیاں

چاچا — غائب ہیں۔ اور انھیں آوازوں میں جیسے میری ماں مجمع میں پھینچڑوں کی پوری قوت کے ساتھ پکار رہی ہو — بھیا آدمی نہیں دیتا ہے۔

میں گھر لوٹا تو میری حالت اس جواری کی تھی جس نے اپنا سب کچھ مار دیا ہو۔ ماں کو اڑ کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ میں کھاٹ پر گر پڑا تو ماں نے دھیمی آواز میں کہا — تیرا چاچا بد لغیب ہے سکو۔ جو چیز اسے جان سے پیاری ہے اسی کے دکھ میں گھل رہا ہے۔ مالتی ہسپتال میں ہے۔ اس کے پیٹ میں رسولی ہے۔ اس کے پتی نے شراب اور جوئے میں ساری جائیداد کھو دی ہے۔ تجھے کیا خبر بیٹا۔ اس موے نے تیرے چاچا کو خوب پٹیا بھی تھا — ہاتھ ٹوٹیں ظالم کے۔ بھیا آدمی نہیں — اور ماں سسکیاں لینے لگی۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے چاچی مجھ سے دودھ کا بدلہ مانگ رہی ہے میں نے نظریں جھکا لیں تو جیسے کسی گہری اور غینہ کھائی سے چاچا پکار رہے ہوں مالتی۔ مالتی۔ اور سیکے منہ سے نہ جانے کیوں نکلا۔ ماں چاچا بہت بُرے ہیں۔ وہ دیتا نہیں، آدمی ہیں۔





بی اماں اُپر سپر کرتی پیش دالان میں پہنچ گئیں۔ گھر کا گھر ابھی سو رہا تھا۔ صرف دلہن کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور بیچارے نادومیاں صحاف میں امنہ چھپائے دلہن کو بچکار رہے تھے۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی دلہن کی طراری کی جھنک بی اماں کے کانوں میں ٹپر چکی تھی۔ دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر لیا تھا اور اللہ میاں کی بارگاہ میں دلہن کی تنک مزاجی کے خلاف دبے دبے احتجاج کیا تھا اور نادومیاں کے لیے دعائیں کی تھیں۔ سناڑے سے فارغ ہو کر انہوں نے حجرے کا دروازہ کھولا تو دلہن ابھی تک نادومیاں پر گولیوں اور سبوں کی بوچھاڑ کر رہی تھیں۔ سو بی اماں پیش دالان تک چلی آئیں کہ دلہن کو ان کی قربت کا احساس ہوا اور نادومیاں بخشتے جائیں۔ جب سے دلہن نے گھونگٹ سے سر نکالا تھا انقلاب تازہ تر پیدا کرتی رہی تھیں اور بیچارے نادومیاں نے اس طرح ہتیار ڈال دیے تھے کہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن بی اماں نے آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھا کیوں کہ انہوں نے اپنے بہت چمکتے بیٹے کے لیے اپنی پسند کی بہو ڈھونڈی تھی۔ بات کر کے پرکھا تھا۔ چلا پھر کر دیکھا تھا۔

ناک نقشہ، رنگ روپ تو سامنے تھا ہی بس چینی کی گڑباعتی نازک نازک چھوٹی موٹی ہاں البتہ پاؤں قد و قامت کا لحاظ کرتے بہت چھوٹے تھے اتنے چھوٹے کہ نادومیاں اپنی دلہن کا جو تاخیر دیتے ہوئے شرماتے تھے لیکن ان پیروں کے غیر معمولی چھوٹے ہونے کا نہ تو نادومیاں کو دکھ تھا اور نہ بی اماں کو، اور ویسے تو بیچارے نادومیاں کو کسی بات کا دکھ نہ تھا اور اگر دکھ تھا سچی تو وہ زبان کیس طرح لاتے اس لیے کہ دلہن بی اماں کی پسند کردہ تنقیس اور نادومیاں کی سعادت مندی خانہ لکھن میں مثال تھی۔ بی اماں دکھی تنقیس کہ دلہن کی زبان بہت لمبی ہے اور دلہن کو پر کھنے وقت انھوں نے صرف چلا پھرا کر دیکھا تھا دو چار دن رہ بس کہ نہیں دیکھا اور ان کے لیے وہی بات خدا ب جان بن گئی جس کو انھوں نے نہیں دیکھا۔ وہ نادومیاں سے کچھ محبوب محبوب سی رہیں وہ سمجھ گئی تنقیس کہ نادومیاں ابھی اس دنیا میں نہ نئے داخل ہوئے ہیں۔ مہندی لگے ہاتھوں اور چڑیلوں کے چھناکوں میں ابھی ان کے لیے اتنا رہ ہے کہ وہ دلہن کی دشنام طرازی میں صرف نزاکت آواز دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ لیکن بی اماں جہاں دیدہ نہیں انھیں یقین ہو چلا تھا کہ منقش اور چمکیلے کاغذوں سے سچی ہوئی زندگی کی یہ نگاری بس چند روز اور چلے گی اور پھر اندر چھپی ہوئی لکڑی باہر نکل آئے گی جس پر بہت سی خراشیں ہیں بہت سے دھبے ہیں۔ اور پھر یہی بیٹھ جائیں گے یا جام ہو جائیں گے جس کی ذمہ داری دلہن کے چھوٹے پیروں پر نہ ہوگی بلکہ ان تمام باتوں کی ذمہ دار خود بی اماں ہوں گی۔ اور بی اماں کا دل جھج جاتا اور وہ محسوس کرتیں کہ سارا خاندان ان پر انگلیاں اٹھا رہا ہے بی اماں کے تینوں بیٹوں میں ایک نادومیاں ہی تو تھے جن پر خاندان کی شرافت ناز کرتی تھی۔ تعلیم میں سبھی یتیموں میں آگے تھے۔ زیادہ پڑھنے لکھنے کی نہ ان یتیموں نے ضرورت محسوس کی اور نہ بی اماں کے لادھیار نے انھیں اس کی اجازت دی۔ اور

واقعی انھیں ضرورت بھی کیا تھی، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ نادومیال کے والد انتقال کر گئے تو صرف سہی ہوا کہ دروازے پر چھوٹنے والا ہاتھی نہ رہا۔ متھان پر بندھے ہوئے اسٹیکٹور میں سے چھ کھوڑے فروخت کر دیئے گئے۔ گھیاں فروخت کر دی گئیں اور یہ سب کچھ بنی اما نے اپنی دانشمندی سے کیا کہ گھر کے اخراجات کم سے کم ہو جائیں۔ اس لیے کہ اب کمانے والا ہی نہ رہا تھا جس کی جیتوں کے طفیل یہ سارا کرو فرم تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے نادومیال کی شادی اس دھوم دھام سے کی کہ مرحوم شوہر کی شان و شوکت میں کوئی فرق نہ آیا یہ اور بات ہے کہ نواب سلیم کی شادی کا مقابلہ نہ ہو سکا اور نہ بی اماں اتنا خرچ کرنے کو اب تیار تھیں۔ اس وقت مرحوم زندہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنے بل بوتے پر کیا اور ایسا کیا کہ شہر کی گلی چنی شادیوں میں نواب سلیم کی شادی کا شمار ہوتا ہے اور لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں لیکن اب بی اماں سمجھ گئی تھیں کہ مرحوم کی عزت و آبرو کو قائم رکھنا ان کے اپنے ہاتھ ہے۔ دولت کا کیا ہے ٹاؤ تو پل بھر میں لٹ جائے، پیدا کرنے بیچو تو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے مرحوم کی بات اور تھی ان کے باپ داداؤں نے جانیں قربان کی تھیں تیغ و تفلک کے جوہر دکھائے تھے۔ بڑی بڑی جاگیریں حاصل کی تھیں متول ورثے میں ملا تھا اور اب ان کی عزت بی اماں کے ہاتھ تھی۔ چاہیں تو سنبھال لیں چاہیں تو سر بازار نیلام کریں۔ اور اسی لیے بی اماں اپنے لادلوں کی شادی بیاہ کے مسائل میں بہت زیادہ محتاط تھیں۔ اس لیے کہ متول کو قائم رکھنے کا اب ان کے پاس یہی ایک ذریعہ تھا۔ بڑے گھر کے لڑکوں کو بڑے گھروں کی بیٹیاں ہی بیاہی جائیں تو سونا سونے کو کھینچے گا اور خاندان کی آن بان باقی رہے گی سو اسی لیے نادومیال کے لیے انھوں نے متول گھرانے کی اکلوتی بیٹی تلاش کی اور دلہن کو خوشی خوشی گھر لے آئیں۔ دلہن بھی اپنے ساتھ وہ سب کچھ لائی تھیں جو بی اماں کے خاندان کے شایان شان تھا اور جو کچھ دلہن لے آئی تھیں اس کو بی اماں نے

پہلے ہی ٹھوک بجا کر دیکھا تھا لیکن کچھ چیزیں دلہن نے گھونگٹ میں چھپا کر رکھ لی تھیں اور دلہن والوں نے بی اماں کی نظر بچا کر یہ چیزیں بھی دلہن کے ساتھ کر دیں کیوں کہ یہ دلہن کو ورثے میں ملی تھیں اور بچپن سے اس کے ساتھ ساتھ رہی تھیں لیکن جب دلہن نے گھونگٹ اٹا تو بی اماں بوکھلا گئیں اور بچارے نادومیاں سہم گئے۔ اور بی اماں سمجھ گئیں کہ سونے چاندی سے لدی ہوئی اس گڑیا کے اندر باروت بھری ہوئی ہے جو آہستہ آہستہ دھماکے پیدا کرتی ہے اور نادومیاں سینہ میں چونک پڑتے ہیں۔

دلہن کی تنگ مزاجی اور تلون سے پہلے پہلے تو بی اماں دکھی رہیں پھر آہستہ آہستہ خائف ہوتی گئیں لیکن وہ بھی آخر ساس نہیں کٹنا کچھ خاصے گھر تو دوزخ بنتا ہوا دیکھتی رہیں۔ وہ تو نادومیاں جیسے بر غور دار اور نیک چلن بیٹی کی صورت تھی جو انھوں نے اپنے پتے کو مار کر رکھ لیا تھا لیکن ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ زیادہ ستایا جائے تو آدمی خدا کو گالی دینے سے بھی نہیں چوکتا پھر یہ تو ٹھہریں بیوے۔ بڑے خاندان کی اکلوتی بیٹی تھیں تو بی اماں خاندانی سمجھاؤ سے ان سے دو ہاتھ بڑھ چڑھ کر ہی تھیں۔ کجواب کو ٹاٹ کا پسوند تو لگایا نہیں تھا جو دلہن والوں سے ان کی کٹی دہتی۔

ایک دن دلہن بہت برک رہی تھیں۔ بات صرف یہ تھی کہ دلہن کو شکرام میں سوار ہو کر تفریح کرنے کی سوجھی۔ نادومیاں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فوری پھرے دار کو دوڑایا لیکن وہ کجخت پتہ نہیں کہاں جا رہا۔ دلہن بناؤ سنگار کر چکنے کے بعد بھلا کب تک انتظار کریں کچھ طبیعت مکدر ہو گئی اور انھوں نے نادومیاں کو نشانہ بنایا۔ وہ چاہتی تھیں کہ دیر ہو رہی ہے تو نادومیاں خود شکرام لانے کیوں نہیں چلے جاتے۔ اور بچارے نادومیاں تھے کہ اس خیال سے ہی پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔ شرم دامن گیر تھی اور وہ بالکل حق بجانب تھے جس کے گھر پر ہاتھی جھولتا تھا جس کے آنکھ اٹھانے پر بیسیوں ملازم دوڑ پڑتے تھے وہ

بھلا شکر ام کے اڈے پر شکر ام لسنے کے لیے جاے۔ لیکن دلہن کی ضد کے آگے انہوں نے کبھی مسلح ہونے کا تصور تک ذہن میں آنے نہ دیا۔ وہ خود کو اس طرح تسلی دے لیتے تھے کہ دلہن ٹبرے ہی ناز و نعم میں پروان چڑھی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ دلہن کے والد جب گھر سے باہر جاتے تو بلا مبالغہ سات بار اپنی بیٹی کے چہرے پر سے اپنا سر اتارتے۔ اب جب کہ دلہن اتنے چاہنے والے باپ کی آغوش سے آئی ہیں تو نادومیاں کو ناز و برداریاں کرنا ہی پڑیں گی۔ چنانچہ وہ اہستہ سے بی اماں کی نظر بچا کر باہر نکل گئے اس لیے کہ اگر یہ بات بی اماں کے کانوں تک پہنچ جائے تو وہ بہت برہم ہوں گی کہ لو بھئی ٹبرے صاحبزادے نے کوٹھول پر آبرو گنوائی تو چھوٹے صاحبزادے کی کوچوں کے پورے نادومیاں بھی محبت میں گھر کے صدر دروازے تک تو جلیں گے لیکن اس سے آگے ان کی ہمت نہ ہوئی۔ کچھ سوچ کر انہوں نے سائیس کو دوڑایا اور خود وہیں انتظار کرتے دروازے کے پٹ پر پاؤں ٹکا کر تنگ مہری کے پاجامے کی چوڑیاں درست کرتے رہے۔ بی اماں کے منہ چڑھے خواجہ سرا کے کانوں تک کسی نہ کسی طرح یہ بات جا پہنچی تھی کہ خود نادومیاں دلہن کی ضد پر شکر اموں کے اڈے تک بھاگے بھاگے گئے ہیں۔ کانوں میں بھنک پڑنے کی دیر تھی کہ خواجہ سرا نے حق نمک ادا کیا۔ دلہن سے سوکنا پے کا پیر تو تھا ہی کیوں کہ میاں خواجہ سرا جھپٹن ہی سے نادومیاں پر مرتے تھے۔ کھیلے کھیلے بس یوں ہی نادومیاں کو چمٹ چمٹ جاتے تھے۔ تنہائی میں سرکار اور ولد ابر کہہ کر پان کی گھوڑیاں پیش کرتے تھے۔ دیدے اور کر مٹکا مٹکا کر نادومیاں کے قدموں میں بچھ بچھ جاتے تھے لیکن نادومیاں تھے کہ پتھر کی چٹان بنے ہوئے تھے۔ نہ کھل کر ہنستے نہ ہنس کر کھلتے، البتہ جب وہ اپنے بھائی جان کو خواجہ سرا کی کمر میں زور زور سے گد گدیاں کرتا ہوا دیکھتے تو دوسرے ہی لمحے ان کی نظریں گلابن بوا کے اداس چہرے پر بھی پڑتیں جو بھائی جان کے حجرے میں دروازے کی اوٹ سے خواجہ سرا کے مخروں کو

دیکھ کر سروالے کی طرح بل کھاتیں لیکن جب سے دلہن گھر کی زینت بنی تھیں میاں خواہرا کو اس بات کی توفیق نہ ہوئی تھی کہ وہ نادومیاں کی خدمت میں پان کی گھوڑیاں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکیں دن باند میاں نے صوف اتنا محسوس کیا تھا کہ میاں خواہرا سہرا ان سے بہت کچھ رکھتے رہتے ہیں اور دوسرے گلبدن بواہیں اور ان میں اکثر تو توہیں میں ہوئی۔ آج میاں خواہرا کو دلہن سے ناتہ پورا کرنے کا موقع ہاتھ آیا تو اس نے بی اماں پر بھرپور وار کیا۔ دوپٹے سے آنکھیں پونچتے ہوئے بی اماں کے قدموں میں جھک گیا اور لگا سوسے بہانے۔ انھوں نے شفقت سے پیٹھ پر ہاتھ چیر کر احوال پوچھا تو سکیاں بلیتے ہوئے نہایت ادب سے ان کے گوش گزار کیا کہ نادومیاں کو دلہن نے شکر مول کے ادب سے پرہیز کیا ہے وہ بہتیرا معذرت خواہی کرتے رہے لیکن دلہن کی تریباہٹ پر وہ باپ دادا کی ہڈیاں اکٹار چھینکنے سے بھی نہ چو کے۔ بی اماں کی آنکھیں بھی بھڑکیں ایک گرم لوہے کی سلخ ان کو اپنے حلق سے سینے تک جھلستی ہوئی سی محسوس ہونے لگی اور وہ آنسو پینے کی کوشش کرتی ہوئی سیدھی دلہن کی چوکھٹ تک آہنچیں دلہن پہلے ہی سے منہ پھلائے تھیں بی اماں نے جلی کٹی سانی تو وہ لگیں چھوٹ چھوٹ کر بن کر بنے نادومیاں نے اندر قدم رکھا تو نقشہ بدلا ہوا پایا۔ بی اماں برستی رہیں۔ اجداد کی آبرو کے منہ جانے کا ماتم کرتی رہیں اور دلہن نے میکے کا رخ کیا۔ نادومیاں بیچارے سچٹی چٹی آنکھوں سے ٹمٹم کر دیکھتے رہ گئے جس شکر میں دلہن کو سیر کرانے والے تھے اسی شکر میں بیٹھ کر دلہن میکے سدھاریں۔ جس گھر میں اپنی توہین ہوئی تھی اس گھر کی بگھی اور گھوڑوں کا احسان اٹھانے کو وہ کیسے تیار ہوتیں۔ نادومیاں دھڑکے دل کو ستھام بھی نہ سکے۔ ان کے سینے کے اندر کھن میں کھیلنا ہوا رٹہ کا گولہ جیسے ٹپ ٹپ اچھلتا رہا لیکن ان کے ہاتھوں میں جیسے اس گولے کو پکڑ لینے کی سکت ہی نہ رہی۔ وہ چپ چاپ دلہن کو شکر میں سوار ہوتا ہوا دیکھتے رہے سینے میں اچھلتے ہوئے رٹہ کے گولے نے جیسے اندر کے ٹھہرے ہوئے پرسکون پانی کو اوپر

اچھالا شکرم آگے بڑھی تو۔ سینے کے اندر اچھلتا ہوا پانی آنکھوں کے راستے پلکوں تک اسپنچا، اور ذرا سا رک کر آہستہ سے گالوں پر ڈھلک آیا لیکن دلہن نے اس طفسر نظر اٹھانے کی زحمت تک نہ کی۔ شکرم ابھی ڈیوڑھی کے اعلیٰ سے نکلی بھی نہ تھی کہ دروازے پر ایک گلی رکی اور نادومیال آہستہ سے برابر کے صطبل میں کھسک گئے۔

بہت آہستہ سے پاشاہ بیگم نیچے اتریں تو ان کو سہارا دیتے ہوئے یاسمن بوانے کہا کہ بیٹا اللہ نے تمہیں نشتر بننا کر بھیجا ہے دلہن بد مزاج ہسی لیکن نادومیال کی چپتی تو ہیں۔ میں دوش بڑی بیگم صاحبہ کو نہیں دیتی سارا کیا دھرا دلہن کا سہی نصیحت فصیحت بعد کو ہوگی بیٹا اب تو صرف خاندان کی لاج رکھنی ہے۔ یہی نام ہوگا کہ ذرا سا برامان کر بیٹے نے گھر سے میکے کا رخ کیا تو کسی نے روکنے سمجھائے کی تکلیف بھی نہیں کی اٹے گھر سے نکال دیا اور وہ بھی کراے کی شکرم میں پاشاہ بیگم سمجھ گئیں۔ پہرہ دار سے کہا کہ لپک کر بڑا پھانک بند کر دے اور خود گلی میں سوا ہو جائیں۔ پھانک پر پہنچ کر شکرم رک گئی تو دیکھتے کے دیکھتے پاشاہ بیگم کی گلی نے اس کو جالیا۔ دلہن سمجھیں گلی میں نادومیال ہوں گے لیکن پاشاہ بیگم برآمد ہوئیں تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ کہنے لگیں کہ اس قدر بے عزتی کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو تمہارے بھائی صاحب تو میرا منہ کالا ہوتا ہوا دیکھتے رہیں اور تم اس قید خانے سے نکلنے کے راستے مسدود کرتی پھر وہ جس گھر میں ایروں غیروں کی حکومت ہو اس میں مجھ نصیبوں جلی کی لاج رہ چکی بس۔ کس منہ سے واپس لے جانے آئی ہو۔ بہتر تو یہی ہے کہ اپنے بھائی صاحب کو زہریں مشوروں سے نوازو کہ وہ اپنی اماں کی پسند کی کوئی شریف زادی کر لائیں۔ اسلام میں چار نکاح جائز جو ہیں۔ اور پھر نکاح بھی کون ضروری ہے کسی کو ٹھہرے سے چٹ پٹ کرتی بازارن کو اٹھالائیں اور نیند میں چونکنے نہ دیں۔ اس کے اللہ تلے سننے میں لطف جو ہے۔ اماں بھی خوش رہیں گی۔ بڑے بھائی صاحب نے تو مثال قائم کر ہی دی ہے یہ بھی ان کے نقش قدم پر چلیں پھر نام بہت روشن ہو گا۔ اماں جان گلی کے چرلغ جلا لیں گی۔

پاشاہ بیگم کے ہونٹ سوکھتے رہے اور وہ زبان پھیر پھیر کر رہ گئیں۔ بڑے باپ کی بیٹی تو وہ سبھی تھیں لیکن دلہن کے آگے ان کی ایک نہ چلی سو جتنی رہ گئیں کہ کیا کہا جائے کیا نہ کہا جائے۔ یاسمن بوا بھی اس وقت تک رہ چھپ رہ چھپ خود کو سنبھالتی آپہنچیں۔ پاشاہ بیگم پر نظر پڑی تو یاسمن بوا کے قدم جیسے زمین میں گرے کے گرے رہ گئے۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ سسے قدم تک کانپ رہی تھیں۔ یاسمن بوا نے جھپٹ کر پاشاہ بیگم کو سنبھالا۔ سہارا دے کر لمبی میں سوار کیا اور تین گھنٹوں سے دلہن کو دیکھا تو دلہن نے چھپاک سے شکرم کی چلن جھٹک دی۔ پاشاہ بیگم لمبی میں سوار ہو کر اٹھی سیدھی سانسیں درست کر سکیں تو چلن سے سر نکال کر میرہ دار کو دیکھا کہ بھول دینے کا حکم دیا اور شکرم کی طرف منہ پھیر کر کہنے لگیں کہ اب یہ بھٹاک صرف رنڈیوں اور کسبیوں کے لیے ہی کھلے گا اور تم اپنے سیکے میں اپنا اچار ڈالو اتنی رہو دلہن نے جواب دینے کے لیے چلن سے سر باہر نکالا تو لمبی ہنایت اطمینان سے تڑپڑ کر گئی آگے بڑھ گئی تھی۔

دلہن گھم پھیں تو جیتے ہوئے دنوں کی فوج کی فوج جیسے دروازے میں سے نکل کر سامنے مارچ پاسٹ کرنے لگی۔

بکرا ذرا خیف تھا۔ نواب جنگ اپنے خاںسا مال پر سرجم ہوئے۔ داروغہ مطبخ نے آٹھ آدمیوں کے لیے سخت کی اور بارہ فقیروں کو کھانا کھلا دیا فقیروں نے آدھا پیٹ کھانا کھا کر ہی رانی بیٹی کی صحت کے لیے پیٹ بھر کر دعائیں دیں لیکن یہ بات نواب جنگ کے کانوں تک کسی نہ کسی طرح پہنچ گئی۔ اسی رات رانی بیٹیا کا بھارا ایک سو پانچ ڈگری تک جا پہنچا موسو طرح کے وسوسے اور وہاں نواب جنگ اور بیگم کے دل و دماغ پر لگدھنوں کی طرح منڈلانے لگے۔ اکیس روپیوں کی ریزنگاری منگوائی گئی اور رانی بیٹیا کے سیدھے ہاتھ سے چھو کر نواب نے اپنے سامنے غریبوں میں تقسیم کروادی۔ عشاء کی نماز کے بعد نواب نے سجدے سے سر اٹھایا تو

سیگم نے دیکھا جانا زبیمگی ہوئی تھی۔ آدمی آدمی رات تک نواب آیت الکرسی پڑھ کر بیٹھ کر سو گیا۔
 رہے صبح ہونے تک بخار کم ہوا۔ صدقہ دینے بکرا منگایا گیا تو داروغہ مطہج نے اس میں بھی اپنے
 نو عدد بچوں کا حصہ شامل رکھا۔ صدقہ اتار کر بکرا یتیم خانے کے حوالے کر دیا گیا اور داروغہ صاحب
 برٹن کر دیئے گئے۔ آج دہن کے سامنے بیتے ہوئے دونوں کی فوج نے مارچ پاسٹ کیا تو انہیں
 فوجیوں میں سے ایک نے ان کے والد نواب جنگ کی ان سے بے پناہ محبت کی ایک تصویر
 ان کے سامنے سے گذار دی لیکن دہن نے اس تصویر میں یہ کہیں نہیں دیکھا کہ بکرے کے ساتھ
 داروغہ جی اور ان کے نو عدد بچے بھی رانی بیٹیا پر سے تصدیق کر دیئے گئے۔

فرزانہ آپادولھے والی تھیں پر اس کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ وہ ہمیں خاطر ہی میں نہ لائیں
 اباجھامیری تو ہیں برداشت کر سکتے ہیں کبھی۔ ”پاؤں میز“ کا رسم آیا تو چاندی کے گنگن اور پٹاز
 پر سونے کا ملمع تھا اور پھر مہر النساء کے ہاتھ پاؤں ہی کتنے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دلہا میاں
 سے وہ قدمیں کچھ نکلتی ہوئی ہی تھیں۔ اور پھر ویسے بھی مہر کے آگے سلیم صاحب بس نام ہی کے
 شہزادے تھے۔ کہاں مہر النساء لندن کی بیٹی ہوئی اور کہاں جاپان کے سلیم میاں۔ ستر روپے کلدار
 میں ابامیاں نے ”ٹائے امپوریم“ کو آرڈر دے کر مہر کو منگوایا تھا۔ پارسل کھلا تو کس احتیاط سے
 مہرورانی لکڑی کے ڈبے میں آرام کر رہی تھیں تیس تیس روپے کے جاپانی سلیم صاحب سے
 مہر کو بیٹا ہتے وقت ہم نے فرزانہ آپا کی خاطر یہ تک نہ سوچا کہ مہر اور سلیم کا جوڑ نہیں سلیم میاں
 تو بس نام کے شہزادے تھے۔ اس کے باوجود بھی ہم نے جنیز میں کوئی کسر اٹھانہ لکھی۔
 ”پاؤں میز“ کی رسم دیکھی تو میری آنکھ سے آنسو ہی تو نکل گئے۔

جاپان کے سلیم میاں سے لندن کی مہر و بیہ دول اور اس پر سیلیوں کے سامنے طمع
 کی پازیب اور گنگن بتلا کر اپنی آبرو گنوا بیٹھیں۔

ابامیاں اس قدر برہم ہوئے کہ بس رشتہ ٹوٹ ہی تو رہا تھا۔ فرزانہ آپا نے

فراست سے کام لیا اور گھوڑے جوڑے کی رقم میں کمی کر دی۔ ابامیاں تو اس پر بھی راضی نہ تھے گھوڑے جوڑے کی رقم میں کمی کی بجائے زیادتی بھی ہو سکتی تھی لیکن مہر کی شادی میری شان کے مطابق ہونا ہی تھی۔

فرزانہ آپا نے مجھے پھکارا۔ سو بار تو چوما ہو گا میری پیشانی کو۔ بات اس قدر پکی ہو کر ٹوٹ جاتی تو بے عزتی کے سوا اصل کیا ہوتا میں نے بھی سوچا فرزانہ آپا اور میں کچھ جدا نہیں۔ ان کی بے عزتی میری بے عزتی ہے اور میں نے ہاں کر دی۔

پھر شادیانے بچے، شہنائیاں بجیں۔

پلکوں پر رر کے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔ دلہن بہت دل گیر ہو گئیں۔ جس کی گڑیا کی اتنی عزت تھی آج خود اس کی اس طرح توہین ہوئی۔

بیٹے ہوئے ایام کی مارچ پاسٹ کرتی ہوئی فوج جانے کو نسی کو نسی تصویریں دلہن کے سامنے سے گذارتی رہتی لیکن شکرم صدر دروازے تک لگ گئی تو دلہن چو نکلیں۔ آج وہ کچھ اس طرح اپنے میکے آئی تھیں کہ کوئی خوش آمدید کہنے والا بھی دروازے پر موجود نہ تھا۔

شکرم کا دروازہ کھٹکنا تھا کہ مراد خاں پہرہ دار کے پہلو سے دل آرام بواست پٹا کر اٹھیں تو یہ بھی بھول گئیں کہ مراد خاں نے ان کے دونوں ہاتھوں کو انہیں کے دو پیٹے سے کس کر باندھ دیا ہے۔ دلہن پر نظر پڑی تو بس چیخ ہی تو کھل گئی منہ سے اور وہ چھلانگ لگا کر مراد خاں کی چوڑی چمکی پیٹھ کے پیچھے جا دیں۔

دلہن نے بھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ طوفان بھلا کس کا انتظار کرتا ہے۔ دلہن کے سینے میں کتنے ہی طوفان پھر رہے تھے بس وہ آنسو پونہ پختی ہوئی دیوان خانے تک جا نہیں دل آرام بوانے بھی نوچ ناچ کر دہ پیٹ ہاتھوں سے الگ کیا اور الٹا سیدھا سینے پر ڈالتی ہوئی اندر بھاگیں۔ مراد خاں نے صرف اتنا سا کہ باد لے کتے میں نہ کہتی تھی کہ دروازہ

اندر سے بند کر لے۔ لیکن باولے کتے کو اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ جاتے جاتے دل آرام ہوا کان اٹھ گئی ہیں۔

دل آرام ہوانے دلہن کو بچ صحن میں جا لیا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھ کر دشمنوں کا مزاج پوچھتی رہ گئیں۔ لیکن دلہن جیسے پکا پھوڑا بنی ہوئی تھیں کسی نے ہلکا سا شتر لگایا اور پھوٹ بہیں۔ دل آرام ہوانے مزاج کیا پوچھا دلہن سسک سسک کر رونے لگیں۔ بڑی ہیلم صاحبہ یعنی دلہن کی ماں غالباً غسل خانے میں تھیں دلہن کی آوازیں تو بس گیلے بال جھٹکتی ہوئی صحن تک آ پہنچیں اور دہلیز پر بری طرح گرتے گرتے سنبھلیں۔ ماں نے سینے سے لگایا تو پھر کچھ نہ پوچھے بیچاری دلہن کس کس طرح روتی ہیں۔ پیٹ کر۔ پیر پیٹ کر۔ بڑی ہیلم صاحبہ پوچھتی رہیں اور جواب میں دلہن یہی کہتی رہیں کہ ایسے گھر میں میری شادی کیوں کی جہاں ایروں غیروں کے آگے میری سبکی ہوتی ہے۔

نواب جنگ نے تفصیلات سنیں تو بہت برہم ہوئے۔ ناشتہ کیا نہ دوپہر کو کچھ کھایا پیا۔ بے چین اور مضطرب دلیوان خانے میں ٹہلے ٹہلے تصویر فریٹھیجے جاتے۔ پھر اٹھ کھڑے ہوتے اور ٹہلنے لگتے۔ بٹی کی بے عزتی ان کی بے عزتی تھی۔ چاہتے تھے کہ فوری انتقام لے بیٹھیں اور سمجھن کو وہ وہ بے بجاؤ کی سنائیں کہ عقل ٹھکانے لگ جائے ان کی۔ لیکن ہیلم نے اپنے نرم ہاتھوں سے ان کی غلا لیں کے کوٹ میں چھپی ہوئی پیٹھ کو سہلا سہلا کر انھیں ٹھنڈا کیا۔ دلہن نے خود اپنے ہاتھوں سے نواب جنگ کو کھانا کھلایا۔ کھاپی کر سنبھلے تو لا بریری میں جا بیٹھے بڑی بڑی شیشے کی الماریوں میں موٹی موٹی انگریزی خوبصورت کتابیں جمی ہوئی تھیں جلدوں کی سنہری اور رد پہلی تحریریں اپنی کرنیں لا بریری میں آنے والوں پر چمکتی ہیں اور انھیں طرح طرح سے رجباتیں لیکن نواب جنگ سے لے کر ان کے ملے والوں تک کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ ان کا منوس وغیرہ اسحق تو صرف رحمن فراش متجاہور روزانہ الماریوں کے

شیشوں کو صاف کرتا اور کبھی کبھی ڈسٹر سے انہیں بھی لگے دیتا تو وہ جیسے باوجود اپنی ساری ناقدریوں کے رحمن فراش کی ممنون ہو جاتیں۔ رحمن فراش سمجھتا کہ نواب جنگ انہیں کتابوں کی بدولت آج اس حد پر ہیں۔ لیکن کتابیں کسی طرح بھی رحمن فراش سے نہ کہہ سکتی تھیں کہ نواب جنگ نے انہیں کبھی کھول کر بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اور اب انہیں سلور فش (SILVER FISHES) کا ایک خاندان کا خاندان پڑھ رہا ہے۔ چاڑ رہا ہے۔ اندری اندر کھوکھلا کر رہا ہے اور بہت جلد نواب جنگ کے دماغ کی طرح وہ بھی اندر سے بالکل خالی غولی ہو جائیں گی۔

میز پر پہنچ کر نواب جنگ نے کاغذ سامنے کھینچا تو سمجھا ہوا غصہ دبے پاؤں ان کے دماغ میں اس طرح داخل ہونے لگا جس طرح ان کے اطراف پھیلی ہوئی شیشوں کی مقفل الماریوں کی سچی ہوئی خوبصورت کتابوں میں سلور فش داخل ہو گئی تھیں۔ نواب جنگ نے قلم اٹھایا اور نادو میاں کو ان کے آباد اجداد کو۔ ان کے خاندان کو سب کو ایک سانس میں نوازا دیا۔

خط پہنچا کر ہر کارہ رسید لے آیا تو نواب جنگ کو سکون ہوا۔

کمرے میں مہری پراوند سے پڑے پڑے نادو میاں سوچتے رہتے کہ دلہن کو منا پھسلا کر کس طرح واپس بلایا جائے۔ ان کی خاموشی اور بے چینی کو سارا گھر کا گھر محسوس ہو کر تھا لیکن کوئی بھی کلمے بندوں ہمدردی نہ کرتا۔ سمجھوتے کے لیے عملی اقدام کرنے کی تو بات دور رہی۔ وہ سبھی کسی سے کچھ نہ کہتے۔ روز صبح ٹوپی سر پر رکھ کر بی اماں کو آداب بجالاتے۔ بی اماں سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیتیں کہ سارے زمانے کی خوشیاں نادو میاں کے حصے میں آجائیں۔ لیکن نادو میاں یہ بھی نہ کہہ سکے کہ ان کی رہی سہی ساری کی ساری خوشیاں دلہن اپنے ساتھ لے گئی ہیں اور بی اماں نے ہی دلہن کو اکسایا ہے کہ وہ نادو میاں کو لوٹ لے۔ نادو میاں کے گھر والوں کی طرف سے پہل کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ ایسے اقدام سے ایک تو بی اماں کی شکست تسلیم کرنی پڑتی دوسرے دلہن کی مزاج داریوں کو برداشت کرتے رہنے کا سلسلہ جاری

رہتا۔ بی اماں کے وقار نے کسی کو اجازت نہ دی کہ نادومیاں پر رحم کھائیں اور ان کی ننھی منی گڑیا کو منالائیں جس کی طراری اور تلون کے باوجود وہ اسے محبت کرنے لگے تھے۔ دلہن والے اپنی جگہ برہم تھے کہ جب تک نادومیاں اپنے کیے پر پشیمان نہ ہوں اور معافی نہ مانگ لیں اور آئندہ سے دلہن کی شان میں ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کرنے کا یقین نہ دلائیں۔ دلہن کبھی اوپر کا رخ نہ کریں گی۔ نادومیاں کی خاموشیوں اور اداسیوں کو دیکھ کر بی اماں سناڑ کے بعد دعائیں مانگتیں کہ اللہ پاک تو دلہن کو عقل عطا کر وہ جلدی آئے اور معافی مانگ لے۔

بی اماں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے سمدھی نواب جنگ نے نادومیاں کو خط کے ذریعہ اس قدر نوازا ہے کہ اللہ میاں بھی سچ سچاؤ کے لیے درمیان میں پڑتے تو سبھی صحت کچھ نہ ہوتا یا خود بی اماں یہ خط دیکھتیں تو سناڑ میں دعائیں نہ مانگتیں۔

چھ مہینے کی طویل مدت تک نادومیاں تڑپ تڑپ کر گزارتے رہے۔ دلہن ان کی زندگی میں برقی رو کی طرح داخل ہوئیں ان کے دل و دماغ کو جیسے لمحے بھر کے لیے جھنجھڑا اور سہرا غائب ہوئیں اندھیری رات میں ایک چھوٹے سے باغ کے تاریک گوشے میں ایک جگنو چمکا۔ نادومیاں بیچارے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آسمان پر بجلی چمکی اور چمک کر دو چاند لحوں کے لیے اپنی پوری تابانی کے ساتھ جیسے جامد ہو گئی۔ نادومیاں نے دیکھا تو بیچاروں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اب پتہ نہیں وہ روشنیاں کہاں ہیں نادومیاں صدف ملکیں جھپکتے رہ گئے ہیں۔

دل کے تاریک نہاں خانے میں جیسے نورِ تمنا کی ایک کرن لجاتی آتی۔ لیکن بی اماں نے دل میں ناچتی ہوئی اس ننھی سی کرن کو مکڑ کر نادومیاں کی زندگی کو بے نور کر دیا۔ نادومیاں کچھ اسی طرح سوچا کرتے۔

دلہن زیادہ دنوں نادومیاں کے ساتھ رہتیں تو بہت ممکن تھا کہ دلہن کے قلع سے نادومیاں کے سوچنے کا انداز کچھ مختلف ہوتا۔ ابھی تو دلہن کی طراری، زبان درازی اور

ابھی پرچھائیاں

گرتی دیوار پر

تھک مزاجی میں بھی نادومیاں کے لیے کشش تھی۔

شریتہ نگلاس بی اماں نے نادومیاں کے ہونٹوں سے لگایا۔ وہ ایک ہی گھونٹ لے سکے تھے کہ بی اماں نے نگلاس ہٹالیا کیوں کہ بی اماں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی سمجھ میں نہ آسکتی تھی۔ اس گلاس میں کچھ کڑواہٹیں اور تلخیاں بھی ملا دی ہیں جس سے نادومیاں کا منہ خراب ہو جاتا۔ یقینی ہے لیکن نادومیاں نے منہ پر ایک گھونٹ پیا تھا اور ہونٹوں پر زبان ہی پھرتے رہ گئے۔ اور پھر اس میں ان بچاروں کا قصور ہی کیا تھا۔ بالکل چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح وہ شہد چٹانے پر چٹخارے لیتے اور کوئین پلا دینے پر ابکیاں، کوئین کی شیشی کو زمین پر ٹپک کر شہد کی شیشی کو ہاتھ میں مقام لینے کی سعادت مندی نے انہیں اجازت ہی نہ دی؟ گھر ماکھی چھٹیلاں ہوئیں تو نواب رمضان علی خاں گھر چلے آئے جو کئی سال سے اٹاؤے میں اسی جماعت میں پڑھ رہے تھے جس جماعت میں شریک ہوئے تھے۔ چھوٹے بھائی کی آمد پر نادومیاں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی بیڑی میں ان کا کوئی غمخوار بھی ہے۔

گھر میں ذرا چل پہل بڑھ گئی۔ گلبدن بوادن میں تین بار صابن سے منہ دھونے لگیں۔ خواجہ سرانے زردوزی کے کام کا لال روپہ پھر نکالا۔ انجمن بوا کی بیٹی نے سوسیاں پوتے والی سے ایک چھوٹا سا آئینہ خریدا جس کو نیپے میں اڑس کر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھ لیں۔ گلبدن بوا براہ صابن سے منہ دھوتی رہیں اور انجمن بوا کی بیٹی دن میں دس بار اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ کر زلفیں سنوارتی رہیں۔ البتہ بچاؤ سے خواجہ سرانے زردوزی کے کام کا لال روپہ اتار چھینا اور ساتھ ساتھ کبھی گلبدن بوا کو ساتھ لے کر انجمن بوا کی دختر نیک اختر کو بد دعا میں دیں لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔

نادومیاں اب پہل قدمی کے لیے کبھی کبھار بھائی کے ساتھ باہر بھی نکلنے لگے کبھی کبھی نانک اور سینما بھی دیکھنے لگے۔ شام کا تھوڑا سا وقت وہ رمضان نواب کے ہمراہ

ادھر ادھر گزار لیتے لیکن دن اور رات انہیں دلہن کی کمی بری طرح محسوس ہوتی اور بچا کر
اواس ہو جاتے۔

ایک دن صبح ہی سے رم جم رم جم بھوار پڑ رہی تھی۔ نادو میاں بہت دل گیر تھے
دن بھر بادل چھائے رہنے کی وجہ سے سارے ماحول پر اداسیاں مسلط تھیں۔ لیکن
نادو میاں کے دل پر تو گٹھائیں کچھ اس طرح چھائی تھیں کہ نہ کھلی تھیں نہ بستی تھیں۔
کبھی ترنگ میں ہوتے تو نادو میاں بستر پر اوندھے پڑے عجیب عجیب حرکتیں کرتے
رہتے۔ کبھی گلے پر چھری پھیر کر سھینکے ہوئے مرغ کی طرح تڑپ کر دو تین منٹ میں ٹھنڈے
ہو جاتے۔ کبھی تکیوں سے چپٹتے۔ کبھی سگریز تک رضائی اڑھتے جیسے رضائی کے
اندر رتھر تھر متھر کانپتے رہتے۔ کبھی اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرتے اور بہت سنجیدہ رہتے
چپ چاپ اوندھے پڑے ٹانگ ہلاتے رہتے۔ جانے کیا کیا ہوتا۔ نادو میاں بس رونے لگتے
یہ بھی نہ سوچتے کہ بڑے بھائی جان کو ٹٹھے سے چو آنی جان کو چپکے سے اٹھالائے۔ اس
واقعہ پر راز کے بڑے موٹے موٹے پردے ایک عرصہ تک پڑے رہے لیکن جب بی اماں
کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی مصلحتاً اس کو راز ہی رہنے دیا اور کچھ اس طرح اپنا رویہ
رکھا جیسے انہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ کیوں کہ بی اماں نے سوچا کہ اگر یہ راز راز ہی رہے
تو صاحبزادے پر کم از کم ان کا رعب تو رہے گا ورنہ یہی سہمی آن بھی جاتی رہے گی۔
لیکن بہت جلد صاحبزادے کو معلوم ہو گیا کہ بی اماں کے کانوں تک ساری باتیں پہنچ گئی
ہیں لیکن انہوں نے اپنے رعب داب کی بقا کے لیے راز کا ایک پردہ چھوڑ لیا ہے۔
اس طرح دوسرے تو کسی نہ کسی طرح اپنے من کی کر لیتے لیکن نادو میاں بس
ٹانگ ہلاتے اوندھے پڑے رہتے۔

لیکن آج انہوں نے ارادہ کر ہی لیا کہ مضامیاں سے مدد لیں گے۔ کیوں کہ

مضومیوں یعنی نواب رمضان علی خاں ہی اس بھری دنیا میں بیکادوتہا انھیں ہمدرد نظر آئے۔ چنانچہ انھوں نے مضومیوں کو ہموار کر لیا کہ وہ ان کے خسر صاحب اور اپنی دلہن بھانج سے ملیں۔ نادومیوں کی دکھی زندگی کا خاکہ کھینچیں اور دلہن کو لوٹ آنے کے لیے آمادہ کر لیں۔ نادومیوں نے مضومیوں سے اس قسم کی بات بہت دل کڑا کر کے کی تھی لیکن بات ختم ہونے تک ان کی ہلکوں پر دو چار خطے کسی نہ کسی طرح چمکتے ہی رہے۔

مضومیوں اپنی دلہن بھانج اور ان کے والد نواب جنگ سے مل آئے لیکن نادومیوں کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ نواب جنگ کی برہمنی بدستور قائم تھی کہ ان کی بے عزتی ہوئی ہے اور اس توہین کا ازالہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ مضومیوں کی والدہ خود اپنی غلطی پر نادم ہوں اور دستِ صلح دراز کریں۔ نواب جنگ نے مضومیوں کو سمجھایا کہ یہ باتیں ٹبروں ہی کے طے کرنے کی ہیں بچوں کو ان مسائل کے طے کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ اور ہر ادھر کی باتیں کر کے مضومیوں کو لوٹ آئے، تو نادومیوں کے لیے تو انھیں کچھ نہ ملا۔ البتہ دلہن کی مسکراتی ہوئی نظروں کو انھوں نے دل و دماغ میں چھپا کر رکھ لیا۔ شادی میں وہ شریک نہ ہو سکے تھے نہ دلہن نے انھیں دیکھا تھا نہ انھوں نے دلہن کو۔ نواب جنگ البتہ مضومیوں سے واقف تھے۔ آج نواب جنگ نے دلہن کا ان سے تعارف کرایا تو مضومیوں کو بھانجے نادومیوں کی بھانجی ہوئی آنکھیں یاد آئیں۔ وہ دلہن کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے رہے کیوں کہ ان آنکھوں کے پیچھے چھپے ہوئے آنکھیں لاوے سے انھیں کچھ بھی مطلب نہ تھا۔ یہ آنکھیں اگر شعلہ بارہوں بھی تو مضومیوں کو توڑے ہی جلیں جائیں گے۔ ان شعلوں سے انھیں واسطہ نہ تھا وہ تو نادومیوں کے حقے کی چیز تھی۔ مضومیوں تو صرف اس چمک سے ماتہ جوڑنا چاہتے تھے۔

مضومیوں گھر لوٹے تو نادومیوں منتظر تھے۔ نادومیوں نے دلہن کے بارے میں ساری باتیں دریافت کیں۔ گفتگو کے وقت وہ کیا کرتی رہیں۔ کچھ دہلی ہوئی ہیں یا مٹی ہوئیں۔

کچھ ان سے کہنے کے لیے تو دلہن نے نہیں کہا، وہ خاموش تھیں یا بہت ہنس رہی تھیں۔
مضمومیاں نفی میں سر ہلاتے رہے اور نادومیاں کی اداسیاں بڑھتی گئیں۔

اس کے بعد مضمومیاں دلہن بھاوج سے ملنے کے لیے برابر جاتے رہے اور بہت
جلد انھوں نے اس طرح آنا جانا شروع کیا کہ ان کی آمد و رفت کی خبر نہ نادومیاں ہی
کو ہوتی اور نہ ان کے خسر کو۔

ایک دن نادومیاں کو غیر متوقع طور پر دلہن کی چٹھی وصول ہوئی۔ دلہن نے
سوسو طرح ان کو لہجایا تھا۔ اپنے کیے پریشانی اور شرمندگی کا اظہار کیا تھا۔ قسمیں کھا کر
انھیں یقین دلایا تھا کہ اب ان کے بغیر زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ آخر میں دلہن نے ان سے
رات کو چھپ کر ملنے کی خواہش کی تھی تاکہ نواب جنگ اور بی امالہ کے غصے کو کم کرنے کا کوئی
طریقہ سوچ سکیں۔ چٹھی ملی تو نادومیاں دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ کبھی چٹھی طریقے پر پڑھتے
آنسو پونچھ لیتے۔ کبھی ہنسنے لگتے۔ کبھی چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر چٹھی کو آنکھوں سے
لگا لیتے۔ کبھی ہونٹوں سے۔

رات کو جب دیوار بچانہ کر دلہن سے ملنے کے لیے پہنچے تو ان کا عجیب عالم تھا۔ دل
اس زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینہ چھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ فرط مسرت سے کانپ
رہے تھے دلہن سے ملے تو دلہن قدموں میں بچھ بچھ ٹٹیں۔ نادومیاں نے دلی دلی میں اللہ پاک
کا شکر ادا کیا کہ ان کی طویل بے قراری اور محبت نے آخر میں دلہن کا دل موہ لیا۔ وہ تو بس
باور لے ہو رہے تھے کبھی دلہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چپ چاپ گھورتے رہتے۔ کبھی کچھ
بولنے کی کوشش کرتے اور آواز حلق میں اٹک جاتی تو دلہن کے سینے پر سر رکھ کر
زلفوں سے کھیلنے لگتے اور آنسو چھپا لیتے۔ غرض کہ نادومیاں کو اس وقت ہوش آیا جب کہ
موزن نے فجر کی اذان دی۔ اس رات نادومیاں نے جہاں دلہن میں بہت سی تبدیلیاں دیکھیں

وہیں یہ بھی دیکھا کہ ان کی صحت خراب ہو گئی ہے اور وہ بلت کرتے کرتے ابھائیاں لینے لگتی ہیں۔ ایک دوبار ایسا بھی ہوا کہ دلہن آہستہ سے نادومیاں کے پہلو سے اٹھ کر کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے باہر چلی گئیں اور جب واپس ہوئیں تو ان کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر مسکراہٹ جو نادومیاں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس کے بعد نادومیاں اپنی دلہن کے پاس چھپے چوری ایک آدھ بار اور جلسے لیکن کچھ ہی دن بعد جب کہ مضومیاں اٹاوے کو لوٹنے کی تیاریوں میں تھے نادومیاں کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ دلہن حاملہ ہیں کیوں کہ نادومیاں چپ چپ کر اپنی دلہن سے ملنے جایا کرتے تھے۔ نادومیاں نے اس خبر کو خاموشی سے سنا اور جانے اپنے کمرے میں اونٹھے پڑے کیا کیا سوچتے رہے۔ بات بی اماں کے کانوں تک پہنچوائی گئی تو بس ننھا ان کی آنکھوں کے سامنے کیلئے ہی تو لگا۔ بی اماں گھر میں اس قسم کی رونق کے لیے ترس گئی تھیں۔ بیٹیوں کو اللہ رکھے بچے تھے لیکن وہ بی اماں کے گھر کی زینت بننے سے تو رہے۔ رہ گئے بڑے نواب سوان کے بچے تو بازار ہی کی رونق تھے۔ بی اماں نے نادومیاں کی چوری چھپی ملاقات کی بات سنی تو ساتھ ہی یہ بھی سنا کہ کوئی ننھی سی جان بھی اب اس گھر کے والی وارث کی حیثیت سے آدھمکے گی۔ ورنہ وہ دلہن سے ہار نہ بانیں اور نادومیاں کے لیے گھر کا نقشہ دوسرا ہی ہوتا۔ لیکن اب بی اماں اپنے دل کو نہ سنبھال سکیں اور جھٹ نادومیاں کو بلا بھیجا وہ مقطع بنے ٹوپی پہن کر آئے اور نظریں نیچی کیے کھڑے ہو گئے تو بی اماں نے بہت شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ وہ آج ہی دلہن کو گھر لانے جا رہی ہیں اور انھوں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ نادومیاں نے اپنے پر قابو پایا۔

دلہن گھر میں آئیں تو اب ان کے اللہ نکلے تھے۔ نئی نئی چیزیں ان کے لیے خاص طور پر پکوائی جاتیں۔ بی اماں نے حکم دے رکھا تھا کہ دلہن کی ہر بات، ہر خواہش پوری کی جائے

ان کو غصہ نہ کرنے دیا جائے۔ ماں کی معمولی معمولی حرکتوں کا شہینچے پر پڑتا ہے۔ خود دلن بھی ذرا غصہ کم ہی کرتیں لیکن ان ساری باتوں کے باوجود نادومیاں پہلے سے زیادہ اداس رہنے لگے۔ بٹھکی ہوئی روح کی طرح ڈیوڑھی کے بیرونی حصے میں جو بالکل خالی پڑا ہوا تھا نادومیاں گردن جھکائے گھومتے رہتے کبھی گھنٹوں کو نے میں بیٹھے رہتے۔ کبھی دلن کے پاس جا بیٹھے تو اس امیدیں کہ کسی نہ کسی طرح دلن سے کہہ سکیں کہ تم نے میرے سینے پر جو بہت بڑا پتھر رکھ چھوڑا ہے اس کو اپنے ہی ہاتھوں سے فوراً ساہرہ کا دو لیکن ایسی بات وہ دلن سے نہ کر سکے اور دلن ہی میں کہاں اس قدر ہمت تھی کہ وہ اس بوجھ کو ہٹا سکیں۔

نادومیاں اندر ہی اندر چھنک رہے تھے۔ زبان کھولنا ان کے بس کی بات نہ تھی، عزت کا سوال تھا۔ سارے خاندان کی عزت کا۔ اور پھر ان کی اپنی انفرادی حیثیت بھی تو تھی۔ بات کھل جاتی تو نادومیاں پر کیا گذرتی؟ دلن تو خیر عزت مند ہوتیں تو جیتی جاگتی مرجاتی لیکن نادومیاں بھی تو زندہ درگور ہو جاتے۔ بات کچھ اس طرح ہی تو پھیلتی کہ کبھی نادو کی دلن نے — نادومیاں کانپ کانپ جاتے — سو اسی لیے انھوں نے اپنے لب سی لیے۔ اپنے کمزور دل پر ایک بہت بڑی چٹان رکھ لی۔

ننھا پیدا ہوا تو شادیانے بجائے گئے۔ کپڑے تقسیم کیے گئے۔ مبارکبادیوں کے جواب میں شکریہ ادا کرتے کرتے نادومیاں کی زبان سوکھ گئی۔

وہ باوجود یہ سوچتے رہنے کے کہ بچہ ابھی تین ماہ بعد تولد ہونا چاہیے تھا، مبارکباد پر اس طرح شکریہ ادا کرتے جیسے رٹا ہوا طوطا ہر منٹ دو منٹ بعد شکریہ کی رٹ لگاے۔ نادومیاں ننھا مبارک ہو، شکریہ.....

نادومیاں ننھے کا کیا نام سوچا ہے۔ شکریہ۔ نادومیاں آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ شکریہ نادومیاں، آپ پاگل تو نہیں ہو گئے، شکریہ۔ غرض کہ نادومیاں کچھ اسی طرح شکریہ شکریہ

کہتے رہے۔ اگر انھیں مبارک باد کی بجائے کوئی گالی دی جاتی تو بھی وہ نہایت اطمینان سے مری ہوئی آواز میں شکریہ ادا کرتے۔

دلہن کا چلہ ہوا تو نئے کا نام بھی اسی دن تجویز کیا گیا۔ نام رکھائی کے بتائے تقسیم کیے گئے۔ سارا خاندان مدعو کیا گیا۔ دلہن کو سجا سنوار کر پھر دلہن بنایا گیا۔ بی اماں نے شہر کے سب سے بڑے فوٹو گرافر کو بلایا پوتے کو پیسے کے گود میں دے کر مہو پیسے کے ساتھ اپنی تصویر کھجوائی۔

— اسی رات نادو میاں کچی میندر سے چلتے ہوئے اٹھے اور بے تحاشہ بھاگنے لگے۔ پکڑو پکڑو بھاگنے نہ پائے۔ میں جب تک زندہ ہوں دلہن کو کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ ان کی طرف آنکھ تک اٹھا نہیں سکتا۔ مگر اس کو پکڑو بھی، پکڑو لو۔ وہ چھپ رہا ہے۔ وہ چھپ رہا ہے۔

مردانے دروازے کے قریب دھڑے ہوئے تخت کو جس پر نوبت بجائی گئی تھی، وہ اندھیرے میں دیکھ نہ سکے اور ٹکرا کر اس پر گر پڑے، ایک مہیب چیخ ماری تخت کا کونہ ان کے پیٹ میں دھنس گیا۔

اسی رات کونادو میاں نے کفن اوڑھ لیا اور نہایت خاموشی سے چپ چاپ اپنی عزت و آبرو کو اپنے ساتھ لیے زمین کے اندر جا چھے۔



باورچی خانہ کی چوکٹ پر کھڑا علی احمد کھانستارہا۔ اور اس نے کبھی ہوئی بیڑی بڑے
 پیار سے سلمیٰ پر دے ماری جو اس کی کمری ہوئی لٹوں میں اٹک گئی۔
 سرخ مرصی ہانڈی میں ڈال کر سلمیٰ نے ہانڈی پر صحنک ڈھانک دی اور اپنا آپنل
 منہ میں ٹھونس لیا لیکن اس کے بعد سبھی وہ اپنی منہسی نہ روک سکی۔ علی احمد برابر کھانستارہا۔ سلمیٰ
 نے صحنک ہٹا کر دو ایک سرخ مرصی ہانڈی میں اور ڈال دیں اور اطمینان سے ٹھنسا ہوا
 آپنل منہ سے نکال کر ہنسنے لگی۔ چیر چیر کی آوازیں گویا دال کے بگھار کا پروگنڈہ
 کر رہی تھیں اور اپنی کامیابی سلمیٰ ہتھیلے لگا رہی تھی۔ کیوں کہ علی احمد مسلسل کھانس رہا
 تھا، اور اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر رہے تھے۔ علی احمد جب کھانس کھانس کر ڈھال
 ہو گیا تو ہانڈی میں چیر چیر کی آوازیں ختم ہو گئیں اور سلمیٰ کی بے طرح پھیلی ہوئی باجھیں ذرا
 ساسمٹ گئیں اور اب لبوں پر صفت زیم نرم مسکراہٹ باقی رہ گئی، علی احمد کا چہرہ سرخ
 ہو گیا تھا۔ وہ جست لگا کر باورچی خانہ میں کود پڑا۔ سلمیٰ اٹھی اور ہرن کی طرح تڑپ کر
 ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھ اس نے آگے کی طرف مزاحمت کے لیے

بڑھادیئے اور بل کھا کر نہستی رہی۔ اپنی دانست میں وہ جیسے سمجھ رہی تھی کہ مزاحمت کے لیے آگے بڑھے ہوئے اس کے نازک ہاتھ کسی خونی شیرنی کے پنجے میں جنھیں دیکھ کر علی احمد جھجک جائے گا۔ لیکن علی احمد فاسخانہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھتا گیا اور وہ تڑپ کر صحن کی طرف رہاگی لیکن صحن میں پہنچنے پہنچنے تک اس کی اوڑھنی اس کے سینے پر سے سانپ کی طرح رینگتی ہوئی علی احمد کی مضبوط گرفت میں آچکی تھی، اور اس نے نہایت اطمینان سے اس سانپ کو اپنی گردن میں لپٹ رکھا تھا۔ سلمیٰ صحن میں تھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے صحن میں ادھر ادھر دیکھا۔ بوڑھی دادی اماں پان کے پیرے میں لونگ لگانے میں مگن تھیں۔ چھ بچا یک اس کی نظریں جھکیں۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے علی احمد اس سے انتقام لے رہا ہے۔ ہانڈی رسوئی گھر میں خاموش پڑی تھی لیکن وہ ابال وہ اتھل پھل جو لمحہ بھر پہلے ہانڈی میں مچیں ڈال کر سلمیٰ نے پیدا کر دی تھی کچھ ایسی ہی کیفیت علی احمد نے اس کے سارے بدن میں پیدا کر دی تھی۔ وہ کچھ زیادہ نہ سوچ سکی اور اس سے پہلے کہ دادی اماں کی نگاہیں پان کے پیرے سے ہٹ کر اس پر پڑیں وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں پہنچ گئی تھی۔ علی احمد کی مضبوط گرفت میں اس کی ساری ہستی اتھل پھل ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے علی احمد اس کے جسم میں سرخ سرخ مریں بھر رہا ہے۔ یہاں تک کہ بگھاری ہوئی دال کی ہنڈیا کی طرح وہ سچی بالکل خاموش ہو رہی۔ علی احمد نے اپنی گرفت سے اس کو آزاد کیا تو اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ سرخ گالوں کو تھپ تھپاتے ہوئے علی احمد نے کہا کہ کان پکڑ کر کہتی جاؤ۔

”او بالم۔ آئندہ سے اس طرح دال نہیں بگھاروں گی کہ تم جو پٹے کٹے نوجوان ہو میرے سامنے بوڑھوں کی طرح کھانے لگو۔“

لیکن سلمیٰ نے کہا کہ

دو او بالم۔ روزانہ اسی طرح دال بگھاروں گی کہ تیری کڑیل جوانی کھانتے

کھانتے میری نظروں کے سامنے بوڑھی ہو جائے۔“

سلمیٰ نے یہ باتیں علی احمد کی پہنچ سے باہر ہو کر کہی تھیں اور وہ اب صحن میں تھی

اس کا دوپٹہ اس کے سر اور سینے پر پھیلا ہوا تھا۔ اب کی بار علی احمد نے باورچی خانے میں کھڑے کھڑے زبان چڑانے پر ہی اکتفا کیا۔

امروہ کے درخت کی ایک پتلی سی ٹہنی کو ہاتھ سے چھو کر سلمیٰ نے سبھی احمد کو اس طرح دیکھا کہ وہ سمجھ گیا کہ آج کے کا جواب اس کو اس چھڑی سے ملے گا اور آج سلمیٰ ہار جائے گی۔
توجیت اسی کی رہے گی۔

آج سلمیٰ بہت خوش تھی۔ ننھی کو ہاف بالٹنڈا اٹھا لانے کے بعد اس کو ایسا محسوس

ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی بڑا انعام حاصل کر لیا ہے۔ وٹامن سے بھرپور انڈا جس کی

تعریف میں گوالیار پولٹری فارم کے مالک نے سلمیٰ کے سامنے ایک گھنٹہ تقریر کی تھی۔ اس

نے حساب جوڑ کر کہا تھا کہ ایک مرغی واقعی ایک سال میں سونے کا ایک انڈا ضرور دیتی

ہے اس کے تجربے میں بوڑھیوں کا یہ مقولہ سو فیصد بلکہ ایک سو پانچ فیصد صحیح ثابت ہوا

ہے۔ اس نے فٹس میں پھرتی ہوئی سفید مرغیوں کو اور برڈرز میں پھدکتے ہوئے

ننھے ننھے چوزوں کو بڑی دہشت سے دیکھا تھا۔ لیکن سونے کا انڈا پیدا کرنے والی یہ

ننھی ننھی چلتی پھرتی خوبصورت مشینیں اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ فی الوقت تو اس کو روزانہ

صرف ایک انڈا چاہیے تھا۔ وٹامن سے بھرپور ایک سیلڈ شیشی جسے بقول مالک گوالیار

پولٹری فارم اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے سیل کیا تھا۔ اونٹلی وٹامن (ONLY VITAMIN)

نو ڈاؤٹ فل آف وٹامن — (NO DOUBT FULL OF VITAMIN) صرف دو آنے میں

لیکن روزانہ صرف دو آنے کا چکر سہلی کے لیے بہت اہم تھا۔

ڈاکٹر نے بڑے پیار سے ننھی کے ملائم نکالوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا ”اس کو کچھ بھی تو بیماری نہیں ہے بس ذرا سی کمزور ہے بے بی۔ مگر بہت جلد پاؤں پاؤں پہلنے لگے گی۔ سر دیاں شروع ہو رہی ہیں۔ روزانہ ایک ہاف بائلڈ انڈا دے دیا کرو“ اور اس طرح سہلی نے سر ہلا کر ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا جیسے انھوں نے ننھی کو میٹھا ٹھنڈا پانی پلانے کے لیے کہا ہے یا پھر انڈے بھی تو نلکی کھول کر بالٹی لگا دینے سے لبالب بالٹی میں بھر جائیں ننھی کو سینے سے چماتے ہوئے وہ بچوں کے وارڈ کی سیڑھیاں اترنے لگی تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں گھس آیا۔ اللہ میاں نے ماں کی دونوں چھاتیوں میں دودھ ہی دودھ بھر دیا ہے۔ ایک طرف انڈے کی زردی اور سفیدی بھر دیتے تو۔۔۔ اس نے ننھی کو سینے سے چمایا تھا۔

راستے سمجھ لے سوجھتی رہی۔ روزانہ دو آنہ وہ کس مد سے نکال سکتی ہے۔ فوری اس کو ایک ترکیب سوجھی کہ گھر کے اجالوں کو ننھی پر سے قربان کر دیا جائے یعنی رات کو گھر کی لائٹ بہت کم جلائی جائے اور لائٹ کے بل کی بچت سے ننھی کو انڈے کھلائے جائیں۔ لیکن ننھی اس کو اندھیروں میں رہنے کی نظر آتی اور اپنے اس خیال سے گھر اگر اس نے پھر ننھی کو چوم لیا۔ اس کو ننھی ہی کے لیے روشنی کی بھی ضرورت تھی۔ وہ سارے گھر میں رہنے لگی پھرتی۔ ننھی آوازیں نکالتی۔ ہونٹوں سے پھر پھر کرتی گھر بھر کی چیزیں ٹوڑتی پھرتی۔ سو بچ پہاں تھرکھ کر سہلی ننھی کو دیکھا کرتی۔ کھٹکا داتے ہی سارا ماحول منور ہو جاتا اور ننھی کا چہرہ پورے چاند کی مانند کھل اٹھتا۔ سہلی کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ساری روشنیاں اسی ہنستے ہوئے ننھے منے چہرے کی یہ دولت ہیں۔۔۔ منٹ دو منٹ کے لیے فیوز ہی اڑ جاتا تو ننھی ہنگامہ برپا کر دیتی۔ میاں علی احمد

لاکھ سمجھاتے ”ننھی میں تیرا بابا ہوں“ سلمیٰ کہتی ”ننھی یہ رہی میں تیری امی“ لیکن ننھی کو جیسے اندھیروں سے نفرت ہے وہ اپنے بابا اور امی کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اس کا ایک ہی مطالبہ رہتا۔ رات ہوئی ہے تو بابا اور امی کے ساتھ روشنی بھی چاہیے۔
لہذا سلمیٰ سوچتی رہی۔ لائٹ کے بل سے وہ کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکتی۔ ننھی کو اندھیروں سے نفرت ہے۔ ننھی کو اجالوں سے پیار ہے اور اس نے سوچا کہ ننھی مستقبل کی نقیب ہے تو وہ اجالوں سے پیار کرے گی ہی۔

گھر پہنچتے پہنچتے اس نے مہینے بھگتے سارے اخراجات کا جائزہ لیا۔ زندگی کی ہر ضرورت نے اپنی اہمیتوں کو اس پر واضح کیا۔ وہ بالکل اسی طرح ہر ضرورت کی منت سماجت کرتی رہی جیسے ساری کی ساری ضرورتیں مجسم ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہوں۔ اناج اور غلہ کی شہزادی سے اس نے بہت انکسار سے کہا کہ بھئی تم کچھ کمی سے مہینہ سب کے لیے راضی ہو جاؤ۔ لیکن اس کو بالکل ٹکسا جواب مل گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے سفید سفید چاولوں کی قاب، پھولی ہوئی چیتوں کی پلیٹ اور بگھاری ہوئی ڈال کا کٹورا سب کے سب اس سے گلہ شکوہ کر رہے ہیں کہ بھئی تم نے ہمیں گوشت کی بوٹی بوٹی کے لیے ترسا دیا۔ علی احمد گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ دسترخواں پر گوشت ہوتا ہے تو وہ منہ لے لے کر ہمیں سراہتے ہیں۔ لیکن تم نے ہمیں تعریف و توصیف کے قابل ہی نہ رکھا۔ اب تو وہ بیچارے اس طرح زہر مار کرتے ہیں جیسے نہ کھانے پر انھیں سزا بھگتنی پڑے گی۔ ڈال کے کٹورے نے بڑبڑ کر کہا کہ بھئی ہم نے تمہارے پاس سوائے سرخ مرچوں کے اور کچھ نہ دیکھا۔ یہ ڈال ہمیشہ کی ڈال ہی رہی کبھی دالچہ نہ بن سکی۔ اب ہمارے لیے باقی ہی کیا ہے جو تم اس میں سے بھی بچت کی سوچ رہی ہو۔ سلمیٰ بدقت مسکرا سکی۔ اس نے ننھی کو پھر چوما۔ ننھی کے سر سے سرکتی

ہوئی منکی کیا پ کو برابر کرتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ لیکن اس کا ذہن اس کو اور سختی کو شکر پر چھوڑ کر پلک جھپکنے تک گم کے کمرے کے ایک گوشے میں دھڑے ہوئے صندوق تک جا پہنچا۔ لیکن صندوق بھی تو آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ سلمیٰ کی دو تین ساڑیاں۔ علی احمد کے ایک دو قمیص اور تلوں۔ ان ساڑیوں اور قمیصوں نے جیسے اس کے کان میں آہستہ سے کہا کہ سلمیٰ بی بی تم ہمیں گھر میں بھی تو دھو سکتی ہو۔ دیکھو نا۔ اب ہم میں اتنی سکت ہی کہاں رہ گئی ہے کہ تمہارے دھو بی کے مظالم سہہ سکیں۔ بڑی بے دردی سے وہ ہمیں پتھر پر ٹپک ٹپک کر چھانٹتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو تو ہمارا کیا حال ہو گیا ہے تم اگر اسی طرح ہمیں گھاٹ گھاٹ کی ہوا کھلو اور گی تو تمہاری یہ حسرت بھی دل ہی دل میں رہ جائے گی کہ تم کتر بیونت کے ہیں سختی کے غلبہ صورت فراموش میں تبدیل کر سکو۔ بس سبھی، آج سے ہم تمہارے نرم ہاتھوں ہی سے اشران کریں گے اور پھر اس طرح تمہارے ماہانہ چار روپے بھی تو بچ سکتے ہیں۔ بات سلمیٰ کی سمجھ میں آ سکتی تھی وہ کھل کر مسکرائی اور اس نے طے کر لیا کہ آئندہ وہ دھو بی کو جواب دے دے گی۔

وہ گھر پہنچی تو دلی محمد لائڈری والا اس کا منتظر تھا۔ دلی محمد کی ویسے کوئی لائڈری نہ تھی۔ وہ کپڑے دھو کر خود گھر گھر پہنچاتا پھرتا۔ خود نہ جاسکتا تو اس کی بیوی یہ کام کر دیتی لیکن اپنے نام کے ساتھ اس کو دھو بی کا استعمال گوارا نہ تھا۔ وہ جب بھی کسی کے گھر جاتا تو کہلا بھیجتا کہ دلی محمد لائڈری والا آیا ہے۔ کبھی کبھی زیادہ خوش رہتا تو کہتا دلی محمد لائڈری والے آئے ہیں۔ لائڈری کھول بیٹھنے کی حسرت اس کے دل میں بہت زمانہ سے تھی۔

سلمیٰ پہنچی تو دلی محمد لائڈری والے نے اس کو جھک کر سلام کیا۔ دلی محمد کی غیر متوقع آمد پر سلمیٰ سٹیمپا سی گئی جیسے اس کے فیصلے کی اطلاع دلی محمد کو ہو گئی ہو، لیکن اس

نے فوری خود کو درست کر کے ولی محمد سے پوچھا: ”تم کس طرح آدھکے ہولاندری والے سیٹھ۔ آج کپڑے لے جانے کی تاریخ بھی تو نہیں ہے۔“ لیکن ولی محمد بجائے اس کے کہ کچھ جواب دیتا، ننھی پر نظریں جمائے رونے لگا۔ سلمیٰ نے دلجوئی کرتے ہوئے سبب پوچھا تو اس نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا کہ بی بی جی میرا سچا شدید بیمار ہے۔ دواخانہ میں شریک کر کے گھر گھر پھرتا رہا۔ ہر جگہ سے مایوس ہو چکا تو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ اس بار میری تنخواہ پیشگی دے دیجئے بی بی اور دعا کیجئے کہ میرا لال جلد اچھا ہو جائے۔

سلمیٰ کی قوت گویا بی جیسے سلب ہو چکی تھی۔ وہ زبان تک نہ کھول سکی کچھ سنہل کر اس نے آنسو چھپاتے ہوئے کہا، فکر نہ کرو ولی محمد تمہارا ننھا بالکل اچھا ہو جائے گا۔ اس کے آگے کچھ کہنے کی سلمیٰ میں ہمت نہ تھی۔ کچھ سوچ کر وہ پچھلے پاؤں واپس لوٹ گئی۔ پٹروس سے دو روپے قرض لا کر اس نے ولی محمد کو دے دیئے اور نہایت ہی لجاجت سے کہا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہ مل سکا ولی محمد تم تو جانتے ہو تنخواہ کے لیے ابھی دو دن باقی ہیں لیکن تم فکر نہ کرنا۔ وہ آتے ہی میں انتظام کر کے انھیں کے ہاتھ تمہارے گھر بھیجوا دوں گی۔ ولی محمد نے کچھ اس انداز سے سلمیٰ کو دیکھا کہ وہ اس کی آنکھوں کی زبان صاف پڑھ سکے اور سلمیٰ نے اس کی آنکھوں کے پیام کو سمجھ کر کہا کہ میں تمہیں تمہارا حق ہی تو دے رہی ہوں، اس میں شکریہ کیسا، مہربانی کیسی؟

ولی محمد جا چکا تو سلمیٰ نے محسوس کیا کہ ننھی کی اٹنوں سے بھری ہوئی ٹوکری بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سلمیٰ خوش تھی اور اس نے طے کر لیا تھا کہ ولی محمد کی علیحدگی سے ننھی کو اٹنوں سے مل سکتے ہیں تو پھر ننھی کو اٹنوں سے نہیں ملیں گے لیکن اگر اٹنوں نے گویا اس کے دل کے قریب نشتر چھو کر یاد دلایا کہ ننھی بہت جلد پاؤں پاؤں چل سکتی ہے اس کو صرف ایک انداز روز کھلا دو۔

اُجلی پر چھائیاں

دامِ ہرمی

علی احمد گم آیا تو سلمیٰ نے اس کو کپڑے بدلنے نہ دیئے ولی محمد کے لیے سلمیٰ کی بے حد سے علی احمد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے بڑی محبت سے سلمیٰ کے کالوا چیت لگاتے ہوئے کہا کہ میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں لیکن تم ان گہری نیلی جھیلوں میں ڈوبنے سے تو مجھے بچا لو۔ سلمیٰ مسکرائی تو علی احمد نے اپنا رومال اس کی چھلکتی آنکھوں پر رکھ دیا۔

علی احمد ولی محمد کے پاس چلا گیا تو سلمیٰ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ننھی کر چار پائی پر لٹا کر لوری دیتے ہوئے وہ خالی خالی آنکھوں سے دیوار کو گھورتی رہی اس کی آواز ٹیری میٹھی اور بڑی سہمی تھی۔ وہ جب کبھی گنگنائی یا ننھی کو لوری دیتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود گیت بن گئی ہے۔ وہ اسی طرح گیت بن کر فضاؤں میں تیرا پھرتی۔ مشروں کے مدوجزر کے سہارے وہ ماضی، حال، مستقبل کے سارے فاضے طے کر لیتی۔ وہ مست ہو کر گنگنائی ریتی اور اس کی گوری آنکھیاں ننھی کے گھنے کالے بالوں میں کھلتی کرتی رہتیں اور اس کے حلق سے نکلتی ہوئی آواز ماضی کے دھندلکوں پر اُجلی اُجلی کر تیں کبھیرے لگتی۔

میری بیبا تو نغموں کی جان ہے۔ اس قدر خوبصورت گلا خوش نصیبوں کا ہی حصہ ہے، میری اچھی بیٹی چلو بھی اس طرح نہیں شرماتے اچھے بچے۔ ہاں ہاں اچھا سا چھوٹا سا بکس لادیں گے، مجھے سب لادیں گے لیکن ہمیں اس طرح شرمائے والے بچے پسند نہیں۔ اب گائے کی میری رانی۔ اچھا بھی نور جہاں کا بدلی والا چاچا، جی ہبی۔ تو کونسی بدلی میں۔

بس ایک اور۔ ایک ہی۔ اب نہیں ستائیں گے تمہیں۔ لٹا کا۔ سلمیٰ نغمت کی شہزادی بنی خاندان بھر میں دھوم مچاتی رہی نغموں کے سہارے اور

نے اپنی امی سے اپنی ضدیں منوائیں۔ چھوٹا سا بکس۔ نئی نئی اوڑھنیاں اور یہ ضدیں چاکلیٹ کے ڈبوں سے لے کر سینٹ کی شیشیوں تک پوری کی گئیں۔ دادی اماں اداس ہوئیں تو چٹا چٹا بلائیں لے کر سلو گوا اپنے پاس ٹھالیا۔ کچھ بھی سنا دے میری اماں بس تو گنگنا دے ذرا اور سلمیٰ نے گنگنا کر دادی اماں کو مامنی کی حسین یادوں کی وادیوں میں پہنچا دیا۔

حقیقتہً ہو رہا ہے۔ ممتاز دلہن کے بچے کا لیکن سب کی نظریں تھیں سلمیٰ بیٹیا پر۔ چچی اماں، چھوچی اماں، بڑی بہنیں سب کی سب پیش بنیاں کر رہی ہیں۔ طرح طرح سے سلو گور جھاڑی ہیں۔ اس محفل میں سلو گائے گی نہیں تو سپر ممتاز کبھی بات نہیں کریں گی اس سے۔ خوشی کی محفلوں میں گانے سے انکار نہیں کرتے بھی۔ بری بات سمجھی جاتی ہے اور سلو کچھ شہر اک کچھ اتر کر گانے لگتی تو سب کے سب اس کو گھیر لیتے۔

سلمیٰ جب اپنی ہم عمر سہیلیوں کی جھوٹ میں ہوتی تو اس کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہونے لگتا۔ کوئی کچھ فرمائش کرتی کوئی کچھ فرمائش کرتی کچھ کہتی۔ وہ سب کی فرمائشیں یکے بعد دیگرے پوری کرتی۔ اپنی ہم جلدیوں میں بیٹھ کر تان اڑاتے ہوئے اس کو محسوس ہوتا کہ وہ بڑی کھلم کھلو ہو گئی ہے اور واقعی کھل کر بے جھجک کھانے کی وجہ سے اس کی آواز میں بڑی خستگی پیدا ہو جاتی۔ اپنے سے بڑوں کے آگے وہ اس طرح اپنے فن کا مظاہرہ نہ کر پاتی۔ جس کا اس کو بعض وقت رنج بھی ہوتا اور وہ گاکھنے کے بعد سوچتی کہ میں نے اتنا اچھا نہیں گایا جتنا اچھا میں گھا سکتی ہوں لیکن اب کی میں بے جھجک گادوں گی۔ اس کی امی کہتیں کہ تم اس طرح ہمیں گاکر سناؤ جس طرح اپنی سہیلیوں میں گاتی ہو تو ہم تمہیں بہت عمدہ سنگار دان لادیں گے بالکل دلہن باجی کے سنگار دان کی طرح۔

آخر ایک دن امی کے اصرار پر ستونے جی کڑا کر کے ایسا کایا کہ دوسرے دن اس کو

سنگار زوال مل گیا۔

ننھی کے کالے کالے بالوں میں انگلیاں پھرتے ہوئے سلمیٰ لنگھ رہی تھی۔

آجاری بندر یا تو آگیاں نہ جا

ننھی کی آنکھیں نیند سے بوجھل پھر رہی تھیں اور سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو
اُتر رہے تھے۔ آج وہ اپنے نغموں کی آگ میں خود جل رہی تھی۔ اور اس کا ذہن آ
کے بچپن کے سہانے ایام کی تصویر کشی میں مصروف تھا۔ وہ سوچ رہی تھی — کیسے
بے فکری کے دن تھے وہ بھی۔ ہر خوشی حاصل تھی، ہر تنہائی تکمیل ہو جاتی تھی۔ ان نغموں
کے سہارے اس نے دلوں کو موہ لیا تھا۔ اس کی آواز کی ننھی نے ساری زندگی کو
نغمہ بنا رکھا تھا۔ کاش میری ننھی بھی ان دنوں ہوتی۔ یوں تو آج بھی میں اپنی آواز سے
سب کو مسحور کر سکتی ہوں۔ خاندان بھر میں آج بھی سب کے دلوں میں میرے لیے اتنا
ہی پیار ہے آج بھی میری امی مجھے چوم چوم لیتی ہیں، آٹھ بھی میکے بابا میری پیشانی پر لسی
طرح بوسہ دیتے ہیں۔ آج بھی مجھے ان سب کا پیار جال ہے لیکن اس کے باوجود آج
زندگی میں کتنی جراحاتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ آج میکے نغمے اپنے بابا اور امی سے ان کی چپتی
ننھی کے لیے اُٹا بھی تو انعام میں حاصل نہیں کر سکتے۔ آج میں کھاتی ہوں تو امی کے کانوں
میں گرے انغموں بچنے لگتا ہے جسے ابانے بڑے چاؤ سے ساڑھ تین سو روپے میں
خریدا تھا۔ اور جو منہ ستر روپے میں ایک پیٹو کے پاس رہیں ہو کر ڈوب گیا —
ان ریکارڈس پر تنہا کتنی چھٹی سوئیاں جن کو بار بار بجا کر میں گیتوں کی لے سے لے ملاؤ
تھی آج خود میکے کچھ کو چھیدی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اور سچ کیا کچھ یاد نہیں آتا۔ زندگی
کا سارا حسن ساری خوبصورتی — کیا اسی لیے آج خود میکے کان میری اپنی
آواز کے لیے تو نہیں ترس رہے ہیں۔

آجاری نندیا تو آکیوں نہ جا
نخی کی خوبصورت آنکھوں میں نندیا چپکے چپکے اس طرح آگئی جس طرح چاند
دبے پاؤں چھوٹی سی بدلی کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور سنی کی آنکھوں سے دو تین چمکداریاں
اس طرح اس کے دامن میں گر کر کہیں غائب ہو گئے جس طرح جگمگ کرنے سے تارے ٹوٹ کر
گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن کہاں گرتے ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

درواہوں ہاتھوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ سچین اور دوشین کی کہنت
چھپ چھپ کر پلک جھپکے تک وہ ایک ہی لمحہ میں پھر اپنے حال سے چٹ گئی۔

یہ کیا ہے سلو۔ علی احمد نے اپنی ہسٹلی موٹی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا
لیکن ان ہاتھوں کا سہارا پا کر سلو کی آنکھوں نے علی احمد کے قدموں پر سارے سوتی
ٹا دیئے۔ اور علی احمد نے پلکوں سے ان موتیوں کو چن کر اپنے دامن دل میں چھپایا۔

جسٹلی کا آئینل اور علی احمد کا گریباں نم ہو چکا تو علی احمد نے تھوڑی کڑکڑاس کا
چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ سلو۔ دیکھو نا۔ بات کس قدر معمولی ہے اور تم کس قدر
جذباتی ہیں مجھے بعض وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی بہت بڑی گیند میں کھڑی ہوئی
مجھے پکار رہی ہو لیکن میں تمہیں جواب دینے کی بجائے تمہاری آواز باز گشت بن گیا
ہوں۔ دو درلوں کا اس قدر ایک ہو جانا کس قدر خوبصورت سا نسخہ ہے۔ تم روتی ہو تو
تمہارے آنسو پونچھ دینے کی بجائے میں تمہارے ساتھ رونے لگتا ہوں۔ اس طرح تو
زندگی زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔

وہ مسکراتے لگا۔ کم سے کم سلی نے تو یہی دیکھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس نے سلی
کی بانہ میں چٹکی جھٹکتے ہوئے کہا۔ لاؤ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔ وہ ترکیب سوچتی ہے کہ
بس طے سمجھو کل سے صاب گریٹ نہیں پیس گے۔ ٹیری پیس گے۔ ٹیری پیس ہوئے انہیں

فراترم آئے گی اس لیے دفتر میں وہ اسموکنگ نہیں کریں گے۔ اسموکنگ کا پروگرام گھر پر ہی ہو گا اور ننھی اٹھا کھائے گی۔

اور آج ننھی نے اٹھا کھایا تھا۔ سلی اسی لیے بہت خوش تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ آج زندگی میں پہلی بار علی احمد کو بٹری پتیا ہوا دیکھ کر بھی اس کے دل پر کچھ نہ گذری۔ علی احمد نے ٹری کا ایک لمبا کٹ کھینچا تو پھر دوسرا کٹ نہ لے سکا۔ سلی سے چھالیہ ٹانگڑا ملا کر منہ میں ڈالتے ہوئے دوسرا کٹ لینے کے لیے جب اس نے بٹری کو باجھوں میں دیا تو سلی نے مسکراتے ہوئے اس کو دیکھا۔ علی احمد جانتا تھا کہ سلی اس سے بھر دی کرے۔ ننھی کے لیے کم سے کم اس کے جذبہ پداری کو سہاڑے لیکن ننھی اٹھا کھانے تھی اور سلی ناپنے اطراف مسرتوں اور خوشیوں کا ایک ایسا جال بن رکھا تھا جس کے غول کو کوئی مادہ، کوئی ساخہ اس وقت نہیں توڑ سکتا۔ علی احمد نے سلی کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ گلستاں بنا ہوا تھا اس کی آنکھیں مسکراتی تھیں اس کے بدن کا روال رزاں جیسے رقصاں تھا۔ آج اس نے نئی دنیا بسا رکھی تھی جہاں اس کو ہر چیز حاصل تھی، جہاں اس کا ہر قدم منزل تھا۔ علی احمد کی نظر برآمدے میں رہنمائی ہوئی ننھی پر بٹری تو اس کو سلی پر بے اختیار پیار آگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سلی کی اس بے پناہ مسرت میں زندگی کے سارے انسانی جذبے شامل ہیں۔ یہ خوشی جان ننھی کے لیے مانتا ہے وہیں اس کے لیے بے اندازہ محبت کا منظر بھی ہے کیوں کہ سلی نے مصیبتوں کو شکست دے کر زندگی سے نباہ کر نیا سکھ لیا ہے۔

اس نے سلی کو چپٹ لگاتے ہوئے کہا کہ سلو متھاری بیٹا نے اٹھا کھایا ہے تو تم سمجھ رہی ہو کہ میڈا پیٹ بھی بھر گیا ہے۔ آج اس قدر خوش ہو کہ ہمارے ناشتے کی بھی منکر نہیں سلی نے بہت محبت سے علی احمد کے پیٹ پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہا کہ آج یہ پیٹ بھی صدف خوشیوں سے بھر گیا ہے، اسی لیے تو تم نے بٹری کو بہت شان سے دانٹوں

میں دبار کھا ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی مرغ مسلم کھا کر بوٹا سا ساگار پیتا ہے۔
اور اب پلاؤ اور مرغ مسلم کھا چکنے کے بعد علی احمد رسوئی کے پاس کھڑا ہوا وال
کے بگھار سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

پلاؤ اور مرغ مسلم کھا چکنے کے بعد میاں علی احمد کے لیے بگھاری ہوئی وال اور
گرم گرم چپاتیوں کے انتظام میں کئی مصروف ہو گئی تھی۔
بی اماں اپنے آخری پیرے میں آخری لوٹک ٹانگ چکی تھیں اور بہت احتیاط سے
ننھی کی گرفت سے سروطہ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

سلی کی زندگی بہتی ہوئی ندی کی طرح شانت تھی۔ ننھی نے بیچ ندی میں کھڑے ہو کر
کچھ ایسا اودھم مچایا تھا کہ اس کے چوٹے چوٹے ہاتھوں ہی سے ساری ندی کی شانتی ڈول
گئی تھی لیکن علی احمد نے ایک چھوٹی سی نانڈی کی نرم موجوں پر مہادی تھی، اور ننھی اس
ناؤ میں بیٹھ کر جمی دھیمی پہننے لگی تھی۔

زندگی کی گاڑی راستے کی نامواری کے سبب ٹھہر گئی تھی۔ لیکن علی احمد نے ذرا
سادھکا دے کر ان راستوں سے گاڑی کو گزار دیا تھا اور اب یہ گاڑی جیسے مانوس راستے
کے چڑے کھلے سینے پر بیٹھتی ہوئی منزل کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

ننھی کو روز ایک انڈال رہا تھا، چار دنوں میں اس نے چار انڈے کھائے تھے۔
پھر دن طلوع ہوا تو دادی اماں کی طبیعت زیادہ ادا اس تھی زیادہ مضمحل تھی۔
رات بھر وہ نیند میں ٹہر جاتی رہی تھیں۔ خدا میرے احمد کو ترقی دے۔ اے معبود تو نے
علم کی دولت سے اس کو سرفراز کیا اب اس کو زندگی کی مسرتوں سے مالا مال کر دے
ننھی پھول بن کر مہکے اور اس کی خوشبو سارے چمن کو معطر کر دے۔ پھر وہ یکایک
کہنے لگیں ”او بہورانی احمد کی دگری کا فریم ٹوٹ گیا تھا نا پھر تم نے بنوایا کیوں نہیں۔“

آج ہی بنو اور بیٹی شگون ٹھیک نہیں۔ اتنا بہت سا علم پڑھ لیا ہے تیرے دولہے نے پگلی بی بی سے پاس کی دہن ہو کر علم کی حفاظت کرنا تو نے نہ سیکھا۔

اری سلو بیٹی یہ تیری ننھی تو لینگڑی کی ٹپی کا سہارا لیے بغیر سچی دو چار قدم چل لیتی ہے لے جی سنبھال اس کو۔ اس نے میری ساری گلو ریاں بکیر دیں۔

سلمیٰ نے بڑی بی بی کے جلنے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اماں ننھی تو آرام کر رہی ہے۔ ڈگری کا فریم تو میں نے قریتے سے بنوایا تھا جس کی آپ تعریف کر چکی ہیں ماتھے پر پسیہ آ رہا ہے۔ اب آپ آرام کیجئے اماں بخدا تر رہا ہے۔“

صبح ہوئی لیکن دادی اماں کا بخار نہ اترا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں میں موسمی کے رس کا گلاس تھا۔ دادی اماں نے نجف آرا میں پوچھا۔ ”ننھی کو انڈا نہیں دے

رہی ہو کیا؟“ سلمیٰ نے دادی اماں کے سوال کو ان سنا کر کے جواب دیا۔ ”اماں آپ شربت پی چکیے نا۔ دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ اور پھر آپ کو زیادہ آرام کرنا سچی تو چاہیے۔“

دادی اماں نے موسمی کا گلاس منہ سے لگایا اسے پی چکیں تو کچھ سوچ کر انھوں نے سلمیٰ کو پکارا۔ ”سلو بیٹی ذرا اس گلاس میں تھوڑا سا پانی لے آنا۔“

پانی کا گلاس ہاتھ میں تھا۔ دادی اماں آنکھیں بند کیے دیر تک کچھ پڑھتی رہیں۔ پڑھ چکیں تو سلمیٰ کو گلاس دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ”گیارہ نام میں

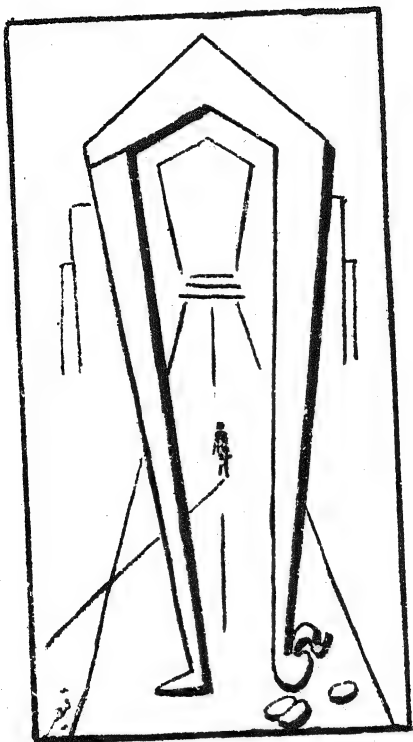
بڑی تاثیر ہوتی ہے بیٹی۔ دم کیا ہوا پانی ننھی کو روز پلایا کرنا۔ انشاء اللہ وہ بہت جلد پاؤں پاؤں چلنے لگے گی۔“

سلمیٰ نے ننھی کو گود میں اٹھا کر گلاس اس کے منہ سے لگانا چاہا تو جلنے کیوں اس کی آنکھیں سبز آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھ سے ایک آنسو

ٹپک کر دم کے ہوئے پانی میں جا چھا۔

ننھی کے ہونٹوں سے لگاتے لگاتے سلمیٰ نے گلاس ہٹا لیا۔ لیکن ٹپکا ہوا
 آنسو دم کیے ہوئے پانی کا جزو بن گیا تھا۔ کوئی سوتی تو تھا نہیں جسے سلمیٰ الگ کر لیتی۔
 اس نے کچھ رک کر گلاس ننھی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو گھنٹ پی کر ننھی نے منہ
 پھیر لیا، اور سورتے ہوئے کہا: ”نندا کاتے، نندا دو۔“





رام دیال نے میڈیکل سٹریٹ کے ساتھ پھر رخصت بیماری میں مزید پندرہ دن توسیع کے لیے درخواست بھیج دی۔ اس کا چھوٹا بھائی سُہما سہما چھونک چھونک کر قدم رکھتا ہوا گزرا منہ صاحب کے اہل اس کی طرف ٹہرھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار بالکل اسی انداز سے وہ آفس آچکا تھا۔ رام دیال کی بیماری کی پرچھائیاں اس کی گھر والی پر اور اس کے چھوٹے بھائی دونوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے دیکھنے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی غذا اور کپڑا بھی رام دیال کی دواؤں اور انجکشنوں کی صورت میں ڈسینسری ہی سے خریدے جاتے تھے۔ وہ جب بھی آتا دزدیدہ نگاہوں سے آفس کلرکوں اور سٹائٹس کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھتا جیسے انہیں یقین دلانا ہوا کہ میرا بھتیجا بہت جلد صحت مند ہو جائے گا۔ وہ موت سے لڑ رہا ہے، اس کی جیت ہوگی، وہ پھر اپنی خدمت پر رجوع ہوگا، اور پہلے سے زیادہ تن دہی سے کام کرے گا، وہ گورنمنٹ کا احسان چکا دے گا، وہ مفت خور نہیں ہے، وہ مرے گا نہیں جناب آپ حضرات اس طرح گھور گھور کر نہ دیکھیں۔

میں نہایت بے چینی سے صیغوں میں اس کی واپسی کا منتظر تھا اس لیے بھی کہ ایک ہفتہ پہلے میں رام دیال سے ہاسپٹل میں مل آیا تھا۔ وہ روہت تھا لیکن طویل بیماری کی وجہ سے اس کا جسم پیلا پڑ گیا تھا اور ثقاہت زیادہ تھی۔ بہت ہی آہستہ سے اس نے کہا تھا کہ کل مجھے یہاں سے DISCHARGE کر دیا جائے گا اور دس دن گھر میں آرام لینے کے بعد گیارہویں دن آفس میں رجوع ہو جاؤں گا۔ کیوں کہ میری رخصت ۳۱ کو ختم ہو رہی ہے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ میں اس طویل بیماری سے تنگ آچکا ہوں۔ سرورپ اور اس کی سببائی نہ ہوتے تو مجھے اپنی زندگی اس قدر عزیز نہ ہوتی۔ زندگی واقعی بہت حسین ہوتی ہے، بہت پیاری ہوتی ہے لیکن تنگدستی میں صحت جواب دے دے اور آدمی اس کی طرف سے ناامید ہو جائے تو کبھی کبھی موت اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ میری زندگی میں ایسے مواقع آچکے ہیں لیکن سرورپ اور اس کی سببائی کے خیال نے مجھے موت سے نبرد آزما رہنے کی شکتی دی اور اب میں اپنے گھر لوٹ جاؤں گا۔ رسوئی گت سے پھر دھواں اٹھے گا۔ بجلی کے سوچے پرچی ہوئی گرد میری انگلیوں کے لمس سے صاف ہو جائے گی اور کٹر کیوں میں سے گزر کر روشنی پھر ٹرک کے کنارے تک پہنچے گی۔ سرورپ کی سببائی کی بدھوتی پھر الگنی پر جھولے گی، اس کے ہاتھ میں پھر سوئی آجائے گی اور میسک کوٹ کے بن پھر مضبوط ہو جائیں گے۔ سرورپ دیال کا نام اس کی کلاس میں پکارا جائے گا تو وہ غیر حاضر نہ رہے گا۔ اس کی نوٹ بکس کے صفحات اس کے فوٹن پن کی تپ کو چومنے کے لیے نہ ترسیں گے۔ اس کی نگاہیں جو مدت سے صفت میرے زرد چہرے پر جمی رہی ہیں پھر ان کتابوں کے سینوں کو گدگدائیں گی میری سائیکل پھر چمک اٹھے گی۔ اس کے پیٹے پھر گھومیں گے۔ میرے دروازے پر پھر تم دستک دو گے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے رام دیال سے وعدہ کیا تھا کہ

اب کی ملاقات اس کے گھر پر ہوگی۔ کیا وہ ابھی ہاسپٹل میں تو نہیں ہے؟ کیا ابھی اس کا رسونی گھر، بجلی کا سوئچ، اس کا کوٹ اس کی سائیکل، اس کے گھر کا دروازہ اس کے منتظر ہیں۔ سرورپ گردن جھکائے اگرزامنر صاحب کے کمرے سے نکلتا ہوا دکھائی دیا تو میں اس کی طرف لپکاتا کہ اس کے صیغہ میں پہنچنے سے پہلے ہی تفصیلات معلوم کر لوں کیوں کہ میرے سوا میرے بعض ساتھی بھی اس کے منتظر تھے اور صیغہ میں داخل ہو کر اس کو حسب معمول یکے بعد دیگرے جوابات دینے ہوتے تھے کہ بھیا اب اچھے ہو رہے ہیں، بھیا اب نسبتاً بہتر ہیں۔

سرورپ دیال چوں کہ زیادہ پریشان تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی سے ملے چلا گیا اور ویسے وہ اس قدر شرمیلا واقع ہوا تھا کہ ہمیشہ ہی اس امر کی کوشش کرتا کہ کم سے کم لوگوں سے ملے اور چلتا بنے۔ وہ دفتر میں داخل ہوتا تو خود کو ایک مجرم محسوس کرنے لگتا۔ اپنے بھیا کی طویل بیماری میں بغیر نوکری کیے ہر ماہ نصف تنخواہ لینے پر شرمندہ سا رہتا۔ سرورپ سے مجھے معلوم ہوا کہ رام دیال کی طبیعت یکایک اس رات خراب ہو گئی جس دن میں اس سے مل کر آیا تھا۔ دوا خانے سے اس کو خارج نہیں کیا گیا، اور آج کے تیسرے روز اس کا آپریشن ہو گا تنخواہ کے لیے میرے نام اُس نے AUTHORITY LETTER دیتے ہوئے کہا تھا کہ بھیا آپ کا بہت انتظار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپ ضرور گھر گئے ہوں گے اور دروازہ مقفل دیکھ کر پریشان ہوئے ہوں گے لیکن دوسرے روز جب آپ ہاسپٹل نہیں آئے تو انہیں یقین ہو گیا کہ آپ گھر نہیں گئے ورنہ آپ ہاسپٹل ضرور آتے۔ کل پہلی ہے، تنخواہ ہمیں کل ہی پہنچا دیجئے۔ میں شدید ضرورت ہے۔ آج اگرزامنر صاحب نے مجھ سے کچھ ترش روئی بُرتی بھیا کی بیماری کی طوالت سے وہ مجھے کچھ نزار سے نظر آئے۔ درخواست میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے کہا کہ آپ ہی اس کو اسسٹنٹ صاحب کے پاس پیش کر دیجئے کیوں کہ اگرزامنر صاحب نے FILE طلب کیا ہے جب میں صیغہ میں واپس پہنچا تو بعض ساتھیوں نے رام دیال

کی ذخیریت پوچھی۔ اکثر نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن سیوانندم آج بھی اپنی بختوں کے ساتھ اپنے ہم عمر چچا سے سسرگوشی کرنے لگا۔ میں نے چھٹی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں مجھ سے ملیں اور جھجک گئیں۔

رام دیال ۳۵، ۳۶ سال کا لم ترنگ آدمی تھا۔ چھوٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں رخساروں کے اوپر ہی حصہ پر دونوں جانب کچھ اوردے اوردے دھبے جو ابھی ہوئی بڑیوں کے ساتھ بالکل نمایاں تھے۔ بے حد زبرد خشک، کٹر مذہبی، اسی لیے دفتر کے بہت کم لوگ اس سے مانوس تھے، اس لیے سبھی کہ اس سے مانوس ہونا بہت مشکل تھا کیوں کہ وہ یہ تو آروند گھوش کی تعلیمات سے متعلق بات چیت کر سکتا تھا یا عہدیداروں کی تجاویز سے متعلق یا پھر ضابطہ ملازمت کی دفعات سے متعلق، اگر آپ اس سے کسی کرنٹ ٹاپک **CURRENT TOPIC** پر گفتگو کرنا چاہتے تو صرف اس کی وہ فائلس جو زیرِ غور رہتی، وہ انھیں سے متعلق گفتگو کر سکتا تھا پھر اس پر طرہ یہ کہ وہ مذاہب پر بات چیت شروع کرے گا تو وفرتیت تک لے جائے گا اور دوسری بات چیت ہوگی تو آروند گھوش کی تعلیمات پر ختم ہوگی اور پھر دوراں گفتگو میں اس کے جلوں میں ربط نہ رہے گا وہ بات کرتا رہے گا اور سوچتا رہے گا اور سوچتے سوچتے خیالات کی رو میں اس طرح بہہ جائے گا کہ زبان اس کا ساتھ دے دے سکے گی۔ قوت اظہار جواب دے دے گی اور وہ کچھ محبوب محبوب سامنے تکنے لگے گا۔ یہاں تک کہ خود آپ کو اس پر نرس آجائے گا اور آپ لقمہ دیں گے کہ ہاں بھی ہم نے آپ کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔ آپ اپنی فرض شناسی کو مذہب کی صحیح تعلیمات کا سبب سمجھتے ہیں جن میں آپ کی انفرادیت کا بھی دخل ہے۔ لیکن یہ انفرادیت بھی مذہب ہی کی روشنی میں پردانِ چرخی ہے۔ وہ بہت غلوں سے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے گا اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ اس طرح آپ کو دیکھے گا جیسے آپ اس کے محسن ہیں کیوں کہ آپ نے اس کی بے ربط باتوں سے

اس کے مقصد کو متعین کر لیا ہے اور وہ صرف اسی لیے آپ سے مرعوب بھی ہو جائے گا کیوں کہ آپ بہت دور رس ہیں اور آپ نے اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اور بھی کئی خصوصیات تھیں اپنے عہدیداروں کی نظروں میں وہ بہت محنتی بہت فرض شناس تھا اور اس کے کام سے سب مطمئن تھے کسی کاروائی میں خود اس کو اختلاف ہوتا تو پھر عام طور پر یہ بات سمجھ لی جاتی تھی کہ اب یہ کاروائی نہیں ہوگی اور اسی لیے سارے دفتر میں یہ کہاوت بن گئی تھی کہ رام دیال کا کاٹنا پانچ نہیں سکتا۔ وہ بہت پابند وقت تھا بقول آفس کے چوکیدار کے کہ رام دیال بالو آئے ہیں تو اس وقت پونے دس بجے ہوں گے۔ آپ کی گھڑی غلط ہے آپ اسے صحیح کر لیجئے اور پھر رام دیال بالو پونے دس بجے اپنی مینز پر ڈٹ جاتے تو پانچ ساڑھے پانچ بجے تک لٹمنے کا نام نہ لیتے۔ مجھے حیرت ہوتی کہ اس آدمی کو نہ بھوک لگتی ہے اور نہ پیشاب ہی آتا ہے۔ مینز پر پہلی ہوتی فائلوں کی ڈھیر کے نیچے وہ مع اپنے مذہب اور اپنی انفرادیت کے سات ساڑھے سات گھنٹے تک دفن رہتا۔ کوئی الجھی ہوتی کاروائی ہوتی تو دفتر کے لوگ اسی سے مشورہ لیتے۔ وہ فون ٹین پن پر کیپ چڑھا کر گردن اٹھاتا اور ٹھوڑی کو منتہی پر رکھ کر گردن کو دائیں بائیں جھکے دیتا اور آپ علانیہ اس کی گردن کی ٹہری کے ٹخنے کی آواز سنتے اور آپ کو یقین ہو جاتا کہ اب وہ آپ کی دشواریوں کو سہل تر کر دے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کاروائی کو سمجھاتے وقت وہ اپنے عہدیداروں کی فطرت سے لے کر ان کی تجاویز کی خامیوں تک ہر چیز پر روشنی ڈالے گا اور پھر اس بات میں مذہب آجائے گا آدمی کی اصلیت آجائے گی، دنیا کی بے ثباتی آجائے گی، روح اور جسم کا رشتہ موضوع بحث بن جائے گا اور کیا عجب کہ اپنے فرائض سے غافل نہ رہنے پر مختصر سی نصیحت بھی آپ کو سننی پڑے۔ اور آپ یہ سب کچھ نہایت سعادت مندی سے برداشت کریں گے کیوں کہ وہ آپ کو کاروائی سمجھانے کے لیے راضی ہو گیا ہے اور آپ جب کاروائی

سمجھ کر اٹھیں گے تو ایک ایک نکتہ آپ پر واضح ہو چکا ہو گا، اور آپ کے نوٹس کی تیاری کے لیے کئی آرٹیکلز آپ کے سامنے ہوں گے جن پر صاف ذکر کے وہ ضابطے کی کتاب آپ کے ہاتھ میں تھا دے گا جب پہلے پہل میرا پائنٹ منٹ ہو اٹھا تب بھی وہ رخصت بیماری پر تھا میں نے اس کے متعلق کچھ اس قسم کی باتیں سنی تھیں کہ وہ عجیب الحلقہ آدمی ہے اور خرابی صحت کی وجہ سے کچھ چڑچڑاپن بھی اس کے مزاج کا جز بن گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ رجوع ہوا تو میں نے اس سے قریب ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی اور چارپایا پنج دن معمولی آداب سلام کے بغیر ہی گزر گئے۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ وہ کس طرح مجھ سے مانوس ہوتا گیا اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے، وہ مجھ سے کچھ متاثر سا نظر آنے لگا جس کی سوائے اس کے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس کی باتیں اخلاق و مروت بلکہ صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ صبر و تحمل سے سن لیا کرتا تھا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی کٹر مذہبیت اس کی خرابی صحت کا رد عمل ہے اور وہ اپنی مغلوچ انفرادیت کا پٹھا ہوا البادہ اوڑھے کبھی کبھی مذہب سے ستیزہ کار رہتا ہے لیکن ہر ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے اور مذہب کی گرفت اس کے دل و دماغ پر زیادہ شدید ہو جاتی ہے، زیادہ دیر پا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ دوزانو ہو کر عہدیداروں کی کج خلقی اور تنگ مزاجی کو بھی کسی مذہبی برگزیدہ شخصیت سے رجوع کر دیتا کہ وہ ان کے دلوں میں رحم و کرم پیدا کر سکتی ہے، انہیں اچھا انسان بنا سکتی ہے، انہیں راہ راست پر لا سکتی ہے۔ اس کو دو چیزوں سے بہت پیار تھا۔ آرونڈ گھوش کی نظموں اور مضامین کے مجموعوں سے اور اپنے فائلز سے۔ پائید سحری آشرم کی مطبوعہ کتابوں کا وہ شدید احترام کرتا تھا اور اپنے فائلز سے اس کو شدید محبت تھی۔ مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہی دونوں چیزیں اس کی شخصیت کی پناہ گاہیں ہیں۔ وہ صرف ان کا احترام نہیں کرتا صرف ان سے پیار نہیں کرتا بلکہ ان میں پناہ لیتا ہے۔ فائلز کو وہ بہت سجا کر رکھتا کیلنڈر کے نمبر کاٹ کاٹ کر

فائلس پرچھپا کر رہا۔ پورے دفتر میں رام دیال کی متعلقہ فائلس آنکھ بند کر کے چن لی جاسکتی تھیں۔ نوٹنگ کچھ اس احتیاط سے کرتا کہ لکھتے وقت ایک لفظ بھی نہ کاٹتا۔ کچھ حذف کرنے کی ضرورت ہوتی تو نہایت چابکدستی سے بربریا بلڈر کے ذریعہ قلم زد فی الفاظ میٹ دیتا اور سچ کاغذ کے اس حصہ پر اس احتیاط سے لکھتا کہ روشنائی نہ پھیلے پاتی۔ فائلس بہت قرینے سے فائل بورڈس میں بندھی ہوئی اس کی الماری میں سچی ریتیں۔ میں نے کبھی اس کو فائل تلاش کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جس فائل کی ضرورت ہوگی وہ فوری رجسٹر کھولے گا نمبر دیکھے گا اور ایک منٹ الماری کے پاس کھڑے رہنے کے بعد دو سال پرانا فائل بھی اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ کو شاید یس کر تعجب ہو گا کہ رام دیال کے خوابوں کی دنیا میں بھی فائل کا دخل تھا۔ میں نے اس ذہنیت کا آدمی نہیں دیکھا۔ اس کے شعور اور تحت الشعور میں بھی اس کے فائلس بس گئے تھے۔ صدر دفتر کی آٹھ پارٹی تفتیح کے لیے آئی تو ایک فائل باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوئی۔ ہم سب کو دیتے ہوئی کہ رام دیال کی متعلقہ فائل اور وقت پر نہ ملے اور سچ ایسی صورت میں جب کہ رام دیال اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اس دن وہ بہت دل گرفتہ رہا۔ صیغہ کی ساری الماریاں چھان ماریں اور کوئی سات بجے شام گھر لوٹا۔ دوسرے دن وہ بہت بے چینی سے اسٹنٹ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو اس نے بہت رازدارانہ انداز سے کہا کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ بہت مسکراتے ہوئے کھویا ہوئے فائل اسٹنٹ صاحب کی الماری کے دوسرے خانے سے نکال کر مجھے دے رہے ہیں۔ آپ نے خواب میں بھی مجھ سے ہمدردی کی ہے اور میرے ساتھ فائل کی تلاش میں اپنا سارا دن خراب کیا ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں سمجھوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا خواب غلط نہ ہوگا۔ رات کو جب آنکھ کھلی ہے تو سچ میں سو نہ سکا۔ جی چاہتا تھا کہ فوری صبح ہو جائے اور میں دفتر پہنچ جاؤں۔ آپ یقین کیجئے کہ رات ہی کو دفتر پہنچ کر اسٹنٹ صاحب کی الماری

اچھی پرچھائیاں جیسار

کھولنا میسے بس میں ہوتا تو میں رات ہی کو اس کام سے نپٹ لیتا۔ لیکن اس قسمتی کو کیا کروں کہ اسٹنٹ صاحب اب تک نہیں آئے ہیں اور دوسری کوئی چابی الماری کو نہیں لگ سکتی مجھے اس بیوقوفی پر ہنسی آنے لگی۔ دفتری کام سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ مضحکہ خیز نہیں تو اذکر کیا ہے۔ اسٹنٹ صاحب کی الماری سے فائل برآمد ہو بھی جائے تو کون سی بڑی بات ہو جائے گی۔ ہمدردی تو رام دیاں سے ہے کہ فائل اس کی زندگی کا ایک جز بن گئی ہیں چیرا سی نے اسٹنٹ صاحب کے آنے کی اطلاع دی تو ہم دونوں الماری کھولنے کی گفت سے ان کے اجلاس پر پہنچے، چابیاں حوالے کرتے ہوئے اسٹنٹ نے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ فائل ان کے پاس نہیں ہے لیکن رام دیاں نے ان کا جلد پورا ہونے سے قبل ہی الماری کھول دی اور منٹ دو منٹ بعد فائل نکال کر اسٹنٹ صاحب کے سامنے رکھ دی وہ کچھ پشیمان سے ہو گئے اور زور سے گھنٹی بجا کر چیرا سی کو مافی اللہ کے لیے کہہ دیا۔ میں چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ ہم کمرے سے باہر نکلے تو رام دیاں کی آنکھیں جھپکی مٹی جیسی تھیں۔ جانے کیوں وہ روٹنے کو تھا اور اپنے تخت الشعور کو بشارت اینر دی سمجھ رہا تھا۔ ایک دن قبل جس فائل کے لیے سارے دفتر میں تہلکہ مچا ہوا تھا وہ آج بغیر کسی جستجو کے رام دیاں کے خواب کی تعبیر بن گئی تو یہ بات سارے دفتر میں گونجنے لگی۔

ایک بار میرا قافلہ ہوجانے کی وجہ سے اس نے رخصت لے رکھی تھی۔ میرا اس زمانے میں اس کے گھر آنا جانا نہ تھا کیوں کہ دوسروں کی طرح خود میسے کے لیے بھی مسئلہ بہت اہم تھا کہ اس سے کس قسم کی باتیں کی جائیں اور اس خیال سے مجھے وحشت ہونے لگتی یہاں تک کہ میں عبادت اور مزاج پر سی کے معمولی فرائض کو بھی نظر انداز کر دیتا۔ باوجودیکہ اس کے اپنے بارے میں میری رائے معلوم کیے بغیر ہی وہ مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔ مجھے

اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا، اپنا دکھ درد مجھ سے بیان کرتا تھا اور کم از کم نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے شہر و مد سے نصیحت کرتا۔ اس نے ایک دن میسر پاس آدمی بھیجا کہ وہ شام کی ٹرین سے پانڈیجری جا رہا ہے، اس لیے میں اسٹیشن پر ضرور ملوں میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی چھوٹنے میں دو چار منٹ باقی تھے میں نے تاخیر سے پہنچنے پر معافی مانگی تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کو میں نے بے وجہ تکلیف دی۔ میری صحت چوں کہ خراب ہے اس لیے میں نے سوچا کہ میرے لیے پہلے کم از کم یہ حسرت تو کھلی ہی جائے کہ میں نے پانڈیجری کے آشرم کی زیارت نہیں کی۔ پتہ نہیں کہ میں واپس آ بھی سکوں گیا یا نہیں، اس لیے آپ سے طے بغیر چلے جانے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ واقعی رام دیال اب واپس نہ آسکے گا اور یہی اس سے آخری ملاقات ہے۔ لیکن رام دیال خلاف توقع واپس آیا اور اپنے ساتھ دو ایسی چیزیں پانڈیجری سے لیتا آیا جو بعد کو اس کی شخصیت کا اہم جز بن گئیں اور آج آپ ان کا تصور کیے بغیر رام دیال کے ہرے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے دل و دماغ تک نہیں پہنچ سکتے اور یہ اہم چیزیں اس کی ڈاڑھی اور زلفیں تھیں۔ البتہ اپنی کھوئی ہوئی صحت اس کو پانڈیجری کے آشرم میں بھی نہ مل سکی تھی، اگلے اخراجات زیادہ ہو گئے تھے اور وہ مقروض ہو گیا تھا۔

رام دیال کے مزاج کا تلون اور بڑھ گیا۔ وہ معمولی سی بات پر بھی الجھ پڑتا۔ پانڈیجری سے لوٹنے کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی بچی کچی ہنسی بھی وہیں چھوڑ دی ہے۔ وہ رام دیال جو عہدیداروں کی ذرا سی خفگی پر دن دن بھر اس ہو جاتا اس میں اس قدر تغیر تو آیا تھا کہ وہ اب ان سے حجت کرتا۔ مجھے افسوس تو اس بات کا تھا کہ یہ حجت کوئی خود اعتمادی کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ یہ ایک ایسا جذبہ تھا جو خود اعتمادی کے چھن جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اس کی خود اعتمادی پر کٹر مذہبیت نے پہرے بٹھا دیئے تھے اور

صحت کی خرابی کی وجہ سے اس نے ہر میرہ بندی کو قبول کر لیا تھا۔ اگر وہ صحت مند ہوتا تو ہو سکتا ہے اس کے نہ ڈارھی ہوتی نہ زلفیں اور نہ وہ دفتر کی سیاست کو کسی اوتار سے رجوع کرتا۔ ایک بار مددگار متعلقہ سے کسی بات پر اس کی ٹھن گئی مددگار صاحب نے رام دیال سے جواب طلب کیا اور تا حکم ثانی دفتر کے کام سے باز رہنے کا حکم صادر فرما دیا۔ یہ رام دیال کی ڈارھی اور زلفوں کا زمانہ تھا۔ اس نے تین دن تک کوئی جواب پیش نہ کیا بلاناغہ حسب معمول وقت پر دفتر آتا۔ اپنی سیلی سی تھیلی میں سے آئینہ نکال کر میر کی ادھ کھلی دراز میں رکھ لیتا اور دو دو تین تین منٹ تک بغیر ہلک جھپکائے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتا رہتا۔ پھر آنکھیں بند کر لیتا اور دو تین منٹ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا۔ پھر آنکھیں کھول دیتا اور اپنے چہرے کو آئینے میں نکلتا۔ لوگ اس کی طشہ اشارہ کرتے، اس پر ہنستے، چہبتیاں کسی جاتیں لیکن یہ سب کچھ بہت آہستہ آہستہ ہوتا اس لیے کہ اگر رام دیال سن پائے تو کوئی نیافتہ جاگ اٹھے۔ دو دن اسی طرح گزر گئے دوسرے سکشن سے لوگ آکر دیکھتے، زیر لب مسکراتے اور دوسرے تماشہ بینوں کے لیے جگہ خالی کر دیتے۔ یہاں تک کہ رام دیال نے اس کے خلاف ہونے والے تبصروں کو تار لیا لیکن کسی سے الجھنے کی اب اس میں ہمت نہ تھی کیوں کہ اگر بات بڑھتی تو یکے دوتہا رام دیال کو پورے دفتر سے مباحثت مول لینی پڑتی جس کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار نہ کر سکا۔ ان دنوں میں بھی اس سے انجان رہا لیکن دوسرے دن دل کڑا کر کے میں نے پوچھ ہی لیا کہ آخر اس آئینہ بینی کا مقصد کیا ہے۔ — رام دیال نے جواب دیا کہ —

”I WANT TO CULTIVATE MY INDIVIDUALITY“ میری سمجھ میں نہ آیا کہ شخصیت اور انفرادیت کی نشو و نما آئینہ بینی سے کس طرح ہوتی ہے اور مددگار نے جو جواب طلب کیا ہے اس پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ بات کو طول دینا میں نے مناسب

نہ سمجھا اور جب ہو کر اپنی مینر پر آکر فائلس پر جھک پڑا۔ تیسرے دن رام دیال آئینے کی بجائے آرونڈ گھوش کی فریم میں جڑی ہوئی کچھوٹی سی تصویر اپنے ساتھ لے آیا۔ اور اگلے دو دنوں کی طرح آئینہ بنی کی بجائے تصویر بنی میں لگا رہا۔ دفتر ختم ہونے سے پہلے مددگار نے ایک دن کی مہلت دیتے ہوئے سختی سے جواب طلب کیا تو رام دیال ... زندگی میں پہلی بار منتظم سے اجازت لے کر وقت سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ چوتھے دن اس کے ساتھ نہ آئینہ تھا نہ آرونڈ گھوش کی تصویر۔ مددگار کے اجلاس پر وہ معذرت نامہ چھوڑ آیا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

آپ کو شاید رام دیال سے ہمدردی نہ ہو لیکن آنتوں کی بیماری کا شکار ہو کر اس نے لمبی رخصت لے لی تو مجھے اس کی جائداد پر منصرمانہ ترقی دے دی گئی کیوں کہ وہ سکند گریڈ ایڈیٹر (AUDITOR) تھا۔ ترقی ملی تو آپ یقین کیجیے مجھے خوشی نہ ہوئی۔ میری دلی تمنا تھی کہ رام دیال صحت پا کر جلد واپس آجائے اور یہیں سے میری ہمدردیاں اس سے وابستہ ہوں۔ وقتاً فوقتاً میں اس کی مزاج پرسی کے لیے جانے لگا۔ جب بھی جانا اس کو یقین دلاتا کہ وہ جلد ہی صحت پا کر لوٹے گا اور اس کی سچی ہوئی ٹیکس زیادہ دن اس کے ہاتھوں کے لمس کی منتظر نہ رہیں گی۔ شروع شروع میں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے میرے غلوں کی صداقت کو سمجھا بھی یا نہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ میری ہمدردی کا معترف ہوتا گیا۔ کسی ساتھی کی طویل رخصت بیماری کے سلسلے میں منصرمانہ ترقی مل جائے تو آپ اس کا اندازہ غالباً نہیں کر سکتے کہ ایسی ترقی سے خوشی نہیں ہوتی بلکہ اس کے دکھ درد کا احساس اور شدید بوجھ جاتا ہے۔ ہر ماہ تنخواہ لیتے وقت مجھے رام دیال بے طرح یاد آتا جو بیماری کی حالت میں نصف تنخواہ پر گذر بسر کر رہا تھا اور اسی ترقی کی وجہ سے میں اس سے زیادہ ملتے رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ انھیں ملاقاتوں سے اس کی زندگی کے بہت سے تاریک گوشوں سے مجھے واقف

ہونے کا موقع ملا۔ عیادت کے وقت اس کے لیے کچھ چھل لے جانا میرے لیے سکون کا باعث ہوتا اور وہ اس معمولی تحفے سے اس قدر ممنون ہوتا کہ مجھے شرمندگی ہوتی کیوں کہ میں اسی کے پیسوں سے اس پر احسان کر رہا تھا لیکن کوئی ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی مجھے اس ذمہ داری سے نجات مل گئی۔ کیوں کہ ایک ساتھی کے دوسرے محکمے میں منتقل ہونے کے سبب سناری کا سہارا ختم ہونے لگا۔ مجھے اس کی جائیداد پر ترقی دے دی گئی اور سیوانندم نے رام دیال کی جگہ منصرمانہ ترقی حاصل کر لی اور اس تاریخ سے وہ کبھی رام دیال کا بھی خواہ نہ رہا۔ یہ اس کی فطری خباثتیں تھیں جو میں نے اپنے کسی دوسرے ساتھی میں نہیں دیکھی۔ لیکن آدورفت کا یہ سلسلہ میں نے اب بھی جاری رکھا۔ اور سیوہ لے جلتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہونے لگی۔

دوسرے دن رام دیال کی تنخواہ لے کر جب میں ہسپتال پہنچا تو اس کی حالت غیر تھی معدہ میں ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے آنتیں سڑ گئی تھیں۔ اس پر غنودگی طاری تھی اور وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں نہ نیگا نگت تھی نہ بیگانگی نہ شکوہ سخاۃ شکایت۔ صرصر کہہ رہی تھی، موت سے چٹکیں تھیں اور کچھ ایسی وحشت تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ آروند گھوش کی تصویر اس کے سر ہانے پڑی تھی جس کو وہ کبھی گھنٹوں گھورا کرتا تھا۔ لیکن آج اس تصویر میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ رام دیال کی آنکھوں سے آنکھیں چا کر سکے۔ اس کی بیوی پائنتی بیٹھی سکیاں لے رہی تھی اور سر روپ مجھ سے نظریں ملنے کے بعد آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ڈاکڑوں سے معلوم ہوا کہ کل گیارہ بجے تک زندگی اور موت کی جنگ کسی قطعی فیصلہ پر پہنچ جائے گی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سیوانندم اپنی ساری خباثتوں کے ساتھ آخری اور بھرپور وار کر رہا ہے اور جیت سیوانندم ہی کی ہوگی۔ میں نے رام دیال کی تنخواہ آہستہ سے جیب سے

نکال کر سروسپ کے ہاتھ میں رکھ دی اور بغیر کچھ کہے سنے واپس لوٹ گیا۔ سروسپ نے
بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

صبح جب میں ہاسٹل پہنچا تو سروسپ مجھے ہاسٹل کے گیٹ سے نکلتا ہوا دکھائی
دیا۔ گیٹ کے پہلو کے ہوٹل کی جانب اس کو جاتا ہوا دیکھ کر میں نے بھی اپنا رخ بدل دیا اور
مجھے یقین ہو گیا کہ رام دیال ابھی زندہ ہے۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے اس کی پشت
پر ہاتھ رکھا تو مجھے دیکھنے بغیر ہی وہ اس انداز سے مجھ سے مخاطب ہوا جیسے جانتا تھا کہ اس
کی پشت پر میسر ہاتھ کے سوا دوسرا ہاتھ رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ اس نے کہا کہ جیتکا
آپریشن رات ہی کو ہو چکا ہے اور وہ ابھی تک بے ہوش ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ
پنج بجائیں گے۔ رات ہی کو آپریشن نہ ہو جاتا تو شاید جیتکا نہ سکتے۔ رات کو جب آر۔ ایم۔ او
نے ان کا معائنہ کیا تو ان کی حالت بہت نازک تھی، اسی وقت سول سرجن صاحب کو فون کیا
گیا، اور مشورہ کے بعد آپ کے رام کو موت کے منہ سے جھین لیا گیا۔ آر۔ ایم۔ او بڑے
اچھے آدمی ہیں اور کل رات بھابی نے ان کے قدم پکڑ لیے تھے۔

لیکن اس کے باوجود کبلی کے سوچ چربی جھونی گزر کسی دوسری ہی انگلی نے صاف
کر دی ہے۔ رسونی گھر سے آج بھی دھواں اٹھتا ہے۔ کٹر کیوں سے گزر کر روشنی ٹھک کے
کنارے تک آج بھی پہنچتی ہے۔ لیکن سروسپ کی بھابی کی دھوتی الگنی پر پھر کبھی نہ جھولی۔
رام دیال کے کوٹ کے ٹخن پھر مضبوط نہ ہو سکے جیب اور کالر پھر نہ سل سکے۔ سروسپ دیال
اپنی کلاس سے آج بھی غیر حاضر ہے اور ہمارے دفتر میں پرومیشنری کر رہا ہے۔ اس کی
نوبیس کے سادہ صفحات اس کی فون ٹین پن کی نوب کو چومنے کے لیے آج بھی ترستے ہیں یا
نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ رام دیال کی سیکل ہم روپے میں ایک بنیے کے پاس رہن ہے
جس پر ماہانہ پانچ روپے کا اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی محبوب اور مقدس کتابیں چوک میں

پُرانی کتابوں کی دکانوں پر آپ کو دستیاب ہو سکتی ہیں جس پر رام دیال نے بہت احتیاط سے اپنا نام لکھا تھا۔ اس کی متعلقہ فائلس، دوسری فائلس کی ڈبیر میں آج بھی ایک ہی نظر میں پہچان لی جاسکتی ہیں۔ سروپ دیال کی بھابی اس آشرم میں فائز کرتی ہے جس آشرم سے چارمیل کا لمبا راستہ طے کر کے سروپ دیال روزانہ دفتر آتا ہے ہمارے دفتر میں ایک اور رام دیال جنم لے رہا ہے جس میں خود اعتمادی ہے اور جو شکست خوردگی کو موت سمجھتا ہے کیونکہ رام دیال مرا نہیں ہے وہ ہاسپٹل میں صحت پا رہا تھا کہ یکا یک رات کو کہیں غائب ہو گیا۔ سنتے ہیں کہ اس نے اینڈیجری کے جنگلوں میں زندگی کے راز کو پایا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رام دیال زندہ نہیں ہے وہ مر چکا ہے اور سروپ دیال مر کر بھی کبھی نہیں مرے گا۔ اس لیے کہ اس نے زندگی کے اس راز کو پایا ہے جس کو رام دیال نہ پاسکا اور پھر ہمارے دفتر میں کتنے ہی سروپ دیال جنم لے چکے ہیں۔

سقا



مجھے یقین ہے کہ اس کا دوسرا پاؤں بھی کٹ جائے گا۔ میں اس دن خوش ہو گیا
یا نہیں قطعی طور پر اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسٹیشن کے
حدود سے لے کر رائل ہوٹل اور اسٹار بار اور دوسری سمت عابدس کو مڑنے والی
شاہراہ کی نکر تک اللہ کی ساری مخلوق سارے بندے حسن منائیں گے۔۔۔۔۔ خوشی کے
مارے ایک دوسرے سے گلے ملتے پھریں گے۔ یہ نہ سوچیں گے کہ کون اجنبی ہے، کون بیگانہ
ہے۔ ایک دوسرے سے اجنبی ہونے کے باوجود، بیگانہ ہونے کے باوجود اس خطرناک وبا
سے، اس خوفناک دشمن سے متحدہ طور پر سب کے سب بیزاریں۔ اس کی حکومت صرف
ان ہی حدود تک محدود ہے جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی مشرق میں اسٹار بار سے مغرب
میں عابدس کو مڑنے والی شاہراہ کی نکر تک۔ شمال میں درگاہ یوسفین سے جنوب میں
رائل ہوٹل تک۔ لیکن اس کی راجدھانی اپلی اسٹیشن ہے۔ ورنہ دوسارے شہر کو اپنے
ایک پیر سے روندنا پھرتا۔ راجدھانی کی اہمیت کے مد نظر قریب قریب ہندوستان بھر کے
باشندے اس کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ آپ دلی سے آرہے ہوں، بمبئی سے

آرہے ہوں، بجوڑے سے آرہے ہوں، آئیں گے تو ناپمیلی اسٹیشن پر ہی۔ بس پلیٹ فارم پر آپ نے قدم رکھا اور آپ اس کی زد میں آئے۔ وہ ترس کھا کر آپ کی طرف نظر نہ اٹھائے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔ اور اگر بجلی کی سی تیز رفتاری سے اس کے ذہن میں یہ خیال آجائے کہ آپ سے ملنا چاہیے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو آپ سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔ اور ہاں ہے سچی تو برا منکسر المزاج۔ ایسی ایسی شاہراہیں، ایسے ایسے ہوٹل، بار، پیروں کی خانقاہیں، ان سب پر حکومت کرنے والا دھڑام سے آپ کے قدموں میں گر جائے گا۔ آپ اچھل پڑیں گے۔ غیر متوقع طور پر آسمان سے کوئی چیز ایک دم آپ کے قدموں میں آگرے تو اس طرح اچھل پڑنا بالکل فطری عمل ہے۔ لیکن عین اس وقت وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے آپ کے پیروں کو پکڑ لے گا۔ آپ یا تو ٹرک پر گر جائیں گے یا بمشکل تمام اپنے بازوؤں کو فضاؤں میں لہرا کر سنبھل جائیں گے۔ اس کا انکسار اور بڑھے گا۔ وہ آپ کے قدموں سے چمٹ کر رہ جائے گا۔ اس طرح کہ آپ ایک قدم نہ بڑھا سکیں گے اور بالکل بے بس ہو کر اپنے اطراف دیکھنے لگیں گے کہ شاید کوئی آپ پر ترس کھائے۔ لیکن آپ یہ سہول گئے ہیں کہ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد جہاں آپ اس کے ہاتھوں میں بے بس ہو گئے ہیں وہ سچی تو وہی علاقہ ہے جہاں اس کی حکمرانی ہے۔ لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ سب اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اطراف بے شمار دکانیں ہیں۔ زیادہ تر پان کی دکانیں اور ہوٹل ہیں۔ پنواری گلو ریاں بناتارہے گا۔ ہوٹلوں کے بیرے آوازیں لگاتے رہیں گے۔ کوئی آپ کی طرف نظر اٹھا کر سچی نہیں دیکھے گا۔ آپ مجبوراً اور بے بس کھڑے کھڑے ہر راہ چلنے والے کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھیں گے، لیکن کب تک دیکھیں گے۔ کچھ سوچ کر اپنی جیب میں اپنی انگلیاں ٹھونس دیں گے۔ حیدرآباد کی پہلی شاہراہ پر ازادانہ چلتے چھٹے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کوئی چمکدار پیسہ کوئی آدھائی آپ کو

سٹرک پر چھینک دینی ہوگی۔ وہ آپ کے قدموں کو چھوڑ کر اس پیسے یا ادھ اتی پر جھپٹے گا اور آپ اپنی پتلون کی کمریں یا پاجامے کا پانچہ، یا دھوتی کا پخلا سرادست کو کے اپنے اس حملہ آور کو نظر بھر کر دیکھنے کے لیے لمٹیں گے تو وہ انتہائی تیز رفتاری سے ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا موٹروں، رکشاؤں اور سیکلوں سے بچ بچ کر سٹرک پر دھنکرتا ہوا نظر آئے گا۔ یا پھر نظر ہی نہ آئے گا۔

میں جس شخص کی باتیں کر رہا ہوں وہ کوئی تیمور لنگ نہیں ہے جو اپنے لاؤشکر کے سہارے حکومت چلاتا ہو۔ گیارہ بارہ سال کا ایک چھیرا سا کھلے رنگ کا لوٹا ہے جس کا ایک پاؤں کٹا ہوا ہے۔ گالوں کے اوپر کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی ہیں اور ہونٹوں کے اوپر یا پیشانی کے نیچے (صحیح مقام انھیں کے درمیان کہیں ہوگا) ناک کچھ اس طرح چکی ہوئی ہے جیسے کوئی سینڈک پاؤں سیمٹ کر جبت کرنے سے پہلے سکر گیا ہو۔ وہ سامنے کھڑا ہو کر ہاتھ پسارے گا تو جانے کیوں یہ احساس ستا رہے گا کہ چٹ سے اب اس کی ناک اپنی ناک پر سوار ہو جائے گی۔ بہر حال اس کی شخصیت میں اس کی کٹی ہوئی ٹانگ اور میڈرک جیسی ناک کا بڑا حصہ ہے۔ اس کے جسم میں معلوم نہیں خون ہے یا نہیں لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی شریانوں میں خون کے بدلے پارہ ہی پارہ دوڑتا ہوگا۔ اس لیے کہ وہ آپ کے آگے کھڑا ہوگا تو اس کی ٹنڈ منڈکھی ہوئی ٹانگ جو قمیص کے دامن کے نیچے چھپی ہوئی ہوگی جھٹ سے دامن ہٹا کر آپ کو دیکھنے لگے گا اور اس سے پہلے کہ آپ اس کو غور سے دیکھیں جھٹ سے دامن کے نیچے چھپ جائے گی اور جب تک آپ دیاسلانی سے اپنا سگریٹ جلا کر میلا کش لیں وہ پھر دامن کے نیچے سے آپ کو تانے لگے گی۔ جلنے کیوں ذہن اس طرح سوچے گا کہ اس کے دامن میں ایک چھپا ہوا خضر ہے جو آہستہ سے آپ کی ایک ٹانگ کو آپ کے دھڑ سے الگ کر دینے کی تاک میں ہے

آپ کچھ اس قسم کی باتیں سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کھڑا کھڑا اچھل پڑے گا اور وہ اس ایک چکر لگا کر زمین پر اپنی ایک ٹانگ ٹکائے بالکل اسی طرح کھڑا ہو جائے گا جیسے پہلے کھڑا تھا ہونٹوں پر میٹنگ رکھے ہوئے ہاتھ پسا رہے دامن کے نیچے خنجر چھپائے۔

بھیک مانگتے ہوئے بے شمار اپاہجوں کو دیکھا ہے۔ میں نے تو وصف دیکھا ہے آپ تو بھیک سمجھی دی ہوگی۔ یا کبھی جیب خالی ہونے پر معذرت بھی کی ہوگی۔ لیکن برہان سے آپ کا سابقہ مہینہ پڑا۔ اس کا رنگ بالکل جدا ہے۔ اس کا ڈھنگ سب سے الگ۔ بھیک دے کر بھی آپ کو اس سے استدعا کرنی پڑے گی کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔ یعنی یہ نہیں کہ مانگنا ہی چھوڑ دے لیکن اس دھڑلے سے نہیں کہ دینے والا کانپ کانپ جائے۔ اس کی گھٹکی بندھ جائے۔

اب آپ ہی انصاف کیجیے۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہوا۔ دور کرنے میں کھڑا ہوا چپ چاپ آپ کو دیکھتا رہے گا۔ آپ سامنے سے گزر جائیں گے۔ آپ کی طرف دھیان ہی نہ دے گا۔ یہاں تک کہ آپ اس کے قریب پہنچتے پہنچتے اس موقع میں نظریں پھیر لیں گے کہ یہ لوٹنا نظر ملتے ہی گلے کا ہار ہو جائے گا لیکن وہ بس سے مس نہ ہوگا۔ آپ اس کی غیر متوقع خاموشی پر کین انکبیوں سے اس کی طرف دیکھیں گے۔ نظریں ملیں گی تو وہ فوری منہ پھیر لے گا۔ آپ نہایت اطمینان سے آگے بڑھ جائیں گے بمشکل دس قدم جاسکیں گے کہ وہ بجلی کی طرح اپنی ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا آپ کو آ لے گا۔ اس طرح کہ آپ محسوس بھی نہ کر پائیں گے کہ کوئی پیچھے سے حملہ کر رہا ہے اور وہ دھڑام سے آپ کے قدموں میں گر کر دونوں ہاتھوں سے سر ختم لے گا۔

بلا سبب آپ بھی گر جائیں گے۔ کوئی ٹینکی آڑے آئے تو ہواؤں میں بازو پھیلا بھاؤ تبا کر سنبھل جائیں گے لیکن اپنی چاروں طرف سے راہ گیروں کو زیر لب مسکراتا

دیکھ کر کچھ خفیف ہوں گے۔ خود بھی کھسیانی ہنسی ہنس دیں گے اور فوراً حجب سے ایک پیسے کی بجائے ایک انی کھال کر چھکیں گے اور اس کے ہاتھ میں تھام دیں گے، اور کچھ ایسا ظاہر کریں گے جیسے اس کی اس حرکت پر آپ نے برا نہیں مانا۔ لیکن سچ پوچھیے تو آپ بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پاسکیں گے اور اپنے دل میں نفرت کا ایک خزانہ چھپائے چکے سے آگے بڑھ جائیں گے۔ برہان کی کینگی پیر دراصل آپ کی شرافت نے فتح پائی ہے، ورنہ ہر شخص بخوڑی اس طرح اس کی خطا خندہ پیشانی سے معاف کر دیتا۔

لیکن باوجود اپنی شرافتوں اور نیکیوں کے آپ سبھی تو آخر آدمی ہیں۔ مہینے دو مہینے میں گاہے ماہے اس راستے سے آپ کو گدونا پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ اب مہینوں آپ اس طعنہ نہیں آئیں گے، اور برہان کی یہ بدتمیزی آپ کے ذہن سے دوسری لمحے محو ہو جائے گی، اور اگر اپنے دفتر کے لیے آپ کو روزہ ہی اس راستے سے گزرنا پڑتا ہے تو دوسرے دن بھی برہان قاطع (اکثر لوگ اس کو اسی نام سے پکارنے لگے ہیں) آپ سے یہی سلوک کرے گا۔ اس کے بعد تو یقیناً ہے آپ گر کشتن روز دوم کے مصداق نہ صرف روز اول ہاتھ سے کل جانے پر افسوس کریں گے بلکہ اپنی برہی کو سبھی نہ چھپا سکیں گے اور کان پکڑ کر برہان قاطع کو اپنے قدموں میں سے اٹھائیں گے اور ایک طمانچہ اس کے گال پر رسید کرنے پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ ایک اور دھول جمائیں گے اور اچھی طرح سمجھا دیں گے کہ آئندہ سے اگر ایسی حرکت کی تو پھر مار مار کر چڑی ادیٹروں گا اور ایک دمڑی نہ دوں گا۔

آپ اس کو مار رہے تھے نا، یقیناً مہینے میرا جی خوش ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو مشورہ دوں آپ اس کو اس طرح ماریں، اس طرح ماریں۔ اس لیے کہ

مجھے اس سے نفتر ہے۔

میں اس بات کا سخت مخالف ہوں کہ ہم جو ترقی پسندی کا لیلل اپنی پیشانیوں پر چھائیاں کیے پھرتے ہیں، سینوں پر لٹکا کر فخر محسوس کرتے ہیں، انسان دوستی پر قلم کھینچتے اور کاغذ کالے کرتے ہیں، ذرا سی مخالفت پر ابھانے تو کیا اپنے جانے پہچانوں کے لیے نفتر اور بغض کا ٹھاٹھ عین مارتا سمندر اپنے تنگ و تاریک سینوں میں چھپا لیتے ہیں۔ کیوں کہ سینے میں دبے ہوئے سمندر کی ساری موجیں بڑی زہریلی ہیں۔ اس لیے جب تھوڑے تیز ہوتا ہے تو آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ چہرے پر سیاہی کھنڈ جاتی ہے اور روح کتنی ہی سیاہ چادروں میں اپنے کو چھپائے عالم نزع میں روشنیوں اور اجالوں سے بیزار نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔ کیا آدمی آدمی کو معاف نہیں کر سکتا؟

لیکن برہان قاطع کے تعلق سے میں خود اس مجرمانہ جذبے کا شکار ہوں۔ گوش کرتا ہوں کہ اس کو معاف کروں۔ بات آئی گئی ہوئی ہے تو سچول بھی جاؤں لیکن صاف اس دن تو بڑی بے عزتی ہوئی ہے نامیری۔ میری بجائے آپ بھی ہوتے تو اپنی انسان دوستی کی ساری قدروں کو برہان قاطع کی ناقدری کے ہاتھوں قتل ہوتا ہوا دیکھ کر فساد برپا کر دیتے۔

میں بنیاد رگہ، یوسفین کے قریبی محلے، آغا پور سے میں شقل ہوا تھا۔ روزانہ شام کو چل قدمی کرتا ہوا راتل ہوٹل پہنچتا۔ دو چار احباب اور جمع ہو جاتے۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک یہیں بیٹھے گپ لڑاتے۔ لیجے میں تو اپنا پردگراں آپ کو سندنے لگا جس کی میاں کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں تو ایک دن جب میں جنگی آفس کے برابر کی سوائے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو پوچھیے مت مجھ پر کیا بیت گئی۔ کتابیں بغل میں دبائے جگالی کرنے کے انداز سے پان چباتے، گنگنائے خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ بس پتہ

نہیں کیا ہو گیا، ایک دم ایک جھکسا لگا۔ دونوں بازو ہوا میں لہرائے جس ہاتھ میں کتابیں تھیں اس ہاتھ نے بڑی محبت سے پاس ہی بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی ایک اینگلو انڈین لڑکی کے سر پر چیت لگا دی اور کتابوں نے اس کے قدموں میں بکھر کر ایک حلقہ بنا بنالیا جیسے اس کو محصور کر لیا ہو۔ اور یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ میں حیران و ششدر کھڑا اس لڑکی کا منہ نکٹا رہ گیا جو قبول صورت تھی جس کو میری کتابوں نے حلقہ بنا کر محصور کر لیا تھا، جس کے سر پر میں نے محبت سے چیت لگا دی تھی جس کا شور ہر برابر کی دکان پر پان خرید رہا تھا۔ جس سے میں انگریزی میں معافی مانگنے کے لیے ذہن میں کوئی اچھا سا جملہ بنا رہا تھا جو اردو کا ترجمہ معلوم نہ ہو۔ لیکن میں ابھی کچھ کہنے ہی نہ پایا تھا کہ اس نے خود گل افشانی کی۔ ”نان سنس، ایڈیٹ، رگدا“

لیجے میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے قدموں میں کتابیں سمیٹ لی تھیں تو اس نے لب نازک کو جنبش دی اور گل ہائے دشنام مجھ پر بھجوا دیے لیکن میں بد نصیب اپنا ذہنی توازن جیسے قریب قریب کھو بیٹھا تھا۔ نزاکت آواز پر سچی تو دھیان نہ دے سکا۔ نہ صرف اس نے مجھے انگریزی میں نوازا بلکہ ”گدا“ کہہ کر اپنی اردو دانی سے بھی مجھے مرعوب کیا۔ میں سمجھ گیا کہ گدا اس نے اس ”بھگت منگے“ لنگڑے لونڈے کو کہا ہے جو میرے قدموں سے چٹا اطمینان سے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے ایک مذک سکون ہوا کہ اس نے ہم دونوں ہی کو قصور وار ٹھہرایا ہے اور اس ٹکڑے گدے کو بھی معاون جرم سمجھا ہے، میں تو مجرم تھا ہی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اس سے انگریزی میں گفتگو کا آغاز کروں لیکن سچا ہوں لوگوں کا جو مرد کی جان کے درپے ہوتے ہیں اور عورت کی ہمدردی میں اپنے باپ داداؤں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ میں تو ٹھٹھا اجنبی راہ گیر جو ان سڑکوں کے لیے سچی ابھی بنایا تھا۔ بے شمار لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ مجھے نصیحتیں نصیحتیں کیں بعضوں نے شرافت کا

اصلی چھٹیاں

برہان قاطع

ثبوت بھی دیا۔ مجھے بے قصہ ٹھہرایا اور اس جھک منگے، ٹکڑے ٹکڑے لوٹے کو برہان بھلا لکھا۔ میری جان میں جان آئی۔ ایک اتنی میں نے کمال کر ٹکڑے پر بھینک دی۔ وہ اب تک میرے قدموں سے چٹا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ ایک اتنی مجھے کچھ اور پہلے ہی بھینک دینی چاہیے تھی۔ لیکن میرا تو ذہن جیسے ماؤنٹ تھا۔ سوچ بچار سے بالکل عارہ اس نے میرے قدم چھوڑ دیئے۔ اٹھا اور ایک اتنی پر بجلی کی طرح گرا۔ میں ابھی اپنی پتلون کی کمرس ہی ٹھیک کر رہا تھا کہ وہ اپنی ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا زمین پر بکھری ہوئی میری ساری کی ساری کتا میں اٹھائے میرے پاس پہنچ گیا۔ مسکراتے ہوئے کتا میں پیش کیں۔ میں نے لے لیں تو اس نے نہایت اطمینان سے ہنستے ہوئے مجھے سلوٹ کیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لوگ آہستہ آہستہ جھٹنے لگے۔ میں نے بھی سوچا کہ اب نکل جانا چاہیے۔ چنانچہ کتا میں بغل میں دبالیے لئے دگ بھر تاکے بڑھا۔ دو چار قدم ہی چل سکا تھا کہ جیسے کسی نے کمان میں چیک سے کہہ دیا۔ اس نے تجھیں گدھا کہا ہے۔ میرے لیے اس وقت سوائے مسکرا دینے کے چارہ ہی نہ تھا۔ فقیر کا غصہ ہی جب فقیر کی جھولی میں رہتا ہے تو میں کس شمار میں۔ میں تو ٹھہرا فقیر گزیدہ۔ خیر صاحب پلٹ کر دیکھنے کی جرات کی کہ کہیں محترم کے شوہر جو اتنے لمبے پورے عرصے میں کہیں غائب تھے۔ پچھا تو نہیں کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خود محترم پچھا کر رہی ہیں۔ اسنوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا، میں ٹھہر گیا۔ قریب آئیں تو مسکرا کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں میرا شکریہ ادا کرنے لگیں۔

”مجھوت شکریہ ہے آپ کا مہتر“

میں سمجھا طنز کر رہی ہیں، اس لیے میں نے کہا۔ ”میدم میں پھر ایک بار معافی چاہتا ہوں۔ اصل میں قصور میرا نہیں بلکہ.....“

میڈم نے بات کاٹ دی۔

”ام کو تم اکسیکوز کرو۔ ام گالی تم کو نہیں دیا۔ ایک کمرنل گوٹمہ امارا پچھا پچھا پڑا۔ ام کو چھڑنا مانگا۔ ام بھوت ڈر گیا مسٹر۔ ام امارسی سے آیا۔ ابھی گاڑی سے اترا۔“

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے رستم کی طاقت مجھے عطا کر دی ہے۔ میں نے بہت بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھا۔ لہجے میں پتہ نہیں تھوڑی سی رعونت کہاں سے آدھکی۔

”آخر تم جانتی کیا ہو؟“۔ نہ میں نے اس کو آپ سے مخاطب کیا نہ اب وہ میڈم رہی۔
”امارا انکل نکل کنٹہ میں رہتا ہے۔ ام کو نکل کنٹہ تک۔۔۔۔۔“

”اچھا اچھا“ میں نے بھی بات کاٹ دی۔

میں نے دیکھا وہ واقعی گہرائی ہوئی تھی۔

پاس ہی کھڑے ہوئے رکشا والے سے میں نے بات کی۔ اس سے پوچھ کر اس کو صحیح پتہ سمجھا دیا اور تاکید بھی کی کہ احتیاط سے لے جا کر انھیں ان کے گھر ہی پر چھوڑ دے ورنہ نئی نوٹلی میں بھٹک جائیں گی۔

بڑی شرافت سے میں نے اپنا فرض ادا کیا اور خوش خوش مڑ کر ایک قدم بھی دجا سکا تھا کہ اس کی چیخ سنائی دی۔

دیکھتا کیا ہوں کہ اس کا ایک پاؤں رکشا میں ہے اور ایک پاؤں سڑک پر ٹکا ہوا ہے جس کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے لنگڑا لوٹا اطمینان سے سڑک پر لیتا ہے اور وہ چیخ رہی ہے۔

میں نے لپک کر اس کو تسلی دی۔ ”گھبراؤ نہیں میڈم، یہ وہ گوٹمہ نہیں ہے جو ناکیور سے تمھارا پچھا کر رہا تھا۔ یہ تو وہی لنگڑا لوٹا ہے۔“

یہ دیکھ کر میرا پارہ بہت چڑھ گیا کہ وہ نہایت اطمینان سے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔

میں نے کان اینٹھ کر اس کو اٹھایا۔ دو ٹاپے رسید کیے، لیکن اس نے اپنی پرس سے اتنی نکال کر جھوٹ سے اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”یہ تم نے کیا کیا میڈم۔ ایک پسینہ بھی نہ دیتا اس پاجی کو۔“
لیکن اس کو میسے ٹاپوں کا کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ اس نے اطمینان سے ہنستے ہوئے میڈم کو سلوٹ کیا اور مجھے خشونت سے گھورتا ہوا اچلا لگا لگا کر فٹ پاتھ سے ٹرک پر آ گیا۔ اور سڑکوں اور رکشاؤں سے بچتا ہوا جیسے ٹرک پر رقص کرنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے پھر میرا شکریہ ادا کیا اور رکشا میں سوار ہونے سے قبل اپنی پرس سے تھوڑی سی ریڑنگاری نکالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔
”ام تھوڑی سیج ہاتھ میں رکھتا۔“

وہ اور زیادہ گھبرائی ہوئی تھی اور بار بار ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کہیں ناگیور سے تعاقب کرنے والا نہ آدھلے۔ میں نے سوچا ذرا کی ذرا اس کا خوف دور کرنا چاہیئے۔ اس لیے اس سے کچھ اس طرح مخاطب ہوا۔
”تم تھوڑی سیج کیوں ہاتھ میں رکھتا؟“

”اوم کو راستے میں مانگنے والا ملے گا تو ام ایٹ لیٹ ون ڈب ان کو دے گا۔
پاؤں پکڑنے کو مت بولے گا۔“

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ”مت بولے گا“ میں نے دہرایا۔
وہ بھی ہنسنے لگی۔

وہ سمجھتی ہوگی کہ یہاں بھیک مانگنے کا طریقہ یہی ہے کہ جھپٹ سے بھکاری پاؤں پکڑ لیتے ہیں پھر سینے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر بھیک لے کر منستے اور سلوٹ کرتے ہیں۔ میں نے بڑے پیار سے اس کی بیٹی پر ہاتھ رکھا۔ اس کو کوئی اعتراض نہ تھا میں نے کہا ”تم اطمینان سے چلی جاؤ اب کوئی بھکاری تم کو نہیں ستائے گا۔ تم پاؤں پکڑنے کو بولے گا تو مجھے نہیں پکڑے گا۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ اس شہر کا یہی دستور ہے کہ بھکاری پاؤں ستھا کر بھیک مانگتا ہے؟“

اس نے حیرت سے پوچھا ”سب پکڑنے کو نہیں مانگے گا؟“ میں نے کہا ”کوئی بھی پکڑنے کو نہیں مانگے گا۔ ادھر آئے گا تو یہ لوٹدے پکڑنے کو مانگے گا۔ یا پھر میں پکڑنے کو مانگے گا۔“

”تم مانگے گا۔“ اس نے پہلے تعجب سے پوچھا پھر بے اختیار ہنسنے لگی۔ ”تم آؤنا امارا نکل کا ہوم۔“

”آؤنا۔“

اچھا بھئی آ جاؤں گا۔ میں نے اس کا ہاتھ ستھا کر اس کو رکشا میں سوار کرایا اور وہ چلی گئی۔

”ہاتھ ہاتھ میں۔ مورے ڈڈاں ڈڈاں، ڈاں۔ سلوٹ صاحب۔“ وہ میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی ناک چٹ سے اچھل کر جیسے میری ناک پر سوار ہونے والی تھی۔ اس کا ہنسنے کا ہوا پاؤں قمیص کے دامن میں سے مجھے تاک رہا تھا۔

”کیا چاہتا ہے۔ لگا دوں کیا ایک دھول۔“

”وہ بی بی جی اچھی تھیں۔“

اُعلیٰ برچھائیاں
برہان قاطع

”بی بی جی“ میں نے دہرایا۔
”وہی صاب“ اور اس نے اپنی انگلیوں میں دبی ہوئی ایک جگر مگر کرتی
چوٹی مجھے دکھلا دی۔

میں سمجھ گیا کہ کھلا ہٹ میں کتنی کی بجائے چوٹی اس نے دے دی تھی۔
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ہاتھ ہاتھیں۔ مورسے ڈڈاں، ڈڈاں۔
سامنے ٹرک پر مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی، اور وہ اپنی ایک ٹانگ پر اُچھلنا
ہوا اچھلا وہ بن چکا تھا۔

دوسرے دن میں رائل کی طرف نہ جاسکا تیسرے دن شام کو دکان پر کھڑا ہوا
پان بنوار ہاتھ کہ برہان آدھمکا۔

”کل آئے ہیں آپ۔ ادھر بی بی جی کی طرف رہ گئے ہوں گے؟“

”بی بی جی کی طرف؟“ میرا ذہن فوری منتقل نہ ہوا۔

”وہی صاب، اپنی گوری گوری میڈم چوٹی والی“

”اچھا جی! اب مجھے یہی کام رہ گیا ہے کہ جس میڈم سے تم کو چوٹی مل جائے اس
کی خیریت سے تمہیں آگاہ کرتا رہوں۔“

برہان قاطع نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے میں اس سے علانیہ جھوٹ بول رہا
ہوں، اور بڑے معنی خیز انداز میں سکرا نے لگا۔

میں نے اس کی سکاوت کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تم نے پرسوں اس سے بھی وہی ذلیل حرکت کی! مہیک مانگنے کا یہ نیا ڈھنگ
تم نے کیوں اختیار کیا ہے؟“

وہ کھڑا سکراتا رہا اور میرے سوال کے جواب میں ایک ہاتھ سے قمیص کا دامن

اٹھا کر اپنا تنکا پیٹ بیچا نے لگا۔

میں نے لہجے میں تھوڑی سی برہمی کو شامل کرتے ہوئے کہا۔

”پھر مجھ سے بد معاشی کی بات کرتا ہے، میں تجھ سے بھیک نہ مانگنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ لیکن شریف لوگوں کو بیچ سڑک پر اس طرح رسوا کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی؟“

”سید سے مانگنے پر لوگ پسینے دیتے بابو جی،“

”پیر کپڑے لینے سے دے دیتے ہیں؟“

”ہاں! پر میں سب کے پیر نہیں کچڑتا بابو۔“

”کیوں؟“

”سب اچھے دل کے نہیں ہوتے بابو۔“

”اچھا۔ تو جانتا ہے کہ سڑک پر اتنے تمام چلنے والوں میں کون اچھے دل کا

ہے کون بُرا؟“

”ہاں صورت دیکھ کر کچھ کچھ تو جان لیتا ہوں۔“

میں نے مونچھوں پر تاؤ دیتے، پاس سے گزرتے ہوئے ایک پہلوان کی طفر

اشارہ کیا جس کا سر گٹھا ہوا تھا جس کے گلے میں تعویذ تھا اور جو مہین سے کرتے ہیں سے

اپنے چوڑے چکے سینے کی سنایش زیادہ کر رہا تھا اور سڑک چرل کم رہا تھا۔

”پکڑ لے نا اس کے پاؤں۔ تب جانوں۔“

وہ اس کو گھورنے لگا۔

میں نے ڈرایا۔ ”دیکھو کیا رہا ہے، مارے ٹھوکرؤں کے دم لے لے گا تیرا۔“

میں بس اتنا کہہ پایا تھا کہ وہ ایک ٹانگ پر جھلکتا ہوا جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا

اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قیصر پہنچ کر دھڑام سے اس کے قدموں میں گر کے اس سے

چمٹ گیا۔ پہلوان ایک دم اچھل پڑا تو برہان قاطع کا سر اور دھڑ بھی ٹھک سے کچھ اوپر اٹھتا ہوا سا محسوس ہوا۔ یعنی جھارت کر کے اچھلنے وقت بھی اس کے قدم اس نے ستھام رکھے تھے۔ میری جیت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پہلوان نے جیب سے کچھ نکالا اس کے ہاتھ میں تنھاتے ہوئے جھک کر اس کو اٹھایا۔ اس کے سلوٹ کرنے پر پیٹھ ٹھوک کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

پنواڑی بھی میری اور برہان قاطع کی باتیں سن چکا تھا اس لیے وہ بھی کسی غیر متوقع حادثے کا منتظر تھا۔ وہ ہنستا ہوا کہنے لگا۔

”مار دیا بازی۔ بڑا حراف ہے صاحب یہ حرامی۔“

میں نے پنواڑی سے پوچھا ”لوڈ اس سے واقف تو نہیں ہے؟“

گوہران پنواڑی نے یقین دلایا کہ وہ اس کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

میں نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر دھوئیں کی ایک چادر ہوا میں پھینک دی،

اور اس کی اوٹ میں اپنی آنکھوں کو چھپا لیا۔ ابھی یہ چادر پوری طرح میری آنکھوں کے آگے سے ہٹنے لگی نہ پانی تنگی کہ برہان سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میں نے ہاتھ ہوا میں ہلا کر دھوئیں کی چادر کے ٹکڑے کر دیئے تو اس کے کھلے ہوئے ہاتھ پر ایک آنہ اور ایک ادھاتی چمک رہی تھی۔

”تو کب سے جانتا ہے اس کو؟“

”بس ابھی سے۔ جب سے آپ جانتے ہیں۔“

”پھر!“

”پھر کیا باوجہ؟“

میں کچھ بول کھلا گیا۔ اور اس کیفیت کو چھپانے کے لیے میں صرف غصے ہی کا

سہارا لے سکتا تھا۔

”ابے جھوٹ کیوں بولتا ہے پاجی!“
”جھوٹ نہیں بولتا بابو جی۔ اللہ قسم جھوٹ نہیں۔“

”بھڑا“

”بھڑکیا؟“

”ابے ڈر نہیں لگا تجھے اس کے پیر کھڑتے ہوئے۔“

”بالکل نہیں لگا ڈر۔“

”کیوں؟“

”بابو جی وہ تو مونچھیں مروڑ رہا تھا۔ سینہ تان کر چل رہا تھا۔ اس کو اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ ہے نا۔ بس۔“

وہ رک گیا اور اس کی ناک جیسے چٹ سے اچھل کر میری ناک پر سواری کرنے کی تیاری میں تھی۔

”تو صاف صاف کیوں نہیں کہتا۔“

”بس۔ بول دیا نا۔ ایسا آدمی کبھی کسی بچے کو اور مجھ جیسے لنگڑے کو مار نہیں سکتا بابو جی۔“

میں نے ایک اور دھڑکی کی چادر مہو میں پھینک دی اور اپنا چہرہ چھپا لیا۔ چادر ہٹی تو وہ سڑک پر قرض کرتا ہوا سڑک کو غبور کر رہا تھا۔

میں حسب معمول رائل ہوٹل پہنچا تو خلاف توقع آج میسر سائیکلوں میں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ بے دلی سے کچھ دیر بیٹھا رہا۔ چائے پی۔ سگریٹ کا سیکٹ نکالا تو وہ خالی تھا۔ سوچا کہ اب واپس ہی کیوں نہ لوٹ جاؤں۔ گیٹ پر آیا تو

سامنے مجمع تنہا۔ سگریٹ کا پیکٹ خریدا اور سگریٹ جلا کر اپنی راہ لی۔ مجمع کے قریب پہنچا تو حسب توقع نہ وہاں کوئی نداری تھا، نہ مسمریزم کرنے والا اور نہ کوئی دوائی بیچنے والا۔ دو آدمی جھگڑ رہے تھے۔ سارا مجمع جیسے جھگڑا چکا رہا تھا۔ حالانکہ سب کے سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں بھی مجمع میں شامل ہو گیا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے دو واہ صاحب واہ، آپ تو تعلیم یافتہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔
 ”و تو حضرات سٹروں پر منہ کے بل گر کر خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے تعلیم نہیں پائی ہیں؟“
 کسی دوسرے نے کہا۔

”ٹھیک ہے مولانا۔ پردہ کوئی آپ کے بازو برابر کا آدمی تو نہیں ہے۔ ذلیل سی کینہ اور سفلہ سی، اچانچ ہے، اور پھر ٹانگ برابر کا لونڈا ہی تو ہے۔“
 کسی تیسرے نے کہا۔

”ہاں جی گوشمالی کی ہوتی۔ چائٹا رسید کیا ہوتا۔ دھپیا دیتے۔ لیکن اس طرح تو بڑناٹا رمار کر بھوکس تھوڑی نکال دیتے ہیں۔ خوب تسلیم پانی صاحب خوب شرافت دکھائی۔“

”اجی بڑے آئے حمایت کرنے والے، گھر لے جا کر پرورش کیجیے۔ آل اولاد نہیں ہے تو فرزند ہی میں قبول کیجیے۔ میں نے جو کیا درست ہی کیا۔“
 اور کسی کرخت آواز کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔

”کون ہے رہے سالے جٹل ٹٹل۔ کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے! — ذرا میں بھی تو دیکھوں — بیٹے اپنی صورت بھول جاؤ گے۔ جرو اسالی پہچان نہ سکے گی۔“
 اور منجلے میاں پرلنے ٹائروں کی دکان سے چھلانگ لگا کر مجمع کو چرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا تھا۔ چھلانگ لگانے سے قبل اپنے ہتھ کی گانٹھ اس

برہان قاطع

اجلی پر چھایاں

نے مضبوط کر لی تھی اس کے بعد میں مجمع میں آگے نہ بڑھ سکا، اور خیریت اسی میں معلوم ہوئی کہ دور سے نظارہ کروں۔ اور عواقب کو پیش نظر رکھوں۔ میں دس قدم پیچھے ہٹ کر فٹ پاتھ پر آ گیا۔

منجلی میاں کی آواز مسلسل آرہی تھی: ”مولوی صاحب آپ کے پیر کڑیاہوں آپ بیچ میں نہ آئیں بس ایک ہاتھ دکھا دوں سالے کو۔ دوسرا ہاتھ لگاؤں تو جیل کووں کی نسل چھکلی کی اولاد“
بیسویں آوازیں مل گئیں۔

”منہیں بھی نہیں“

”جہانے بھی دو منجلی میاں“

کسی نے مخالفت کی۔

”جہانے کیوں دیں، مولوی صاحب سے بدزبانی کر رہا تھا۔ جہادے بڑے

بھائی ایک پرائے ٹائٹل کا ہاتھ“

شاید وہ پکار رہا تھا۔ ”ارے میری مائی تو چھوڑ دے شیطان“

دوچار پولیس کے جوان بھاگے آئے۔ لوگ چھٹنے لگے۔ کچھ نیٹیوں نے پولیس کی

جگہ لی لیکن فوری ادھر ادھر ہو گئے۔ چھٹتے چھٹتے جمع چھٹ گیا۔ منجلی میاں بڑبڑاتا ہوا

اپنی دکان میں گھس گیا۔

بانی ٹنڈا ٹائی والا جنٹلمین مجھے نظر نہ آیا۔

میں اطمینان کا سانس لے کر قریب پہنچا تو سعید یہ ہٹل کی سٹریٹیوں پر برہان

قاطع اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ آس پاس کے دکان والے رکشہ والے اس

سے ہمدردی کر رہے تھے۔

اس کی ناک پر خراشیں تھیں اور مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا
سایندک پیر تلے آکر دب گیا ہے جس کو اٹھا کر برہان نے اپنی پیشانی کے نیچے جھالیا ہے
اور جو ذرا سے دھکے سے گر جائے گا۔ لیکن اس کو اس سیندک کی پروا نہ تھی۔ وہ رہ
رہ کر اپنی پسلیوں کو اور کمر کو دبا رہا تھا۔

”آوارہ“ کے راجپور کی طرح اونچی تلون پہنے، دیب کمار کی طرح بال جھائے
نیل کی شیشیوں کا اسٹینڈ ہاتھ میں سقلمے ایک نیل مالش والا ٹنڈا برہان قاطع کی طرف
بڑھا پڑنے یار کی طرح اس کی پیٹھ ٹھونکی، سر پر ایک چپت لگا کر کہا ”چل پہلو ان
ٹھوک بجا کر مچھل کے لیے تیار کروں تجھے“

برہان قاطع سیڑھیوں پر دراز ہو گیا تھا اور مالش کر داتے ہوئے عجیب
عجیب صوتیں بناتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”اللہ قسم بوٹی بوٹی الگ کر دی۔ ذرا آہستہ ہاتھ دھرنا راجہ بھائی“ اور
راجہ بھائی اس کی کچھ سنے بغیر ہاتھ پر ہاتھ دھر رہا تھا۔ برہان بعض وقت منہ بناتا۔ بعض
وقت کراہتا۔ بعض وقت ”مر گیا باپ“ کہہ کر اٹھ بیٹھنے کی کوشش کرتا۔ ”ہے ہے نہیں سمجھنا
تھا باپ اتنا مارے گا۔ راجہ بھتیہ مر گیا۔ ذرا ہاتھ روک لے باپ“

راجہ بھتیہ نے کھلے کی انگلی سے پیشانی کے پسینے کی بوندیں پونچھ کر پسینہ ٹپکاتے
ہوئے برہان قاطع کو دیکھا تو وہ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہاں شاباش۔ چل۔ چ۔ ا۔ ل۔ کھڑا ہو جا۔

اور بدقت تمام برہان قاطع کھڑا ہو سکا۔

مجھ سے نظریں ملیں تو سلوٹ مار کر مسکرانے لگا۔

میں نے پوچھا ”کیسے چوٹ آئی ماہر نفسیات؟“

وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

میں نے وضاحت کی کہ ”تم نے غلط آدمی کے پاؤں کیسے ستھام لیے۔ چہرہ دیکھ کر نہ پہچان سکے کچھ؟“

”بالکل نہیں پہچانا بابو جی، پاؤں کیٹیں حرامی کے۔ اللہ قسم کیا ٹھوکر ایں لگا یا ہے۔“
”وہ تم ان حرکتوں سے باز کیوں نہیں آتے، چھوڑ کیوں نہیں دیتے اس طرح مانگنا۔“
”پھر کس طرح مانگوں بابو جی؟“

”جیسے سب مانگتے ہیں!“

”نہیں دیتا بابو جی کوئی۔ اللہ قسم۔“

”دے گا جی۔ نہیں کیوں دے گا۔ سب کو آخر دیتا ہی ہے۔“

”آج سے چھوڑ دوں گا بابو۔“

”ہاں۔ شریفوں کی طرح مانگا کرو۔ تمہیں پتہ ہے لوگ تمہیں برہان قاطع پکارنے لگے ہیں؟“

”ہو بابو جی۔۔۔ کیوں پکارتے ہیں؟ بس ایک بار مولوی صاحب بولے اور سب پکارنے لگے۔“

”اس لیے کہ تم راہ چلتوں کو لوٹتے ہو۔“

”نہیں جھوٹ بات، میں کاں لوٹتا ہوں۔“

وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا۔

دوسرے دن سے اس نے اس طرح مانگنا ترک کر دیا۔ روز ہی شام کو رائیل ہو جاتے وقت پنواڑی کی دکان پر اس سے ملاقات ہوتی۔ سلوٹ کر کے چپ چاپ کھڑا ہو جاتا۔ میں دوپیسے اس کے ہاتھ پر رکھ کر بادل ناخواستہ مسکراتا تو جواب

میں اس کی مسکراہٹ سے محروم رہتا۔

تین دن اسی طرح گزر گئے۔ گوجران پنواری نے کہا ”اس دن سے بڑا شریف ہو گیا ہے لہذا کسی کو نہیں چھیڑتا۔“ اس دن جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا صاب۔ اس لڑے کو جو روت تھی اسی بات کی۔

چوتھے دن پنواری کی دکان پر وہ مجھ سے نہیں ملا۔ میں نے پوچھا ”گوجران کیا بات ہے، آج برہان نہیں آیا؟“

”جو رو آیا ہے۔ ابھی ابھی تھا۔ وہ ٹھیک نہیں ہونے کا صاب۔ پھر وہی کرنے

لگا پاجی۔“

میں نے لوگ سچینک کر گھوری منہ میں رکھ لی۔ کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ برہان قاطع دکھائی دیا۔ سر اُٹے کی دیوار کے پاس کونے میں کھڑا وہ موت رہا تھا۔ مجھ سے نظریں ملیں تو اس نے نظریں پھیر لیں۔ میں سمجھ گیا وہ مجھے چکر دے کر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں جب وہیں ٹھہر گیا تو وہ مجبوراً میری طرف بڑھا۔

”تم نے پھر۔۔۔!“

اور اس نے جملہ پورا ہونے سے قبل ہی اعتراف کیا۔

”نیں کرتا تھا بابو جی۔ پر کیا کروں۔ دن میں ایک ٹیم سبھی بھر پیٹ نہ کھا سکا۔“

کل تو صف بچھائوں پر رہ گیا۔ اللہ قسم بابو جی آج پیٹ بھر کھایا ہوں۔“

میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا، اور پھر کہتا سبھی تو کیا کہتا۔ چپ چاپ آگے بڑھنے لگا تو اس نے خود پوچھا ”خفا ہو بابو جی“ اس کی آواز رندہ لگی تھی۔ مجھے اچنبھا ہوا۔ برہان کبھی روہی نہیں سکتا اس کو میں نے بری طرح پٹتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت سبھی وہ مسکرا رہا تھا۔ لوٹتا ہے برازمین کوئی چال تو نہیں چل رہا ہے؟

میں نے کمن اکھیوں سے اس کو دیکھا تو واقعی اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں
میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھایا تو برہان میرے قریب آگیا۔ کہنے لگا۔

”بابو جی، تین دن سے فاقہ کر کے آج میری ماں پڑوس میں آٹا قرض مانگنے چھوٹے
ٹیکسی ڈرائیور ہے نا، اس کے گھر گئی تھی۔ سالے کی جروا گھر پر نہیں تھی۔ ماں کو بہن بہن
پکارتا تھا۔ تین دن فاقوں کا حال سن کر یاں کہا ہاتھ کپڑا بنا کر اُجلی پر چھائی۔“

اس نے کچھ رک کر پھر کہا۔

”میری ماں بڑی بہادر ہے۔ دو جھانڈ میں ٹھیک کر دیا بیٹا کو۔“

اس کی آنکھوں میں اب بھی باقی نہ تھی۔ شاید ماں کی بہادری پر وہ فاختانہ
طور پر مسکرا رہی تھیں جو ان میں چمک سی محسوس ہو رہی تھی۔

میں سوچنے لگا برہان قابلِ فخر ہے یا نہیں۔ میں نے اس سے زیادتی کی
ہے۔ پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ اس کی رگوں میں پارہ نہیں انسانِ خون دوڑ رہا ہے۔
یہ ایک وہ لمحہ ہے کہ کہنے لگا۔

”ٹوٹا صاحب بول رہے تھے کہ ماں کا کسی سے نکاح کرادوں وہ بڑی اچھی ہے
میری ماں معلوم نہیں ہوتی بابو جی۔۔۔ وہ اتنی خوبصورت ہے مگر۔۔۔ اور برہان جملہ
پورا کیے بغیر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اس کے بعد برہان سے اپنا رویہ بدل دیا۔ انسانیت کے کتنے مستحسن
پہلو اس ہمدردانہ جذبے میں پنہاں تھے اس کا مجھے کچھ علم نہیں اس لیے کہ میں نے شعوری
اور غیر شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی کہ وہ نہتہ جبر برہان کے تعلق سے اپنی مضبوط
جڑیں میرے ذہن میں پیوست کر رہی ہے اس کو اپنے دل و دماغ سے اکیڑھ سینکڑوں۔

لیکن میں آج سچی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ گوجران پٹواری کی دکان پر گھوڑی سے لونگ نکال کر جب میں گھوڑی منہ میں رکھتا ہوں اور دیاسلانی سے سگریٹ جلا کر دھوئیں کی چادر ہوا میں پھینک دیتا ہوں تو ایک لنگڑا لوند جس کے جسم میں انسانی خون نہیں پارہ ہے، موٹروں اور رکشاؤں سے بچتا ہوا سڑک پر قرض کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو سوائے میسے ہر راہ گیر کا پاؤں پکڑ لیتا ہے۔

رفتہ رفتہ میرے لیے اس کی ان حرکتوں میں کوئی نیا پن نہیں رہا جس طرح دوسرے لوگ اس کی حرکات سے مانوس ہو گئے تھے۔ میں بھی اس کو اسی طرح دیکھ کر گذر جاتا جیسے سگریٹ کاکش لگا رہا ہوں یا پان کی پیک سڑک پر تھوک رہا ہوں۔ لیکن ایک دن اس نے پھر مجھے جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

آفس جاتے ہوئے میں نے گوجران پٹواری کی دکان پر رک کر حسب معمول پان لینا چاہا تو وہ دکان کے پٹ بیٹر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر سچی گوجران نے پان بنانے کی زحمت نہ کی تو میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے گوجران؟“

وہ بہت دکھی تھا۔ اس نے کہا۔

”وہ آپ کو معلوم نہیں صاحب؟ اپنے برہان نے مولوی صاحب کو فخر کی نماز پڑھتے وقت چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔“

”برہان نے؟!۔۔۔“ مجھے یہ بات کچھ ناممکن سی معلوم ہوئی۔

میری حیرانی دیکھ کر گوجران کہنے لگا۔ وہ مولوی صاحب تھے نا۔ برہان کی ماں سے ان کے تعلقات تھے۔ وہ ہمیشہ اس کی ماں سے وعدہ کرتے کہ اس سے نکاح کر لیں گے

لیکن سنا ہے کہ پیسوں وہ صاف انکار کر گئے۔

میں جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

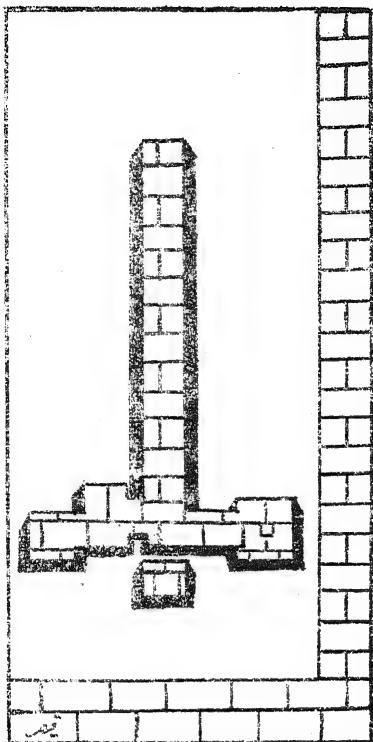
گو جبران دکان بند کر کے جانے لگا تو میں نے پوچھا ”کیا آج دکان بند کر دو گے؟“

گو جبران نے خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج کام میں کچھ جی نہیں لگ رہا ہے صاب! برہان بہت یاد آ رہا ہے۔“

جانے کیوں میرے قدم سچی دفتر کی جانب نہ بڑھ سکے اور میں گھر لوٹ آیا!





فانوس بچھ گئے۔ قمقمے گل ہو گئے۔ لیکن نواب کبیر سین خاں برآمدے میں
ٹہلے ہی رہے۔

آرام گاہ میں داخل ہوئے بڑے نواب صاحب کو پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے۔
گلابدن بوا پلنگ پوش کی سلوٹیں صاف کرتی ذرا کی ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے
آدھا جسم زمین پر اور آدھا جسم پلنگ پر پھینک کر بس دو چار بار پلکیں جھپکا سکیں اور
پھر جیسے فرشتوں نے انہیں آہستہ آہستہ زمین سے اوپر اٹھالیا۔ انہیں اپنے ٹوٹے ہوئے
بدن کی کچھ سدھ بدھ نہیں رہی۔ نواب صاحب خواب گاہ میں داخل ہوئے تو
انہیں گلابدن بوا کی جبارت پر بے اختیار پیار آ گیا۔ آنکھ کھلی تو گلابدن بوا نے دیکھا
کہ فرشتوں نے انہیں نواب صاحب کی گود میں پھینک دیا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ
جس کا نمک رگ رگ میں ہو اس کی ہو رہنا سچی تو نمک حلائی ہے۔ اور صبح ہوتے
ہوتے گلابدن بوا، گلابدن بیگم بن گئیں۔

سرفراز علی بے چارہ اڈیلیوں کا صدر تھا۔ یہ اعزاز نواب صاحب نے دیا تھا

نواب صاحب کے ایک موٹھی دشمن نے جب ان پر حملہ کیا تھا تو سرفراز علی نے ہی اپنی جان پر کھیل کر نواب صاحب کو بچا یا تھا۔ نواب صاحب بھی جو ہر کے قدر داں تھے۔ نوازا اور دل کھول کر نوازا۔ انعام اکرام تو روزمرہ کی بات تھی۔ پھر ساری دیوڑھی سرفراز میاں، سرفراز نیاں کہہ کر منہ سکھاتی تھی۔ لوگ نواب صاحب سے نظریں چار نہ کر سکتے تھے اور سرفراز علی کی نظروں کو تکتے تھے۔ سرفراز علی مہربان ہو جاتے تو نواب صاحب کی مہربانیاں بھی شامل حال رہتی۔ زمین بوس ہو کر فرشی سلام کرنے والوں کی جانب نواب صاحب کی نظر اٹھ جاتی تو گویا سلام قبول ہو جاتا۔ لیکن سرفراز نیاں کی بات الگ تھی۔ نواب صاحب سے راز دار نہ بنتیں ہوتیں۔ لوگ محسوس کرتے کہ معمولاً شاہ کے پرکتر رہا ہے۔ لیکن جب گلبدن بوا، گلبدن بیگم بن گئیں تو ساری دیوڑھی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

گلبدن بوا، سرفراز علی کی بیاتہا بیوی تھیں اور سرفراز میاں لوگ کہتے ہیں کہ بوا پر جان چھڑکتے تھے۔ بوا بھی سرفراز علی کو اپنے سر کی قسمیں دیتی رہتی کہ نواب صاحب کے لیے مال فراہم کرنے کرتے کہیں خود کسی کے نہ ہو رہنا۔ اور سرفراز علی کسی کے نہ ہوئے۔ بھرے بازار سے اٹھا کر انھوں نے نواب صاحب کی خلوت میں بیٹھ کر کو داخل کیا اور پھر اس تاریخ سے ان کو اپنی مالکن سمجھا اور پھر ان کی تعظیم و تکریم کی۔ ایک قصہ تو اس طرح بھی مشہور تھا کہ نواب سکندر حسین خاں کی والدہ کو سرفراز علی نے لائیں مار کر ٹرین کے وینس وکیل دیا نواب صاحب جب اپنی جاگیر گئے تھے تو ان کی نظر ایک لڑکی پر پڑ گئی۔ یہ نواب صاحب کے بہار کے دن تھے۔ بس حکم ہوا کہ محل میں داخل کر دی جائے۔ لڑکی کے ماں باپ اگر راضی نہ ہوں تو انھیں تین دلا یا جائے کہ ہم لڑکی سے

با ضابطہ عقد شہری کریں گے۔

لڑکی والے نہ مانے۔ بیکر ملک کر بے زبان گائے کو اسٹیشن تک لایا گیا۔ ٹرین چھوٹے ہی کو تھی۔ بیچاری نے سوار ہونے میں پس و پیش کیا۔ سرفراز علی نے کچھ کر دیا اس کی چوڑیوں پر جڑیں اور بڑھتی ہوئی ٹرین میں ڈھکیل دیا۔ دو سہ دن دیور تھی میں جب وہ پائداں کو لے مسند پر بیٹھی تھیں تو سرفراز علی نے سر وقدر ہو کر نیم کو سلام کیا اور ہاتھ باندھے اس طرح کھڑے ہو گئے کہ آنکھیں تک چار نہ کہیں۔ لیکن آج دیکھتے ہی دیکھتے ان کی اپنی بیوی بھی مالکین بن گئی تھیں۔ نواب صاحب کے معتمد خاص نے تجلی میں سرفراز علی کو بہت سمجھایا۔ تین دن سے سرفراز علی نے کچھ کھایا تھا۔ پیاتھا۔ آنکھیں سرخ ہو کر سوچ گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت رونے سے سارے آنسو ختم ہو گئے ہیں اور اب آنسو کی جگہ خون نے لے لی ہے۔ لیکن جیسے یہ خون بھی آنکھوں تک پہنچ کر خشک ہو گیا تھا۔

معتمد صاحب نے راز میں بات چیت کی تو لوگوں نے سرفراز علی کی سسکیاں تین دن بعد پھر نہیں۔ گلبدن بیگم نے مہر معاف کر دیا، سرفراز علی نے طلاق دے دی۔ نواب صاحب نے جو گراں قدر قسم سرفراز علی کو سچی تھی وہ لوٹاتے ہوئے سرفراز علی نے نہایت ادب سے ایک خواہش کی کہ گلبدن بیگم کو صرف ایک بار دیکھ لینے کی اجازت دی جائے۔ نواب صاحب نے اس کو مناسب نہ سمجھا، ٹال جانا چاہا لیکن گلبدن بیگم سے مشورے پر انھوں نے جب کوئی مضائقہ نہ سمجھا تو سرفراز علی کو اجازت دے دی گئی۔ گلبدن بیگم چھ پر جلوہ افروز ہوئیں، نواب صاحب ذرا سا اوٹ میں چھپ گئے۔ سرفراز علی طلب کیے گئے۔ نظریں اٹھیں۔ انھوں نے گلبدن بیگم کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے دوسرے

ہو کر فرشی آداب بجالایا اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیوانہ دار بھاگے۔ اس کے بعد سنتے ہیں کہ سرفراز علی نے کبھی دیوڑھی کا رخ نہیں کیا اور کسی خیراتی ہسپتال میں مر گئے۔

گلبدن بواجب نواب صاحب کے عقد میں آئیں تو پورے دس ماہ بعد نواب

قلندر حسین خاں پیدا ہوئے۔ دو تین ماہ پہلے تولد ہو جلتے تو آج یہ چلتا پھرتا ناور

درخت جس کے ٹھنڈے سائے میں دیوڑھی کے لوگوں کو اپنی باقی زندگی بتانی تھی کسی

سو کھے ٹٹو کی طرح کسی گوشے میں دھوپ چھاؤں اور سرد گرم سہتا رہتا۔ لیکن نواب صاحب

کو یقین تھا کہ بلا شرکت غیر سے زمین کی آبیاری انھوں نے کی ہے۔ تخم انھوں نے بویا ہے

پودے کو پروان انھوں نے چڑھایا ہے۔ اسی لیے تو نواب قلندر حسین خاں کے متعلق

لوگ کہتے تھے کہ بس باپ کے منہ سے ٹپک گئے ہیں۔ چال ڈھال، رنگ روپ، دھوری

ہڈی، عمر سے زیادہ گوشت پوست اور چربی۔ نواب صاحب کو اگر جوانی بخش دی

جائے تو اللہ میاں بھی پہچان نہ سکیں کہ باپ کو نسا ہے اور بیٹا کو نسا؟۔ اسی لیے

تو وہ نواب صاحب کے چہیتے تھے۔ ورنہ دیوڑھی بھر میں کتنے ہی ایسے ننگے بچے درخت

پر کونے میں پڑے سو کھ رہے تھے جن کے متعلق نواب صاحب کو شبہ تھا کہ تخم کسی نے

بویا ہے تو کھادا انھوں نے دی ہے۔ تخم انھوں نے بویا ہو گا تو کھاد کسی اور نے دی ہو گی

۔ دونوں کام نواب صاحب نے نہیں کیے۔ جب اس بات کا یقین ہو جائے کہ فصل

اپنی نہیں تو کون در در سر مول لے۔ کون جھکڑوں سے بچائے۔ کون پتے اور ٹہنیاں

گن گن کر پروان چڑھائے۔ آخر قدرت کے تفویض بھی تو کچھ کام ہیں۔

نواب قلندر حسین خاں نے حضور اکابرؐ اس طرح مہر لیا تھا کہ ان جیسا بیٹا شہر

بھر میں ایک آدھ ہی تھا۔ باپ کے سامنے ہوتے تو نظریں زمین سے ہٹانے کی ہمت نہ

ہوتی۔ ہاتھ باندھے، ٹوپی اوڑھے اس طرح مقطع بنے رہتے کہ اب سجدہ کریں گے اب سجدہ کریں گے۔ نئی نویلی شادی ہوئی تھی، لیکن کبھی بھی اسخوں نے آبا حضور کے آرام کرنے تک جملہ عروسی کا رخ نہ کیا۔ دلہن انتظار کرتی کرتی تنھک جاتیں۔ تنہائیوں سے اکتا جاتیں، پھر ماحول کی اجنبیت سے مجبور ہو کر تنہائیوں سے سمجھوتہ کر لیتی، تنہائیوں کی ہور متیں۔ لیکن نواب قلندر حسین خاں ان ساری باتوں سے بے نیاز آبا حضور کے آگے مسجد کے پیش امام یا درگاہ کے مجاور بنے رہتے۔

اس وقت بھی جب کہ نواب صاحب آرام نگاہ میں بستر پر کپڑیں بدل رہے تھے نواب قلندر حسین خاں نے فانوس اور قمقمے گل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ جگمگاتی دیوڑھی نے چشم زدن میں سیاہ لہادہ اوڑھ لیا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جملہ عروسی میں قید تنہائی کاٹنے والی دلہن نے چپکے سے اپنے دل کی دنیا کے اندھیکے ساری دیوڑھی میں گشت کرنے کے لیے چھوڑ دیئے اور ان اندھیزوں میں نواب قلندر حسین خاں آبا حضور کے خراٹوں کی آواز سننے کے لیے بے قرار ٹھل رہے تھے۔ اس لیے کہ آبا حضور جب تک سو نہ جائیں وہ کس طرح اپنی منتظر دلہن کے پاس جا سکتے تھے۔ انہیں اپنے اجاد سے تر کے میں بھی چند چیزیں تو ملی تھیں۔ بزرگوں کا ادب، بڑوں کا احترام

یہ ان کا زیور تھا، اور وہ اس زیور سے ہمیشہ آراستہ رہتے اور پھر آبا حضور کے آگے سیدھی سیدھی سانس لے لینا ہی ان کے لیے بہت تھا۔ جھلا آبا حضور کے جاگتے وقت ان کا ذہن دلہن کا خیال کرنے کی گستاخی بھی کر سکتا تھا۔ اللہ اللہ کہ آبا حضور نے خرخر شروع کی اور وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں ساری حویلی کا چکر کاٹ کر پائین باغ میں داخل ہوئے جہاں ان کی دلہن ان کے انتظار میں جاگ

دلہن کے کمرے میں بھی نواب قلندر حسین خاں دبے پاؤں داخل ہوئے۔ سوچا اگر دلہن سو رہی ہیں تو خود بھی چپ چاپ لمبی تان لیں تاکہ دلہن کو ان کے اس قدر تاخیر آنے کا اندازہ نہ ہو سکے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار انہوں نے یہ حرکت کی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد دس پندرہ منٹ بستر پر گر دیں بدلتے رہتے پھر خود ہی دلہن کو جگا لیتے۔ دلہن بھی اس طرح کچھ دیر سے بیدار نہ ہوئیں جیسے ابھی ان کی آنکھ لگی تھی۔ کبھی کبھی تو واقعی چوکٹ پر نظر جمائے آہٹ کی منتظر وہ جاگتے جاگتے سو جاتیں۔ کبھی جاگتی ریتیں تب بھی لحاف میں منہ چھپائے پڑی رہتیں، زبان سے کچھ نہ کہتیں۔ لیکن آج خلاف توقع چنگ پڑی ہوئی وہ سسکیاں لے رہی تھیں۔ نواب قلندر حسین خاں کو دیکھا تو نظر بچا کر آنکھ سے آنکھیں خشک کرنے لگیں قلندر حسین خاں سیدھے سادے نواب تھے۔ ساحل سمندر پر سریں گے لیکن نہ طغیانوں کا اندازہ نہ طوفانوں کی آمد کا پتہ۔ پانی سے اور بچا ہو جاتا تو ڈوبتے وقت انہیں اس کا اندازہ ہوتا کہ وہ ڈوب رہے ہیں لیکن ابھی تو طغیانیاں دلہن کے سینے میں چل رہی تھیں بادل منڈلا رہے تھے کھل کر کب برسیں گے اس کا خود دلہن کو علم نہ تھا۔ آج دو چار قطرے برس پڑے تھے تو نواب قلندر حسین خاں نے محسوس تک نہ کیا کہ گھٹائیں اُٹا کر چھاری ہیں تو کبھی کبھی ٹوٹ ٹوٹ کر برسیں گی بھی۔ انہوں نے صبر اتنا ہی پوچھا کہ بیگم نصیب دشمنان طبیعت ناساز تو نہیں۔ آپ اتنی رات تک جاگ کیوں رہی ہیں؟۔ دلہن جو دیوڑھی بھر کے لیے دلہن بیگم تھیں اور نواب قلندر حسین خاں کے لیے صرف بیگم۔ کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ بستر کی شکنوں نے نشتر بن کر دلہن کو کچھ کے دیئے۔ دیواروں پر رنگی

ہوئی کتنائیوں نے دلہن کے کانوں میں سرگوشیاں کیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کی چھٹی چھٹی آنکھوں نے دلہن کو اشارے کیے۔ کہہ دو دلہن۔۔۔۔۔ آج ہی کہہ دو۔۔۔ کہ تم دیوڑھی کے طول طویل احاطے میں سمجھتی ہوئی زخمی روحوں سے واقف ہو گئی ہو۔۔۔ ایسی روحوں سے جن کے ماضی کو..... بڑے نواب صاحب نے حرف غلط کی طرح محو کروا دیا ہے۔ ان روحوں کا نہ کوئی ماضی ہے اور نہ کوئی مستقبل۔ لوح پاک میں ان کے ناموں کے متوازی ان کی تقدیر صرف تین لفظوں میں لکھی گئی ہے۔ پیدائش، عقد، موت۔ پیدائش سے لے کر موت تک اتنی لمبی پوری مدت میں ان کو نہ کوئی نیکی کرنی ہے اور نہ کسی بدی سے ان کا واسطہ ہے۔ اللہ نے اشرف المخلوقات کو پیدا کیا اور بہت سے کام اس کے تفویض کیے لیکن اللہ نے انہیں صرف ایک ہی کام دیا اور وہ تھا نواب صاحب سے عقد کر لینا۔ اس کے بعد اللہ نے اور کوئی کام سونپنے کی ضرورت نہ سمجھی۔۔۔ درو دیوار چیخ رہے تھے۔ تم نے بھی نواب ابن نواب سے عقد کر لیا ہے دلہن! استخاری زندگی کا مقصد سبھی پورا ہو گیا۔ تم جس لیے پیدا ہوئی تھیں وہ تم کر چکیں۔ اب اپنے مستقبل کو نواب صاحب کے قدموں میں رکھ کر بالکل بھول جاؤ۔ اب تمہیں مستقبل کے گھٹا ٹاپ اندھیروں میں کچھ نہیں ملے گا۔ ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ رہنا چاہو گی تو یہ بھی ممکن نہ ہو گا۔ اس لیے کہ ماضی کی دل خوش کن یادیں بھی حریفی کی اونچی اونچی دیواریں پھلانگ کر تم تک نہیں آسکتیں۔

چھٹی چھٹی آنکھوں سے کب تک درو دیوار کو گھورتی رہو گی دلہن۔ اپنی ہی سگی ساس کا عالم دیکھو۔ تنہا رہے شوہر کو جس کو کون نے جنم دیا ہے جس کے بطن سے وہ پیدا ہوئے ہیں آج وہ دیوڑھی کے درو دیوار میں اپنا ایک ایک آنسو اس احتیاط سے

دفع کرتی پھر ہی ہے کہ کہیں بڑے نواب صاحب یا نواب قلندر حسین خاں اس کے اس بحرمانہ فعل سے واقف نہ ہو جائیں۔ ماں کے پیروں تلے اولاد کے لیے جنت ہوتی ہے دلہن۔ لیکن تمھاری حویلی کی ساری ماؤں نے یہ جنتیں بھی نواب صاحب کے حوالے کر دی ہیں۔ اس میں تمھارے شوہر کا کیا قصور ہے۔ ان جنتوں کے حصول کے لیے وہ نواب صاحب کے قدموں میں بچھ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ نواب صاحب ان کے باپ ہیں۔ اور نواب صاحب کے پہلو میں وہ جو سولہ برس کی حسینہ ہے اس کا احترام تمھارے شوہر پر منشا اس لیے لازم ہے کہ وہ نواب صاحب کی چھیتی بیوی ہے اور نواب صاحب نے اس کے قدموں تلے کی جنت ابھی نہیں چھینی ہے۔

لیکن دلہن تمھارے لیے ابھی وقت ہے۔ تم نے اپنے پیٹ میں جس چیز کو بے پناہ محبت سے چھپا رکھا ہے اس کے لیے وہ جنت بھی چھپا رکھو جو تمھارے تلووں کے نیچے ابھی تک محفوظ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی گلبدن بیگم کی طرح — دلہن نے سر کو زور سے جھکادے کر ان وحشتناک خیالات کو زمین پر پٹک دیا۔ وہ قریب قریب کانپ رہی تھیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ صدائیں گھر کے در و دیوار سے نہیں آرہی ہیں بلکہ خود ان کا ذہن اپنے شوہر کے خلاف سوچنے کے اخلاقی جرم کا ارتکاب کر رہا ہے، یا کوئی شیطان ہے جو درغلز رہا ہے۔ دلہن نے آیتیں پڑھ کر سینے پر چھونک لیں، اور توبہ استغفار کر کے طے کیا کہ کل ہی سے وہ پانچ وقت نماز پڑھیں گی تاکہ اپنے بیکار ذہن کو شیطان کا کارخانہ بننے سے بچالیں۔

نواب قلندر حسین خاں کو ہر گھڑی یہ فکر دامن گیر ہوتی کہ آبا حضور کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کریں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آبا حضور کے ہورہنے

میں عزت، حکومت اور دولت ہر شے ان کے قدم چومتی رہے گی، اور واقعی انھیں ہر چیز حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود گلبدن بیگم دیوڑھی بھر میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ دوسری بیگمات گلبدن پر اس لیے رشک کرتیں کہ قلندر حسین خاں نے نواب صاحب کا دل موہ لیا ہے۔ نواب صاحب چوں کہ ہر کام نواب قلندر حسین خاں کے مشورے سے کرتے تھے اس لیے گلبدن بیگم کی اہمیت دیوڑھی بھر کے لیے مسلم تھی۔ سرکنیں سوچتی کہ قلندر نواب کے ذریعہ گلبدن بیگم جو چاہے نواب صاحب سے کروالیتی ہیں۔ ان کی پانچوں انگلیاں نوگئی میں ہیں ہی — دیوڑھی کی ایک ایک چیز قلندریاں کے ہاتھوں اونے پونے تک رہی ہے لیکن گلبدن بیگم برابر کی حصہ دار ہو کر رہی ہائے و آہ کرتی ہیں سمجھتی ہیں کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملک میں جھپکانے کی طاقت بھی وہ سب سے چھین لیں گی جن آنکھوں نے دیوڑھی کا رنگ ڈھنگ دیکھا ہے، سر دگریم دیکھا ہے وہ رات کے اندھیروں کو دوڑتے ہوئے بادلوں کا سا کیس طرح سمجھ سکتی ہیں۔ وہ نکھرے ہوئے دن کے ابلے کو لہراتی ہوئی سجلی کی چکاچوند کس طرح مان سکتی ہیں۔ لیکن گلبدن بیگم ہیں کہ آئینل بھپلا کر اشکوں کی پونجی اس احتیاط سے جمع کر رہی ہیں کہ جیسے پلوں میں باندھے ہوئے انھیں موتیوں کے سہارے مستقبل کے دن کاٹ لیں گی۔ جیسے انھیں قلندر نواب سے واسطہ ہے نہ نواب صاحب سے — گلبدن بیگم یہ سب کچھ سن کر کڑھتیں۔ اس لیے کہ جس طرح بات چلتی تھی حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ سچ ہے کہ نواب صاحب دیوڑھی کی ہر وہ چیز بیچ رہے تھے جس سے ان کے اجداد کی شان و شوکت وابستہ تھی، نام و ناموس وابستہ تھا، عزت و توقیر وابستہ تھی لیکن اس میں گلبدن بیگم کا کیا درد تھا وہ تو صرف

اتنا جاننا تھیں کہ جب سے نواب صاحب بمبئی کی ایک ٹری جبری اسٹمر الر کی کو اٹھا لائے تھے اس دن ان کے اپنے ہاتھوں میں بجتی ہوئی سہاگ کی چڑیاں جامد ہو کر اپنا نغمہ بھول گئی تھیں۔ اپنی اس چہیتی چھوٹی بیگم کے لیے جب سے نواب صاحب نے دیوڑھی کے قریب ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان لے رکھا تھا اس دن سے دیوڑھی ویران ہو گئی تھی اور ان ویرانیوں نے آہستہ آہستہ سمٹ کر، سکڑ کر ان کے اپنے دل میں پناہ لے لی تھی۔ اور اب یہ ویرانیاں جو دیوڑھی سمیر پر سلطنتیں گلابدن بیگم کے سینے میں گھٹ گئیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ دیوڑھی بھر کے مشرکہ غم کے سوا بھی کوئی غم ایسا ہے جو ان کے حصہ میں آیا ہے۔ وہ بھی دن تھے جب نواب صاحب کے التفات سے ان کی زندگی بھی چمن درچمن تھی۔ پھر اس چمن میں ایک ننھا سا پودا آگ آیا۔ گلابدن بیگم نے خون دل سے اس پودے کو سنبھالا، جب یہ تناور درخت بن گیا تو وہ اس درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے باقی دن گزارنے کے لیے اس کے نیچے آ بیٹھیں۔ لیکن نواب صاحب کے چھوتے ہی چھوٹی موٹی کے پودے کی طرح اس درخت کے سارے پتے جیسے مرجھا گئے۔ ٹھنڈے سارے گرم دھوپ کی تازگی سے جیسے کھیل گئے اور اب گلابدن بیگم چلچلاتی دھوپ میں کھڑی ہانپ رہی تھیں۔ اور یہی غم گلابدن بیگم کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ وہ اپنے دکھ درد کا مقابلہ دوسری بیگمات کے رنج و غم سے کرتی تو انہیں خود پیریزس آنے لگتا۔ فحشہ بانو کے تو اولاد ہی دستی، وہ اپنی زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح کاٹ رہی تھیں۔ مزاج خانم سے نواب صاحب نے آنکھیں پھیر لیں تو سکندر حسین خاں نے کسی قیمت پر باپ کو معاف نہیں کیا۔ نواب صاحب نے ڈرایا دھکایا لیکن آخر کو

انہیں اپنی لاج رکھنی پڑی۔ آج ماں بیٹے ناں جویں کھا کر ہی سہی ہنسی خوشی سے تو سہر کر لیتے ہیں اور پھر دیوڑھی بھر میں قدر و منزلت معراج خانم ہی کی ہے۔ کیا مجال جو گھر کے نوکر چاکر ان سے کوئی گستاخی کریں اور یہاں یہ عالم ہے کہ وہ لوگ جو کبھی ان کے اشارے پر دیوانہ وار ناپتے تھے آج سیدھے منہ بات نہ کہ نہیں کرتے۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔ معراج خانم کو بھی پیا نہیں چاہتے لیکن ان کی عزت تو دیوڑھی میں نیلام نہیں ہوتی۔ اللہ رکھے جان جو ان بیٹا ہے، دکھ درد کی خبر تو رکھتا ہے۔ ماں پر بات آتی ہے تو سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ لیکن قلندر حسین خاں کی ماں بھی جیسے نواب صاحب ہی تھے اور باپ تو نواب صاحب تھے ہی۔

گلبدن سلیم سے نواب صاحب نے سہاگن چھین لیا تو قلندر حسین خاں نے پیری کا عصا چھین لیا۔ اور کبھی کبھی گلبدن بیگم سوچتیں کہ کہیں مرحوم سسر نواز علی کی بددعاؤں نے یہ دونوں نعمتیں تو ان سے نہیں چھین لیں۔ اور یہی سب باتیں سوچ سوچ کر ان کا جی کڑھتا رہتا۔ وہ اپنا دکھ درد کس سے کہہ سکتی تھیں۔ ہونٹوں کی مستی مانگ کی افشاں اور چوڑیوں کے چھناکے تو زمانہ ہو نواب صاحب نے چھین لیے تھے لیکن پیٹ کی اولاد نے ماں کی ماتا کو ماں کے سینے ہی میں دفن کر دیا، اور اب گلبدن بیگم ماتا کا مزار سینے میں چھپائے دو دونوں نواب قلندر حسین خاں کی صورت کو ترستیں۔ اولاد کا یہ دکھ تو وصف ان ہی کا حصہ تھا۔ اس دکھ میں کوئی ان کا شریک نہ تھا۔ ہونٹوں کی مستی، مانگ کی افشاں اور چوڑیوں کے چھناکوں کی دولت سے تو نواب صاحب نے دیوڑھی میں سسکیاں لیتی ہوئی حوا کی سب ہی بیٹیوں کو کب کا محروم کر دیا تھا۔ نواب صاحب کی دین تھی نواب صاحب نے ہی سب سے چھین لی۔ اللہ دیاں زندگی

اُٹھلی پر چھایاں
 بخشا ہے تو زندگی چھین لینے کا حق بھی اس نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔ نواب صاحب
 اپنی بیویوں کے خدائے مجازی تھے ہنسیاں بخشے تھے تو ہنسیاں چھین بھی لیتے تھے۔ یہ کوئی ایسا
 جرم تو تھا نہیں۔ غرضیوں سے کھیل لیتے تھے زندگیوں سے تو نہیں کھیلے تھے۔ قانون نے
 خدا کو زندگیاں چھین لینے کا حق دے رکھا تھا۔ دینا کے کسی کورٹ میں اس پر مقدمہ نہیں
 چلایا جاسکتا تھا قانون نے اسی طرح نواب صاحب کو خوشیاں چھین لینے کا ادھیکار
 دے رکھا تھا، دینا کے کسی کورٹ میں ان پر بھی مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا تھا۔ اور اس
 راز کو حلی کی چار دیواری میں سمجھتی ہوئی تشنہ اور بیمار روصیں اچھی طرح
 جانتی تھیں۔ لیکن بات یہ تھی کہ نواب صاحب نے پھر بھی اپنا فرض ادا کر دیا
 تھا، یعنی خوشیاں دے کر خوشیاں چھین لی تھیں۔ لیکن اللہ میاں تو زندگی دے
 کر بس سہول بیٹھے تھے۔ انھیں اپنا فرض یاد آنے تک سانسوں کی آمد و شد
 کو زندگی سمجھنا ہر ایک کے لیے ضروری تھا۔

گلدن بیگم سوختیں عجیب کا روبرو ہیں سانچے بادشاہ کے، عجیب مصلحتیں ہیں۔
 سب کچھ دیکھنے والا سب کچھ سننے والا ہم بندوں سے اس طرح نظریں پھیرے ہوئے
 ہے جیسے ہماری بربادیوں پر ہم نہیں تو وہ خود قانع ہے۔ اگر اللہ میاں عورت رہتے
 اور نواب صاحب سے۔ استغفر اللہ۔ یکا یک یہ خیال گلدن بیگم کے ذہن میں برقی و
 دوڑا کر گذر گیا۔ وہ دیر تک دل ہی دل میں تو بہ کرتی رہیں پھر گر گر کر اگر التجائیں
 کہیں کہ سچے بادشاہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے یا پھر اس دماغ سے سوچنے کی ساری قوتیں سلب
 کر لے جو تجھ سے بھی گستاخی کا ارتکاب کر بیٹھا ہے۔ پھر انھیں خود پر ترس آگیا کہ نواب صاحب نے ان
 کا سہاگ چھینا، پیٹ کی اولاد چھینی اور اب خدا تک کو چھین لینے کے درپے ہیں۔ یہ کیسے صبح و شام
 ہیں۔ یہ کیسے شب و روز ہیں۔ کیسی زندگی ہے کہ یہاں سب کچھ نواب صاحب کا ہے۔ اور
 وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی بے بسی پر رونے لگیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ اڑ دیوں کے

صدریاں سرفراز علی ان کے سینے پر سر رکھ کر ان کی دھڑکنیں کو گن رہے ہیں۔

”چھوٹی بیگم بچہ ہی گئیں آج — سنا بی بی کچھ یہ“

گلبدن بیگم اس طرح چونکیں جیسے وہ خود سرفراز علی کے ساتھ کھڑی گئی ہیں۔

پلو سے آنکیں خشک کرتے ہوئے گلبدن بیگم نے نظریں اٹھائیں تو بوڑھی بوا

ساتھ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی — صوفے کا سہارا لے کر قالین پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی۔

گلبدن بیگم نے ڈرتے ڈرتے بہت آہستہ پوچھا۔

”کس کے ساتھ بوا۔ اور کس نے پکڑا؟“

”قلندر نواب کے ساتھ بیگم۔ بڑے سرکار نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”ہائیں“

گلبدن بیگم کے دل کو اپنی مٹھی کی مضبوط گرفت میں لے کر جیسے سرفراز علی نے

سارا خون پھوڑ لیا۔ وہ کھٹی کھٹی آنکھوں سے غلامی گھورنے لگیں اور ان کے ذہن نے

جلنے کیوں اس طرح سوچا کہ نواب صاحب ڈیوڑھی کے گرے ہوئے حصے کا وہ طبقہ ہیں

جس کے بڑے سے ڈھکے پیچھے چھپ چھپ کر قلندر میاں چھوٹی بیگم سے ملنے کے لیے

جایا کرتے تھے جو سولہ سال کی سی لیکن پھر بھی ان کی ماں تھیں۔



آج اس نے پھر پی رکھی تھی

اپنے ساتھی کے کاروبار کے گھاٹے سے متعلق سوچتے سوچتے اس کا دماغ
 بوجھل ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے مضبوط کوڑا مقل تھے۔ وہ مقفل کوڑوں کے سامنے کھڑا
 اپنی بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔ جب ہوٹل میں نیا کھانا تھا تو کوئٹہ پر بیٹھ کر بیروں کو بلانے
 کے لیے بل بجاتے ہوئے وہ سوچتا تھا کہ اب اس کی زندگی ان ویرانیوں اور
 سناٹوں سے بہت دور نکل آئی ہے جو اس کی روح اور دل پر حکمران تھے۔ چھتے
 ہوئے ریڈیو اور سامع خراش گھنٹی کی ٹرنگ ٹرنگ میں اس کو اپنے مستقبل کی
 چہل پہل دکھائی دیتی تھی۔ اس کو یوں نظر آتا تھا کہ اس کے بچوں اور بیوی کی آواز
 بھی ریڈیو اور گھنٹی کے شور میں گھل مل گئی ہیں۔ جب ہوٹل کا یہ ریڈیو خاموش
 ہو جائے گا، یہ گھنٹی نہ بجے گی تو اس کے ہنستے کھلتے بچوں کے دکتے ہوئے چہروں پر
 مردنی چھا جائے گی۔ اس کی بیوی کے سرخ گال جن پر زلفیں بکھر کر وہ لکڑی ابر میں
 چھپے ہوئے زہرہ و مشتری سے تشبیہ دیتا ہے راکو میں دبے ہوئے انگاروں کی طرح

وہ اسی قسم کی بہت سی باتیں سوچتا رہا اور بھاگ کر اس نے ایک اسکپاچ
حسینہ کا دامن منہام لیا۔ جس نے اس کے ذہن کو سکون بخشتا اس کے قلب و روح
کو مسحور کیا، رجھایا اور اپنا لیا۔

”جان ہیگ دنیا کی سب سے خوبصورت شے کا نام ہے۔“

”تم بدھو ہو۔ بکو اس مت کرو یا رٹھنگو۔ یہ فراریت و راریت نہیں ہے۔ یہ
اصطلاحیں تم بزدلوں نے وضع کر رکھی ہیں۔“

”جان ہیگ دنیا کی عظیم ساحرہ ہے۔ تم میں اس کی بارگاہ تک پہنچنے کی جرات نہیں
ہے تو پھر تم اس کے پیچھے تباہ کیا ہو سکتے ہو۔“

”تم کافی ہاؤس کے اسٹلپکول ہو۔ کافی پیو۔ گرم کافی سرد کافی لیکن کبھی کبھی
جان ہیگ کا دامن منہام کر زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”یو فو۔ میں صوبتوں سے بھاگ کر شراب میں پناہ لینے کو جرم سمجھتا ہوں۔ یہ
خودکشی کے مترادف ہے، اور خودکشی پاگلوں کا شیوہ ہے۔“

”اور جان ہیگ آدمی کو پاگل ہونے سے بچاتی ہے۔“

”اچھا اب چل دیئے مانی ڈیر ٹھنگو۔ گڈ بائی، کل ملیں گے۔“

رکش میں بیٹھے وقت اس کے پیر لڑکھارے تھے۔ اس نے آج بہت پی رکھی
تھی اس کے سامنے بھی ہوئی ٹر پکشا والا چل پڑا تو وہ سوچنے لگا کہ یہ ٹر کس جس کے
سینے کو میں نے بار بار روندنا ہے اور جو میسے پیروں کی گرمی سے مانوس ہے۔ شاید
میرا گذر نہ ہوئے پھر راہ گیر سے پوچھے — لیکن نہیں اس نے تو اپنے سینے میں بے شمار

اجلی پر چھائیاں آدمی اور آدمی

یادیں دفن کر رکھی ہیں۔ کوئی آتا ہے تو مسلسل آتا ہے اور نہیں آتا تو کبھی نہیں آتا۔

لیکن یہ سڑک بالکل خاموش ہے۔ صدیوں سے اسی طرح چپ چاپ راہ گروں کے پیروں میں بچھی ہوئی ہے جیسے اس کو نہ کسی کے آنے کی خوشی ہے اور نہ کسی کے جانے کا غم۔

بالکل ہندوستانی عورت کی طرح۔

جانے اس کو سڑک کے ساتھ ہندوستانی عورت کا خیال کیوں آیا، اور پھر اس کی نظروں کے آگے اس کی بیوی کا چہرہ جم کر رہ گیا۔ یہ مہل خیال ہندوستانی عورت کی تو ہیں ہے۔

لیکن جیسے اس کی بیوی نے آہستہ سے اس سے کہا کہ تم پھر حقائق سے گہرا رہو، تم نے عورت کی کوئی ایسی تو ہیں تو نہیں کی۔ کیا میں ایک ایسی سڑک نہیں ہوں جس کے سینے کو تمہارے ماں باپ اور تم مسلسل روند رہے ہو۔ اور میں خاموش تماشا بنی بنی دیکھ رہی ہوں۔

اس نے سر کو جھٹکا دے کر رکشا کے اترے ہوئے باپ پر سر ٹپک دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اب کچھ بھی نہ سوچے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے تینوں بچے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں جیسے خیالات کی درآ میں ذہن کا مہنس آنکھوں کا حصہ تھا، اور اب پیوٹے سدرہ بن جائیں گے۔ گھر پہنچ کر رکشا والے نے اسے جگایا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے سوچ دیا تو اس کی آنکھیں بندھی گئیں اور وہ میز پر اپنی عینک تلاش کرنے لگا جو پہلے ہی سے اس کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کو اپنے سامنے لٹکتا ہوا بلب نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبھی نظر آ رہا تھا تو

مُضداد و حنّاء کبھی بہت روشن روشن اور کبھی لب کے اوپر ایک لب اور سوار ہو گیا تھا۔ ایک لب آہستہ آہستہ چھت سے زمین کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ زمین سے چھت کی طرف اوپر ہی اوپر اٹھ رہا تھا شاید کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ وہ فرش ہی پر اپنے پیر جمائے رہ کر کھنا چاہتا ہے لیکن زمین خود نیچے ہی نیچے کہیں جا رہی ہے اس کیفیت کو شاید اس نے ایک ثانیہ کے لیے محسوس کیا اور آنکھیں مل کر ہوشیار ہو جانے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن آنکھوں اور ہاتھوں کے درمیان کوئی چیز اسے مزاحمت کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے عینک اتار کر میز پر پھینک دی اور یہ سمجھ کر کہ عینک اس نے اتاری نہیں ہے بلکہ لگائی ہے صوفیہ پردہ راز ہو کر جگمگاتے لب کو گھورنے لگا۔

اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ صف گستاخ ہی نہیں بلکہ کمینہ اور سفلہ بھی ہے۔ اس کا باپ بہت متمول تھا۔ زمینات کے علاوہ بڑے بڑے کئی مکانات اور نقدی کا مالک۔ اتنی بڑی جائیداد رکھنے والے باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ خود کو بھی کم از کم نکاح جو کا تو نہ سمجھ سکتا تھا لیکن بہت جلد اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کا اپنا کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کو زندگی میں کئی بار اپنی مفلسی اور نکبت کا شدید احساس ہوا، اور آج یہ احساس شدید تر ہو گیا تھا کیوں کہ ہوٹل دیوالیہ ہو جانے کی وجہ سے ہوٹل کے مالک نے اس کو میجر کی اہم خدمت سے علیحدہ کر دیا تھا اور آج سے پھر اس کی زندگی اس کے باپ کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے خاندان کے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بہت ضدی ہے اور اسی ضد کی وجہ سے وہ زندگی کی بہت ساری نعمتوں سے سب کچھ رکھ کر بھی محروم ہو گیا ہے

اعلیٰ پر چھائیاں
 آدمی اور آدمی
 لیکن وہ اپنی ضد کو اصول پرستی سمجھتا، اور اس کا باپ اس کی اصول پرستی کو
 اس کی کمینگی سمجھا کرتا۔

جب تک وہ چھوٹا تھا اس کو زندگی کی ساری سہولتیں حاصل تھیں۔ ایرگن
 لے کر چڑیا خانے کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ بڑھتا رہا۔ پھر ٹولیوں پر لے کر خرگوشوں کے
 پیچھے بھاگنے لگا۔ میں بھی گیس تو وہ غزالوں کا دیوانہ بنا ہوا جنگلوں میں پھرتا رہا۔
 لیکن جب اس کے باپ کو پیش مل گئی اور انھوں نے ضلعوں کی زندگی ترک کر کے
 شہر میں مستقل سکونت اختیار کی تو ان دنوں وہ خود ایک غزال چشم حسینہ کے تیر نظر کا
 شکار ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ سے بندوق پھینک دی۔

ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے باپ سے اس کے اختلافات کا آغاز اسی
 واقعہ سے ہوا۔ وہ پٹھان قوم ہی کی ایک شریف اہل خانہ لڑکی تھی۔ لیکن اس کے باپ کا
 کہنا تھا کہ ”وٹ پاتھ پر ہاتھ پھیلانے والے بہت سارے فقیر بھی شریف اہل خانہ
 ہوتے ہیں۔ برقع پہن کر گھر گھر اپنا دکھ درد بیان کرتی پھرنے والی عورتیں بھی خاندان
 کی شریف ہو سکتی ہیں۔ نواب حکیم الملک کے بیٹے کا پوتا جس نے سیس اور شراب میں اپنی
 ساری پونجی لٹا دی ہے اور تریج گلے میں ڈال کر درگاہ کا مجاور بن بیٹھا ہے وہ بھی
 شریف زادہ ہے لیکن ان سب سے زیادہ ”شریف الاشراف“ ہے تو وہ رویہ ہے جو
 ہر شخص کی کمینگی پر پردہ ڈالنے کی قوت رکھتا ہے۔ کسی کی بُرائی کی پردہ پوشی کرنا عین شرافت
 ہے اور اس شرافت کا اگر کوئی دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ رویہ ہے۔ تم جس لڑکی کے چکر میں
 ہو، اس کے گھر اس شریف ترین شے کا گدڑی نہیں۔ جوانی کے جوش میں تم اندھے
 ہو گئے ہو۔ میں جہاں دیدہ ہوں، اور پھر ذرا سن رکھنا صاحبزادے میں پٹھان ہوں۔

اجلی پر چپائیاں آدمی اور آدمی

تم میرا نطفہ ہو کر مجھ سے اکڑ فوں نہیں کر سکتے کہ چکا ہوں اور مگر کہوں گا کہ تمھاری بیٹی
گھر میں بہو بن کر نہیں آ سکتی۔ کبھی نہیں آ سکتی۔ عشق کیے جاؤ اور تڑپ تڑپ کر
مجھوں کا نام روشن کرو۔“

وہ بھی تو آخر ٹھکان باپ کا ٹھکان بیٹا ہی تھا۔ وہ وہ مجھوں کا نام روشن
کیا ہے کہ باپ کا نام بھڑک کر سبھ جانے ہی کو رہ گیا تھا، اور یہ سب اس نے کافی
سوچ سمجھ کر کیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اپنے ٹھکان باپ کے سامنے ٹھکان بن کر
ڈٹ جانے سے ہی بات بن سکتی ہے۔ بات منوانے کے لیے ان کو یہ دکھانا ضروری
تھا کہ جو مور ز عتاب ہے، جو رائدہ درگاہ ہے وہ بھی ان ہی کا بیٹا ہے جس کی شیرانو
میں بدستی یا خوش قسمتی سے انھیں کا خون دوڑ رہا ہے۔

اس کی اس باغیانہ روش نے آخرش اس کے باپ کو مصالحت پر مجبور کر دیا۔
وہ راتوں کو گھسے غائب رہنے لگا۔ کبھی کبھی حالت نشہ میں وہ گھر لوٹتا تو نشہ اتنا
نہ رہتا جتنا وہ ظاہر کرتا۔ بلند آواز میں جیسے کسی کو مخاطب کر کے کہتا ”میں نے ایسا کوئی
بہت بُرا قصور نہیں کیا ہے۔ میری کمینگی بہت ادنیٰ درجے کی ہے اور میرے باپ کے
پاس اتنی دولت ہے کہ وہ میری بڑی سے بڑی کمینگی کی سبھی پردہ پوشی کر سکتا ہے۔ ادھر
بیٹا جرم نہیں ہے اور میں کونسی ہزاروں کی رقم کا تمھارا مقروض ہوں۔ تم فکر نہ کرنا میں
تمھاری ساری رقم لوٹا دوں گا، لیکن کہے دیتا ہوں کہ سائے کی طرح میرے پیچھے پیچھے
میرے گھر نہ آنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ جاؤ اسی وقت چلے جاؤ۔ میرا غصہ بہت بُرا ہے۔ میں
ٹھکان باپ کا ٹھکان بیٹا ہوں سمجھے۔“

اس کی ماں کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ اپنے کسر کے کواڑوں کو زور سے بند

کر لینے کے بعد اس کو علانیہ سنا دیتا کہ اس کے ماں باپ میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں، اس کی ماں بڑی بجا جت سے اس کے باپ کو سمجھاتی ”کیوں تباہ کر رہے ہو اس کو آج شراب کو منہ لگایا ہے، کل بازاری عورتوں کا منہ چاٹا سچے سچے مصطحت اسی میں ہے کہ پیر میں بڑی ڈال دی جائے۔ کشتی ہو جائے گا تو پھر سنبھالنا بس کا روگ نہ رہے گا۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ بھی تمہارا ہی بیٹا ہے۔ اپنا کیا اس طرح بھی بھولتا ہے کوئی۔ یاد ہے اس بے شرم فرنگی کے چھپے پڑے تھے تو ہزاروں روپے بھونک دیئے تھے اس پر سبھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ چند دن گود گرم کر کے اس نے بہت کچھ بٹور لیا اور ایک ٹافی کے ساتھ بھاگ گئی۔ جاتے وقت کجخت نے تمہیں عمر بھر کا روگ لگا دیا۔ اور پھر ان دنوں اسلم میری گود میں ہمکتا تھا۔ گھر میں سب کچھ رکھ کر تم بازار کے ہو رہے تھے۔ مجھے سلگتے ہوئے کوٹوں پر کر ڈیں لینے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور پھر کیا میں یہ بھول جاؤں گی کہ اس بے سوا کو کشمیر کی سیر کو لے جاتے وقت تم نے میرا منہ اس چہرہ نہ دیکھا تھا تو نہ دیکھتے لیکن اسلم بھی تو نہ یاد آیا تھا۔ آج وہ اپنی ہی برادری کی ایک لڑکی پر ریکھ گیا ہے تو جائزہ طور پر اپنی بیوی بنا کر گھر لانا بھی تو چاہتا ہے۔ لیکن تمہیں یہ شرافت کیوں پسند آئے گی۔ تمہیں سیدھا راستہ بھایا ہے کبھی۔ کانٹے بھی ہوئی پگنڈی پر چلو گے اور وہ بھی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس طرح جیسے مغل پر چل رہے ہو۔“

اسلم خاں کا نشانہ تیر بہدف تھا۔ ماں نے سرگوشیاں بہت دھیمے سروں میں شروع کی تھیں لیکن بات ختم ہوتے ہوتے سر جا کر لمبی تانوں کی حسروں کو چھو رہے تھے اور اس کا باپ بھیگی تلی بنا جیسے کھمبانوچ رہا تھا۔ لیکن یکایک شاید اس کے ذہن کو کسی نے بجلی کے تاروں سے شاک پہنچا دیا۔ وہ ایک دم برجم ہو گیا۔ یہ اس کی

ہمیشہ ہی کی عادت تھی۔ بات کرتے کرتے کوئی معمولی سی بات بھی اس کو ناگوار خاطر ہوتی تو وہ ایک دم اس طرح غصے میں آتا کہ آپ کو پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ وہی شخص ہے جو آپ سے ایک ثانیہ قبل مسکراتا ہوا باتوں میں مصروف تھا یا پہلے ہی سے فقہ کے زہریلے اثرات اس کے بدن میں سرایت کر رہے تھے اور جب یہ زہر نس نس میں پھیل گیا ہے تو اس کے چہرے سے رس کر آپ تک پہنچ رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ پلک جھپکنے تک ہو جاتا آپ سوچتے ہی رہ جاتے کہ آپ نے تو کوئی ایسی دل شکنی کی بات نہیں کی تھی۔

آپ کو مختصر ایک واقعہ ہی کیوں نہ سنا دوں۔ ایک بارجب کہ اسلم خاں اور اس کے بیوی بچے معتوب ہو گئے تھے اور ماہانہ صنف پرچاس روپے گزربہر کے لیے مقرر کر کے ان کو علیحدہ کر دیا گیا تھا تو ایک دن ایک رشتہ دار نے اسلم خاں کی سعی سفارش کی اور اس کے بال بچوں کی زبوں حالی کا نقشہ اس کے باپ کے سامنے رکھا ایک ہی لمحہ میں ساری فضا مکر ہو گئی۔ خاں صاحب بالکل بچھے ہوئے شیر کی طرح گر جنے لگے۔ قربانی اور صدقہ کے فضائل کی ایک موٹی سی کتاب اٹھالائے اور فرمایا کہ ”صاحب منان ابن صفیان ابن خلجان شرقی الغریب الافاقی نے صرف ساڑھے تین آنے میں ایک سال گزربہر کی تھی۔ نیتیں اور اعمال نیک ہوں تو اللہ برکت دینے میں دریغ نہیں کرتا لیکن لوٹنا تو مرتد و ملحد ہے۔ صاحبزادے کو اللہ کے وجود ہی سے انکار ہے ایسے میں پچاس تو کیا پانچ سو میں بھی برکت نہیں ہو سکتی۔ آپ کو ترس آتا ہے تو کیجئے کافروں کی سرپرستی میں تو مسلمان پیدا ہوا ہوں مسلمان مروتوں کا۔“ بات کفر و اسلام تک جا پہنچی تھی مولانا اپنا سامنے لے کر واپس لوٹ گئے۔

آج بھی خانم صلوانیں سناقتی رہیں تو خاں صاحب بہت دیر تک خاموش

اُجلی پرچھائیاں آدمی اور آدمی

رہے لیکن خانم کے طنز کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ گرج کر کہنے لگے ”ہاں ہاں دُنیا کی آنکھوں میں دھول جو نہ کھٹا ہوں۔ برابر جو نہ کھٹا ہوں، ہمیشہ جو نہ کھٹا رہوں گا۔ لیکن جو کچھ کرتا ہوں باپ دادا کے برتے پر تو نہیں کرتا۔ خود کیا ہے۔ محنت مشقت کر کے۔“
خانم بھی تو آخر چٹھان تھیں، شیرنی جب اپنے بچوں کی سلامتی کے لیے بھرتی ہے تو کہتے ہیں کہ جنگل پر حکومت کرنے والے شیر صاحب بھی دم لانے لگتے ہیں۔ بیگم غرائیں ”اے چھوڑو مجھے تمھارے باپ دادا نے چھوڑ دی کیا تھا جو تم اتراتے ہو وہ تو میرے باپ نے داماد بنا کر احسان کیا تم پر۔ اتنی بُری خدمت دلائی اور رہے بھی ایسے محکمے میں کہ آج لکھتی بنے بیٹھے ہو۔“ یہ سب کچھ تمھارے اجداد کی میراث ہے نا جس پر تم اکر رہے ہو۔“

بات بالکل راست ہو گئی تو خاں صاحب نے محسوس کیا کہ اس برہمی کے پیچھے بہت سی صداقتیں بھی ہیں۔ خانم بے وجہ بڑبڑا لیتیں تو وہ بھلا کیوں خاموش ہوتے ذرا سا آواز کو دھیمّا کر کے وہ خانم سے کچھ مصالحت کرنے والے ہی تھے کہ اسلم خاں کے کمرے سے گلاس ٹوٹنے کے چھناکے نے انھیں اپنی طفس متوجہ کر لیا۔

اسلم خاں سمجھتا تھا کہ اس وقت جب کہ آتش و باروت کی گرم فضا مصالحت کی ہوا کے خاک جھونکوں کی زد میں آ رہی ہے اس کو ایک ہائیڈروجن بم استعمال کرنا چاہیے جس سے دل و دماغ کو بھر ایک جھٹکا لگے اور سارا ماحول کدّر ہو جائے، جل اٹھے اور اس نے گلاس فرش پر دے مارا اور دیو داس کا سہیل بن کر انتہائے غم میں تہقے لگانے کا پارٹ ادا کرنے لگا۔

ٹوٹے ہوئے گلاس کا چھناکا اور قہقہے کی گونج اس کی ماں کے دماغ پر شل بن کر گری اور کہنے شرابی نے اپنے کان کو اڑوں سے لگا دیئے تو اس کی

ماں کہہ رہی تھی مے لوجی بات یہاں تک آپہنچی ہے کہ اب صاحبزادے گھر میں لا کر پینے لگے ہیں۔ تم اپنی ضد پر اڑے رہو وہ خود کو تباہ کرتا رہے گا اور میں بیٹی دیکھتی رہوں گی۔ قسمت کیا کیا دکھاتی ہے لیکن قسمت پر الزام کیوں دھروں تم بہت پیسے والے ہو نا اس لیے میرا اور میری اولاد کا مقدر بن بیٹھے ہو۔“

خاں صاحب خانم اور اولاد کے مقدر تو تھے ہی۔ صوفے پر پڑے پڑے رات گئے دیر تک ملکیں جھپکاتے رہے وظیفہ پڑھنے کے لیے بھی آج وہ کمرے میں دیر تک بند رہے تھے۔ خاں صاحب اسی کمرے میں پورے سکون کے ساتھ اپنے کاروبار کا حساب کتاب کرتے تھے۔ وظیفہ پڑھتے تھے۔ ایسے مواقع پر سوائے خانم کے کسی کو اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ہاں کبھی کبھی خاں صاحب کی پسندیدہ چھوٹی بھینس اس کمرے میں رہے پاؤں داخل ہو جاتی تھی۔ کیوں کہ وہ عام ملازموں کی طرح گندہ نہیں رہتی تھی۔ خانم اور خاں صاحب کی منہ چڑھی تھی۔ لیکن ایسے مواقع شاذ آئے اور ایسا عموماً اس وقت ہوتا جب خانم گھر پر نہ رہتیں۔ آج خاں صاحب اسی کمرے میں بند دیر تک اپنے کاروبار میں لگے رہے جب فارغ ہوئے تو کمرے کا دروازہ کھول کر باہر صحن میں نکل آئے۔ خانم دلال میں تخت پر لیٹی ہوئی انھیں ٹکلی باندھے دیکھتی رہیں۔ خاں صاحب پام کے درخت کی طنفر پڑے تو خانم نے انھیں اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیا اور گوری چڑی والی فرنگ کو بددعائیں دینے لگیں تاکہ ان کی برہمی سے خاں صاحب واقف ہو جائیں۔ لیکن خاں صاحب پام کے درختوں کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ پام کے چوڑے چکے، چکے اور نرم پتے پر اپنا ہاتھ کچھ دیر اس طرح پھینکتے رہے جیسے کسی کے گالوں کو سہلا رہے ہیں۔ پھر جانے انھیں کیا

سو جی جھٹکا مار کر ایک پتا توڑ لیا۔ دونوں ہاتھوں میں پام کے پتے کو کھلے ہوئے اخبار کی طرح بٹھامے ہوئے گھورتے رہے۔ خانم نے منہ پھیر کر یہ سب دیکھا تو ان کے سینے میں انکارے دھکنے لگے۔ کہنے لگیں ”کسی یار کے ساتھ لندن میں مزے کر رہی ہو گی وہ تو تمہیں پام کے درختوں سے لپٹ کر رونے کے لیے چھوڑ گئی ہے۔ رنڈی نے پودے بھجوائے تھے تو میرے گھر کی زمین میں اس کی جڑیں کیوں پیوست کر دیں۔ ایک پتنے سے کیا ہو گا۔ سارا درخت اکھاڑ کر اپنے سینے میں لگا لو۔ دل و جگر کا خون پی پی کر یہ پودے غروب چلیں گے پھولیں گے“ خاں صاحب چونکے اور خواب گاہ کا راستہ لینے کی بجائے لمبے لمبے دگ بھرتے پھر اسی نحر ٹوالے کمرے میں داخل ہو گئے۔ رات صوفے پر پڑے پڑے گذاری خانم نے بھی پوچھ چک نہ کی۔

صبح ناشتے پر خاں صاحب نے خانم سے سرگوشی کرنے کے انداز میں کہا ”بھئی جب اسلم خاں کی خواہش اور تمہاری مرضی ہے تو لا لونڈیا کو بھٹک کر میرے خواب ادھورے ہیں تو ادھورے ہی ہیں لیکن خانم تم بچھتاو گی اس رشتے سے۔ شادی کے ٹھکانے تو مہل کیا ہو سکیں گے بس چپکے سے نکاح کے دیول پڑھوا کر اٹھا لو۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے تو مجھے غم نہ ہو گا۔ کہہ دوں گا کہ صاحبزادے مرے جارہے تھے لونڈیا پر“ خانم نے جب دیکھا کہ خاں صاحب پوری ذمہ داری ان کو سونپ کر خود بری الذمہ

ہو رہے ہیں تو وہ پھر غرائیں ”مجھے کچھ خوشی نہیں ہے کہ فیقر کی گڈری میں لعل تلاش کرنی پھروں۔ میں نے کب ان کی چو کوٹ پریشانی رگڑی ہے کہ وہ اپنی چاندی ٹیٹی کو میری بہو بنا دیں۔ مجھے تو خیال ہے بس تمہاری اولاد کا۔ سر پھراتو ہے ہی۔ زندگی برباد کرتا ہے گاہ، اور پھر آج کل وہ یوں بھی راستہ بھٹک گیا ہے۔ ادٹ پٹا ہگ کبنا

ہے۔ معلوم نہیں کونسی کونسی انگریزی کتابیں پڑھتا ہے۔ نئے نئے جلسوں اور جلسوں میں شامل رہتا ہے اور گھر آکر مجھے بات بات پر ٹوکتا ہے۔ گولی نے پانی ملا ہوا دودھ دیا، میں نے گولی کو ڈانٹا، اور صاحبزادے بیچ میں کود پڑے۔ کہنے لگا امی تین دن بوا اور خداداد خاں دونوں کے سامنے غریب نے دودھ دھویا ہے۔ چار چار آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ دودھ میں پانی کیسے ملا سکتا ہے مچھلا۔ آپ اس طرح برسہا ہوتی ہیں جیسے آپ کے گھر کا زر خرید غلام ہی تو ہے۔۔۔ بے چارہ۔۔۔ میں نے کہا میاں تم چیپ رہو، ابھی سچہ ہو۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ کافر پر کبھی سہرہ نہ کرنا۔ بس اتنی سی بات تھی میری جان پر ہی تو بن گئی۔ لگا مجھ سے جھٹس کرنے۔ کہنے لگا بد معاش مسلمانوں سے نیک منش کافر لاکھ درج بہتر ہیں۔ جنت پہلے تو ہے نہیں اور اگر ہے سچی تو اللہ یا رھاں جیسے ڈاکو دوزخ میں جلیں گے اور گولی سیدھا جنت میں چلا جائے گا، کیوں کہ وہ آپ کو سو فیصد خالص دودھ دیتا ہے اور اس کے باوجود آپ کی بری سبلی سر جھکا کر سن لیتا ہے کیوں کہ وہ بھی تلخ جواب دے گا تو آپ کا دل دکھے گا، اور وہ دل دکھانا نہیں چاہتا۔ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی آدمی کو سمجھے اور آدمی آدمی کی عزت کرے۔“

”پچھلے دن خداداد خاں مچھلی بارہ لٹے پونڈ نہیں چودہ آنے پونڈ لایا۔ میں نے ذرا جھڑپا۔ وہ مسکرتہ منہ لگنے لگا تو میں نے غصہ میں اس کو حرامزادے اور ذلیل کہا بس اتنی سی بات پر صاحبزادے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ خداداد خاں کو پچھکار کر باہر بھجوا دیا اور لگے مجھ سے جھٹ کرنے کہ امی آپ نے اُسے گالیاں کیوں دیں۔ میں نے جو خود اس پر گالیاں کی بوجھار کی ہے تو مجھ سے لپٹ گیا اور کہنے لگا کہ اچھے

اجلی پر چھائیاں آدمی اور آدمی

آدمی گالی گلوچ نہیں کرتے امی۔ میں نے سمجھایا کہ میاں جتنی ذات ہوتی ہی بات کرنی چاہیے۔ تمھاری نانی اماں کو اتنا غصہ تھا کہ وہ اچھے بھلے ملازم کو نہ صرف ماں بہن کی سنائیں بلکہ زیادہ برہم ہو جاتیں تو آنکھوں میں مہرچ لگوا دیتیں یا بید کی چھڑیاں پانی میں جھگو کر شٹراپ شٹراپ چوڑوں پر رسید کروا دیتیں۔ سارے نوکر آواز ہی سے کانپ کانپ جاتے تھے۔ مگر کا انتظام درارعب ہی سے چلتا ہے۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ یہ سن کر مجھ سے اتنی گستاخی پر اترا آئے گا۔ کہنے لگا نانی اماں اب ہوتیں تو ان کی آواز سے کانپنے والے نوکر مہرچ انھیں کی آنکھوں میں جھونک دیتے۔ بھیگی ہوئی بید کی چھڑیاں ان کے ہاتھ سے حصین کر توڑ دی جاتیں یا کیا عجب انھیں پر برس پڑتیں۔ یہ سراسر ظلم ہے امی۔ اور اکیسی کا ظلم کسی پر روانہ رہے گا۔ آج خداداد خاں تمھاری گالیوں کو سہہ لیتا ہے۔ کل خداداد خاں کے بچے میرے بچوں کو گالیوں کا جواب گالیوں سے دیں گے اور میں اس دن کے انتظار میں ہوں۔“

لوجی چار دن کا لونڈا ہمارے اطوار سدھارنے چلا ہے۔ عقل ماری گئی ہے اور کچھ نہیں۔ اور اس خرابی کی جڑ وہی انگریزی کتابیں ہیں جو وہ پڑھتا رہتا ہے۔ میں تو کہوں گی ان انگریزوں نے ناس کر دیا ہے ہمارا۔ اس فرنگی رندی نے تمھیں تباہ کیا اور اب اس کی زبان تمھارے بیٹے کو تباہ کر رہی ہے۔“

خاں صاحب ساری باتیں غور سے سنتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ خانم سب کچھ کہیں تو وہ بھی اپنے صاحبزادے کے چال چلن پر کڑی تنقید کریں۔ کیوں کہ اب خانم ان کی ہم زبان تھیں۔ اس لیے انھیں کچھ خطرہ نہ تھا لیکن خلاف توقع جب خانم نے فرنگی کو رندی کہہ کر بات ختم کی تو خاں صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ گفتگو کا رخ پھیر دیں۔

اجلی پرچائیاں آدمی اور آدمی

کہنے لگے خانم ایک آدھ لیموں تو افشردہ بنا دینا۔ سارا بدن دکھ رہا ہے۔ طبیعت بڑی مضحک ہے۔ خانم نے خاں صاحب کو گھور کر دیکھا۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ بات پھر فرنگی رندی تک پہنچے گی نظریں جھکا لیں۔

نکاح کے دو بول پڑھو اگر خانم لوٹ دیا کو اپنے گھر نہ لاسکیں۔ لڑکی والے غریب تھے تو کیا ہوا۔ انہیں بھی عزت و ناموس کا پاس تھا۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ وہ چٹ سنگنی پٹ بیاہ کرنے کے موقف میں نہیں ہیں۔ جب ان کے حالات اجازت دیں گے تب دیکھا جائے گا۔ خانم اور خاں صاحب نے تو لڑکی والوں کے اس انکار کو غیبی امداد سمجھا اور دل ہی دل میں اللہ میاں کا شکر ادا کیا۔ لیکن اسلم خاں فکر مند ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی والے اپنی عزت کا تابوت اٹھائے صدیاں گزار دیں گے اور ان کے حالات انہیں عمر بھر اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنی بیٹی کو اسلم خاں کی دلہن بنا سکیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خاں صاحب کسی قیمت پر دو طرفہ خرچ کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتے کیوں کہ نہ تو انہیں یہ رشتہ ہی پسند تھا اور نہ ہی اس کے وہ راستے پسند تھے جن پر ان کی دانستہ میں وہ بھٹک رہا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ اسلم خاں گستاخ اور کینہ ہو گیا ہے۔ ان کے پوزیشن اور رٹمول نے جو عداوت بڑی محنت اور مشکل سے کٹڑی کی ہے وہ اسلم خاں کے ہاتھوں اڑا ڈھم ہو کر ڈھسے جائے گی۔ اسی وجہ سے خاں صاحب چاہتے تھے کہ اسلم خاں کے پیروں میں فولاد کی نہیں بلکہ سونے کی زنجیر پہنا دی جائے۔ وہ جہاں دیدہ جو تھے۔ ان کو اپنے تجربات کی روشنی میں اسی کا علم تھا کہ سونے کی نرم ملائم اور چمکدار بیڑیوں کو توڑ کر پھینک دینا ہر نوجوان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اسلم خاں بھی تو آخر خاں صاحب ہی کا بیٹا تھا۔ وہ ان کے ہر راؤ و پچ سے واقف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب جب کہ خاں صاحب نے

بادلِ نخواستہ ہی سہی لیکن اس رشتے کو منظور کر لیا ہے تو جھٹ پٹ سارے مسائل کا حل نکال ہی لینا چاہیے۔ ذرا چوک ہوئی اور خاں صاحب کو کہیں سے سونے کی بیڑیوں کی امید بندھی تو وہ اپنے ارا مانوں کا جنازہ اٹھائے پھرتا رہے گا۔

اس نے اپنے ایک رشتہ دار سے ساز باز کی، دلہن والوں کے پاس خاں صاحب کی جانب سے بہت ہی لجاجت اور انکساری سے کہلا بھیجا کہ ”شادی میں ہمیں عجلت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس نیک کام سے فراغت پا کر ہم دونوں میاں بیوی حج کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے غیاب میں اسلم میاں تنہا ہو جائیں گے اور پھر اتنے بڑے گھر بار کی دیکھ بھال بہو کے سوا کون کر سکتا ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو کچھ دن توقف کر لینے میں بھی ہمیں تامل نہ ہوتا۔ آپ ہمیں اپنا سمجھیں۔ اللہ کا دیا جو کچھ ہے وہ بیٹے اور بہو ہی کا تو ہے شادی میں کرو فر اور ٹھاٹ باٹ کرنے کے ہم قائل نہیں ہیں اور پھر زمانے کا تقاضا یہی ہے کہ فضول خرچی سے گریز کیا جائے۔ یہی پیسہ کل آپ کی بیٹی ہی کے کام آئے گا۔ ہم قبر میں دولت ساتھ لے جانے سے تو رہے۔ بس ہزار ڈیڑھ ہزار قرض آپ قبول کر لیجیے حالات جب بھی سازگار ہوں خوشی سے ادا کر دیجئے۔“

پیام میں خلوص تھا۔ محبت تھی۔ بات دلہن والوں کی سمجھ میں آگئی۔ اور حرمیاں اسلم خاں نے تمیزن کو لالچ دے کر خاں صاحب کی پیک بک حاصل کر لی۔ انعام کے ساتھ انھیں یقین بھی دلایا کہ اگر بھانڈا اچھوٹ بھی جائے تو وہ تمیزن بی بی پر آچ نہ آنے دیں گے تمیزن بی بی جانتی تھیں کہ اسلم میاں جتنے چلتے ہوئے ہیں اتنے ہی غریبوں کے ہمدرد اور بات کے پکے ہیں اور پھر تمیزن بی بی کے لیے یہ کام کوئی بڑا کام نہ تھا۔ باپ کی دولت کا جائز حق دار بیٹا ہی تو ہے وہ کون ایسا بڑا لگاؤ کرنے چلی ہیں جو ان کا ضمیر انھیں کچھ کے دیتا

دوسرے دن چمک بک اسلم خاں کے ہاتھ میں تھی۔ خاں صاحب کے جعلی دستخط ثبت کر کے شام ہوتے ہوتے اس نے چمک کیش کر والیا اور رقم دلہن والوں تک پہنچا دی گئی۔

دلہن سسرال آئی تو ایک ہی دن میں اس نے محسوس کر لیا کہ اس کی سسکیاں بھرتی ہوئی ماں نے اس کو اپنے سے جدا کرنے وقت جس جنت کا نقشہ اس کے سامنے کھینچا تھا وہ جنت کم سے کم اس دنیا میں کبھی اس کو حاصل نہ ہو سکے گی۔ جملہ غریبی میں اس کی جھکی جھکی اور شرعی آنکھیں جب بھی اوپر اٹھیں تو وہ محسوس کرتی کہ اس کی روج اس کمرے میں بھٹکتی پھر رہی ہے جس کو لمحہ بھر کے لیے سہارا دے کر اسلم خاں نے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ اس کی ناداری کا وہ احساس جو اس کے بچپن سے لے کر اس کی جوانی تک اس کے ساتھ ساتھ پرورش پاتا رہا تھا آج جیسے وہ اسی احساس کے ساتھ بیاہ دی گئی تھی۔

اپنے کمرے میں گھونگھٹ میں سر جھکائے ہوئے اس نے سُن لیا تھا کہ خاں صاحب اسلم خاں پر بری طرح برہم ہو رہے تھے۔ اسلم خاں نے نہایت ڈھٹائی سے اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے خاں صاحب کے جعلی دستخط سے بنک سے روپیہ حاصل کیا تھا۔ خاں صاحب جو الاکھی بنے ہوئے تھے لیکن اسلم خاں نے اپنی اس حرکت کا پوری طرح خاں صاحب ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا جیسے دو آتش فشاں اپنا اپنا لاوا ایک دوسرے پر اچھال اچھال کر خوفناک تہقے مار رہے ہیں اور وہ یکے دوسرے دونوں کے بیچ میں پھنسی ہوئی اپنی آنکھوں سے مسلسل بہتے ہوئے پانی کے ٹھنڈے قطروں سے بھڑکتے ہوئے جیسا کہ شعلوں کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے لیکن بہت

اُجلی پر چھایاں آدمی اور آدمی

جلد اس نے دیکھ لیا کہ جس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ اپنی آنکھوں کا سارا خزانہ لٹا رہی تھی اس آگ نے خود بڑھ کر اس کی آنکھوں کا سارا پانی بھسم کر کے رکھ دیا ہے اور اب وہ اس دولت سے بھی محروم ہو گئی ہے جو تنہائی میں اس کی رفیق تھی اور جو درد کا دواں تھی۔ غم کا دوا تھی، زخم کا مرہم تھی۔

دو روز سے اسلم خاں نئی دہلی کو چھوڑ کر غائب تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خون آلودہ گٹھری کی طرح اپنے پلنگ پر پڑی رہتی جیسے کسی عورت کو خنجر سے بے طرح زخمی کر کے نیم مردہ حالت میں کمرے میں پھینک دیا گیا ہو جس کے بدن سے تازہ خون پس پس کر اس کے پیرن کو گلزار بنا رہا ہو۔

ایک رات خانم نے دہلی کے کمرے سے سسکیوں کی آواز سنی۔ اندھیرے میں راستہ ٹھولتی وہ دہلی کے کمرے تک پہنچی اور کان کو اڑوں سے لگا دیئے۔ خانم کے پلے کچھ بھی نہ پڑا تو اسنوں نے کانوں کو قابل اعتناء سمجھا اور دروازے کی دراز میں سے ان کی نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ اسلم خاں دہلی کی گود میں سر چھپائے سسکیاں لے رہا تھا اور دہلی کی آنکھیں اسلم خاں کے گالوں کو آنسوؤں سے بہلا رہی تھیں۔ اسلم خاں کو بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہوا دیکھ کر خانم کے پندار کو ٹھیس لگی۔ وہ سوچتی رہیں کہ اپنے باپ سے زبان درازی کرتے ہوئے تو اسلم خاں نہیں چوکتا اور آج دو دھڑی کی چھوڑی کے گود میں پڑا نامردوں کی طرح سسکیاں لے رہا ہے۔ لیکن دوسری لمحے خانم اپنے تدبیر اور سیاست پر بہت خوش ہوئیں۔ اسنوں نے سوچا کہ اب اسلم خاں اپنی باغیانہ روش ترک کر کے پالتو جانوروں کی طرح خاں صاحب کی سرد گرم چپ چاپ سہہ لے گا۔ باپ کی آنکھوں کے تنکے کو شہتیر سمجھنے والا اب شہتیر کو تنکا برابر بھی اہمیت

نہ دے گا، اور پھر ایک دوپٹے جہنم لے لیں تو اسلم خاں اپنی واہی بتا ہی بکواس چھوڑ کر اللہ کی رستی کو مضبوطی سے متحام لے گا اور کیا عجب کہ خاں صاحب کو نماز اور روزے کے لیے نصیحت نہ کرنا پڑے۔ خانم نے محسوس کیا جیسے اسلم خاں دلہن کی گود میں سر رکھے نماز ادا کر رہا ہے لیکن فوری دل ہی دل میں انہوں نے اس فاسد خیال سے توبہ کر لی جانے وہ ادھر کیا کیا سوچتی رہتیں لیکن اسلم خاں کی آواز نے انہیں چرک کا دیا۔ ٹھنڈے پانی کا خالی گلاس جب دلہن نے اسلم خاں کے ہونٹوں سے ہٹایا تو اسلم خاں نے ایک لمبی سر دآہ کھینچ کر دلہن سے کہا "اب میں تم کو اس گھر کے بے رحم ماحول میں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں نام ہوں تمہارا مقصود وار ہوں۔ میں نے تم سے بیاد کر کے اس گھر میں ایک مظلوم انسان کا اضافہ کیا ہے۔ میں نے تمہاری مغلسی سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن تم یقین کرو کہ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت تھی ورنہ ہو سکتا ہے کہ اس زبردست ماحول میں میں گھٹ گھٹ کر مر جاتا۔ اب میں تمہارے لیے زندہ رہوں گا۔ زندگی کے غم ہم جل کر بانٹ لیں گے کیوں کہ یہاں تم کو اتنے بڑے گھر کی اکلوتی بہو کی حیثیت سے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ دولت نہیں مل سکتی، حکومت نہیں مل سکتی، یہاں تک کہ محبت بھی نہیں مل سکتی۔ میسر باپ کے دل میں زندگی کی کسی شے کے لیے محبت کی رفق بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اس کو میری ماں سے محبت نہیں ہے، اس کو مجھ سے محبت نہیں ہے پتہ نہیں اس کو..... اپنے آپ سے بھی محبت ہے یا نہیں میری ماں سے صرف اس لیے اس کی کئی دبتی ہے کہ اس نے اپنی ساری دولت میسر بڑے ماموں کی سرپرستی میں کمائی ہے اور اسی لیے وہ اپنی دولت میں میری ماں کو بھی چھوٹا موٹا حصہ دار سمجھتا ہے۔ لیکن میں اس وقت بہت دلکشی ہو جاتا ہوں

جب سوچتا ہوں کہ میسر باپ کی دولت میری ماں کی مانتا کو خرید لینے میں کس طرح سہایا ہوگئی۔ تم کہو گی کہ میں اپنے ماں باپ سے زیادتی کر رہا ہوں، تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ اس عمر میں مجھے اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہونا چاہئے تھا۔ دولت میسر باپ نے کمائی ہے۔ میں نے نہیں کمائی تو مجھے اس کا حق بھی نہیں پہنچتا کہ اس کے برتنے پر اترتا پھروں۔ تم اگر اس طرح سوچ رہی ہو تو ایک حد تک صحیح سوچ رہی ہو لیکن میں نے اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ میرا دوش صرف اس قدر ہے کہ میں نے اپنے اصولوں کو اپنے نظریات کو اپنے باپ سے شکست کھا کر اس کے آگے سپردال دینے سے بچا رکھا ہے۔ میرا قصور یہی ہے کہ میں نے اپنے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے باپ سے بغاوت کی ہے۔ میسر باپ نے میری مرضی کے خلاف کافی رشوت دے کر مجھے محکمہ پولیس میں ایک اچھی سی خدمت دلوادی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے میرے لیے بھی زندگی کے وہی راستے چنے تھے جن پر چل کر میں بہت متمول ہو سکتا تھا، جن پر چل کر میں بھی سوسائٹی میں ایک اونچا مقام حاصل کر سکتا تھا۔ میسر نے بھی یہ سارے امکانات تھے اور ان دنوں میرا باپ مجھ سے بہت خوش تھا۔ بچپن ہی سے میں نے اپنے ہاتھ میں بندوق اٹھالی تھی۔ بندوق میرا بچپن تھی۔ بندوق میری جوانی تھی۔ بندوق میرا فن — پھر ایک تاریک رات کو میسر آقاؤں نے مجھ سے سہرگوشی کی۔ حکم دیا کہ میں اپنے اس فن سے ساری انسانیت کے سینے کو چھلنی کی طرح چھید دوں — سبھو کے ننگے، ذلیل اور کینے انسانوں کی ایک چھوٹی سی دنیا نے میسر خداؤں کی نینداڑادی تھی۔ میسر خداؤں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کی آنکھوں سے چرائی ہوئی نیندیں واپس لا دوں کیوں کہ ذلیل انسانوں نے صرف اس لیے ان کی نیندیں چرائیں کہ

اٹلی پر چھائیاں آدمی اور آدمی

میرے خداؤں نے ان کمینوں کے ہونٹوں کی شادابی پر ہر بچہ بٹھا رکھے تھے۔ ان کی ہنسیوں کو انھیں کے کپکپاتے ہونٹوں میں دفن کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھڑکنوں پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی روشنیاں گہرا اندھیروں کے نیچے چھادی تھیں۔ ان کے خالی پیٹوں کے اندر دانہ گندم کے عوض آتش و باروت بھر دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ لیکن آج یہ سارے ذلیل و خوار انسان اپنی کہیں نگاہوں سے باہر نکل آئے تھے اور انھوں نے ایک آواز ہو کر آج اپنے ہونٹوں کی شادابی مانگی تھی۔ اپنی مسکراہٹوں کی زندگی مانگی تھی۔ اپنے دل کی دھڑکنیں مانگی تھیں، اپنی آنکھوں کی روشنیاں مانگی تھیں۔ اپنے خالی پیٹوں کے لیے دانہ گندم مانگا تھا، اور غضب تو یہ ہے کہ انھوں نے یہ ساری چیزیں سجاوت سے نہیں مانگیں ہاتھ پھیلا کر نہیں مانگیں بلکہ برہم ہو کر مانگی تھیں، دھمکا کر اور للکار کر مانگی تھیں۔ بادل کی طرح گرج کر مانگی تھیں اور اس گرج نے میسر خداؤں کی نیند اڑا دی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ اگر آج میں انھیں کمینوں کی صف میں ہوتا تو اپنے خداؤں کی ویران آنکھوں کے لیے ابدی نیند فراہم کر دیتا جو اس وقت میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے بندوق پھینک دی اور قلم اٹھا کر نوکری کے لیے استغفا لکھ کر چلا آیا۔ دوسرے دن شبہ پر گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن میرے باپ نے ضمانت دے کر مجھے رہا کر دیا۔ اس کے بعد پھر مجھے کوئی نوکری نہ مل سکی، کوئی کام نہ مل سکا اور آج سو سائٹی میں میرا کوئی مقام نہیں ہے۔ میرا ہی خاندان مجھے خاں صاحب کا آوارہ اور نکمّا لونڈا کے خوبصورت نام سے یاد کرتا ہے۔ اور آج تم اس آوارہ اور نکمے لونڈے کی بیوی بن کر خاں صاحب کے اتنے بڑے گھر میں آئی ہو۔ یہاں تمھارا کچھ بھی نہیں ہے، یہاں میرا کچھ بھی

اجلی پر چھائیائیں آدمی اور آدمی

ہیں۔ لیکن میں نے خود کو خالص صاحب کی دست برد سے بچا رکھا ہے اور آج تم سے میری یہی التجا ہے کہ اس ماحول کی نفرتی چکا چوند میں اپنی آنکھوں کو چندھیانہ دینا جس دن تم خاں صاحب کے ہاتھوں بک جاؤ گی وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔
خانم کو اڑ سے کان لگاٹے سنتی رہیں، کچھ سوچتی رہیں، کچھ اونگھتی رہیں۔ صبح دیر سے بیدار ہوئیں تو خاں صاحب ناشتے پر ان کے منتظر تھے۔ خانم نے ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے خاں صاحب سے کہا کہ تم اب بھی میری فراست کے قائل ہو یا نہیں میں نہ کہتی تھی کہ اسلم کے پیر جکڑ دو۔ وہ رات کو گھر لوٹ آیا ہے اور اب دیکھنا اس کے پاؤں کا چکر گھر کی اس چار دیواری تک محدود رہے گا۔ خاں صاحب کو اس سے مطلب نہ تھا کہ اب اس کے پاؤں کا چکر گھر کی چار دیواری تک محدود رہے یا شہر شہر کی حدود میں لگتا رہے۔

دن گذرتے گئے تو خانم کو اپنی فراست کا یقین ہو تا گیا۔ اسلم خاں کے پاؤں کا چکر نہ صرف گھر کی چار دیواری بلکہ اس کے کمرے کی چار دیواری ہی تک محدود ہو گیا تھا۔ وہ دن دن بھر یا تو پرتھو پرتھو یا پھر اپنی بیوی سے تاش کیلٹا رہتا۔ کبھی کبھار گھڑی دو گھڑی کے لیے ادھر ادھر دوستوں سے مل کر آتا لیکن اکثر دوست اجاب خود اس کے پاس آ جاتے۔ البتہ خاں صاحب اور خانم کو یہ مشترکہ شکایت اس سے ضرور رہتی کہ وہ اپنے سارے دوست اجاب کو اپنے ہی کمرے میں بلاروک ٹوک بلا لیتا اور اس کی بیوی کسی سے پردہ نہ کرتی، اور پھر اسلم خاں کے دوست بھی تو بھانت بھانت کے بہرہ ویہ دکھائی دیتے لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی۔ سب کے سب چرب زبان تھے۔ دنیا جہاں کی باتیں کرتے اور ایسی ہی باتیں کرتے جو نہ خانم کے سمجھ میں آتی اور نہ خاں صاحب

ہی کے بس ایسا معلوم ہوتا جیسے سارے جہاں کا دکھ اسلام میاں اور ان کے دوستوں کے دل میں آن بسا ہے۔ ایک عالم کی فکر ان سب کو کھٹے جا رہی ہے۔ جوانی کبھی خاں صاحب پر مبنی تو آئی تھی۔ کیسے کیسے نواب زادے اور اونچے گھرانوں کے لڑکے ان کے دوست تھے۔ جب کبھی جمع ہوتے پیاری جان، سبزہ جان، جدن بائی، کچن بائی سب کی سب گفتگو کا موضوع بنی رشتیں پھر بیچ بیچ میں کیا کیا فتنے بازی ہوتی کہ خان کو لڑکوں کا ناکھاتے ہی شرم جاتیں۔ لجا کر عرق عرق ہو جاتیں لیکن اسلام میاں کے دوستوں کی نسبت یہ شہرت عام تھی کہ اکثر جیل سبکدہ کر آئے ہیں۔ قیر کاٹ کر آئے ہیں خاں صاحب اور ان کے دوستوں کی مردانگی کے قصے چھڑتے تو کوٹھڑوں کا تذکرہ ہوتا شہر کی بڑی بڑی طوائفوں کی بات چھڑتی اور آج اسلام خاں اور ان کے دوستوں کی مردانگی اور بہادری کے تذکرے ہوتے ہیں تو جیل کی سزائوں اور صعوبتوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ جلسوں اور جلوسوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ خان سوچتے کہ دنیا کا رنگ کتنا تیزی سے بدل رہا ہے۔ آج کا انسان انھیں کل کے انسان سے ذرا مختلف سا نظر آتا۔ اسلام میاں اور ان کے دوستوں کو دیکھ کر خان کو اپنے شبہات یقین کی صورت میں بدلتے ہوئے معلوم ہوتے لیکن ان کا دل نہ مانا کہ انسان اللہ سے دور ہو کر سچی نیکی کی طرف جاسکتا ہے۔

اسلام خاں نے اسی کمرے میں کتابیں پڑھتے اور ناش کھیلے ہوئے کئی چھوٹی چھوٹی زندگیوں کا اضافہ کر دیا۔ دلہن جب سچی امید سے ہوتی تو خان مصلاً بچھا بچھا کر لڑائی کہ اسلام خاں بیٹے کے باپ نہیں اور خاں صاحب کا نام رتہی دنیا تک زندہ رہے۔ لیکن جیسے دلہن نے بیٹے کو جنم نہ دیئے کی قسم کھا رکھی تھی۔ خاں صاحب کو ان باتوں سے کوئی

مطلب ہی نہ تھا۔ خانم البتہ کبھی کبھی سوچتیں کہ اسلم خاں کی دوسری شادی کی جائے۔
 ولین کے بطن سے اولاد نہ رہنے کا انہیں قریب قریب یقین ہو گیا تھا لیکن خانم کی
 یہ حسرت دل ہی میں رہی۔ ولین بیٹیاں جتنی رہیں اور اسلم خاں کتابیں پڑھتے رہے۔ خانم
 بے چاری مصلے بچھاتی اور تہہ کرتی رہیں۔

اب تو خانم اس بات کی جرات بھی نہ کر سکتی تھیں کہ اپنے بیٹے سے دوسری شادی
 کی بات ہی چھڑتیں۔ کیوں کہ اب تو وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہو گیا تھا۔ خانم کا دست نگر
 مقابلی بھی وہ ہمت نہ کر سکیں اور اب تو وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھیں کیوں کہ اسلم خاں
 یکایک ایک ہوٹل کا منیجر ہو گیا تھا اسلم خاں کے ایک کھاتے پیتے دوست نے کافی پیسہ خرچ
 کر کے اسلم خاں کے ساجھے میں ہوٹل کا کاروبار شروع کیا تھا۔ سمجھوتہ اس طرح ہوا
 کہ اسلم خاں ہوٹل کے سارے کاروبار انجام دے گا اور جو کچھ منافع ہو گا اس میں
 ایک تہائی کا حصہ دار رہے گا۔ محمد ار خاں اسلم خاں کا بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ جانتا
 تھا کہ اسلم خاں کس قدر قابل اعتماد آدمی ہے۔ ہوٹل کا دھندہ شروع کرنے کے بعد
 اس نے پھر کبھی پلٹ کر بھی ہوٹل کا رخ نہ کیا اور اپنے دوسرے کاروبار میں ابھار ہا ہر راہ
 ہزار بارہ سو روپے محمد ار خاں کو گھر بیٹھے ہوٹل کا منافع مل جاتا۔ اسلم خاں کے حالات بھی
 بہت اطمینان بخش ہو گئے تھے۔ اس کی بچیاں اچھے سے اسکول میں شریک کر دی گئی
 تھیں۔ اس کی بیوی کا نکلس اس کی صراحی دار گردن کے حسن میں اضافہ کرنے کے لیے
 سیٹھ کی تجویز سے واپس لے لیا گیا تھا۔ اس کی انگوٹھیاں اس کی محرومی انگلیوں میں
 پھر جگہ جگہ لگی تھیں جن کو ایک سیٹھی کے پاس رہن رکھتے وقت اسلم خاں نے اپنی
 بیوی سے کہا تھا کہ تمہاری انگوٹھیاں تمہاری انگلیوں میں اس لیے بہت قیمتی ہو جاتی

ہیں کہ تمھاری انگلیوں کا حن بھی نقلی ہے۔ سکر کی تاباکی میں شامل ہو جاتا ہے لیکن جوں ہی یہ انگوٹھیاں تمھاری انگلیوں سے الگ کر لی جاتی ہیں تو کوئی سیٹھ سا ہو کارا نہیں پچاس ساتھیں بھی نہیں پوچھتا۔ اسلم خاں ہوٹل کا میجر ہو گیا تو اس نے پھر ان انگوٹھیوں کو انمول بنادیا۔ اس ہوٹل نے جہاں اسلم خاں کی زندگی کا رخ بدلا وہیں اس کے نادار دوستوں کی جیب بھی بھری، ان کا تن بھی ڈھانکا، بیماری میں ان کو صحت بھی بخشی لیکن ڈیڑھ سال تک اسلم خاں کی زندگی کو بے پناہ خوشیوں سے ہمکنار کر کے اس ہوٹل نے بھی آج دم توڑ دیا تھا۔

کال بل خاموش ہو گئی تھی۔

ریڈیو ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

اور اس کی زندگی بھی پھر کسی بریلی چٹان کے پیچھے دب کر منجمد ہو گئی تھی۔ اور اس نقطہء انجماد کو کسی سیال آگ کے سہارے زندگی کی حرارت بخشنے کے لیے اس نے آج پھر ایک اسکاچ حسینہ کا دامن ستھام لیا تھا۔

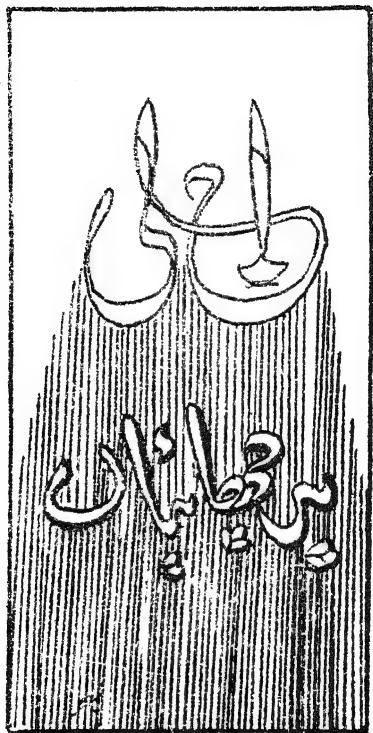
ہوٹل بند ہو گیا تو اسلم خاں کی زندگی بھی ایک ڈگر پر جیسے گھسٹنے لگی۔ اب نہ اس کی بغاوتیں تھیں نہ خاں صاحب کی برہمی۔ اسلم خاں نے زندگی کی جدوجہد میں ہر وقت ناکامی کا منہ دیکھا تھا، اور چپکے چپکے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ خاں صاحب کے رحم و کرم پر عمر کا زین حصہ گزار دینے کے بعد اس نے زندگی کی یکسانیت سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ایک گھٹن ایک بیزاری کا احساس ہمیشہ اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ کچھ کرنے کی خواہش نے کچھ نہ کر سکنے کی حسرتوں کا کفن اوڑھ لیا تھا، اور یہ حسرتیں اسلم خاں کے سینے میں دھیمی دھیمی آگ لگائے رکھتیں۔ اس کو بار بار اپنی غلطی کا احساس ہوتا کہ

اپنے ساتھ ساتھ تائیکوں میں بھٹکنے کے لیے اس نے اس دنیا میں اور بھی زندگیوں کا اضافہ کر دیا ہے جن کا نہ کوئی حال ہے نہ کوئی مستقبل اور اب یہی چلائی ہوئی ویرانیاں اور پرچختے ہوئے سناٹے اس کا مقدر بن گئے ہیں۔ اس کی زندگی بن گئے ہیں۔ اس کی موت بن جائیں گے۔ ان ویرانیوں اور سناٹوں سے بغاوت کرنے کی اب اسلم خاں میں سکتا نہ تھی۔ اس کی بچیاں اسکول کی تعلیم سے اس لیے محروم کر دی گئی تھیں کہ خاں صاحب کو یہ بات گوارا نہ تھی یا مصلحتاً انھوں نے اس کو گوارا نہ کیا تھا۔

لیکن ایک دن اسلم خاں اپنی بیمار بچی کو سینے سے چمٹائے ہوئے سسکیاں لیتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ ڈاکٹر نے دوا لگانے میں فوری شرکت کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ بچی کو طویل المیعاد، ٹائفاؤڈ میں آنتوں کی دق ہو گئی ہے۔ اسلم خاں نے اسی نظروں سے باپ کو دیکھا جیسے اپنی لاڈلی بچی کی زندگی کی سببیک مانگ رہا ہو۔ خاں صاحب کا چہرہ اس کی ملتی نظروں کی زد میں باسی پھول کی طرح کھلا گیا۔ لیکن انھوں نے دوسرے ہی لمحے میں اپنے خضاب چڑھتے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرنے ہوئے کہا ”اسلم خاں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ وہ کسی پر مہربان ہوتا ہے تو اپنے پیاروں کو مصو بتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہمتاری آزمائش شاید اس کو اسی طرح مقصود ہے۔ اپنے کیے پر دل سے شرمندہ ہو کر اس کی بارگاہ میں گر گراؤ۔“ باب اجابت دہا ہوا ہے گا۔ موت زندگی خدا کے ہاتھ ہے بیٹا۔ آدمی عاجز ہے، مجبور محض ہے، مجھے جائیداد کا ٹیکس ادا کرنا نہ ہوتا تو میں بیٹا کے لیے کرائے کا دار ڈبھی لے لیتا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے جھلا۔ وہی ڈاکٹر ہوں گے ویسی ہی دیکھ بھال ہوگی۔ عام دار ڈبھی بھی تو اللہ کے لاکھوں بندے شفا پاتے ہیں۔ — فقط ایمان کی صلابت اور پختگی چاہیے اور بس۔“ اور اس سے پہلے کہ باب اجابت دہا ہوا تھا

اسلم خاں نے خاں صاحب کے گھر کا کھلا ہوا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔

خانہ نے اس بند دروازے کو اپنے بیٹے کے لیے ایک بار پھر کھولا تو اس وقت وہ اپنی مردہ سچی کے بستر کے پاس سینی ٹوریم میں بے ہوش پڑا تھا۔ زندگی بھر جس چوکھٹ پر قدم نہ رکھنے کی اس نے قسم کھائی تھی غشی کے عالم میں اس کے نیم مردہ جسم نے وہ چوکھٹا پھر پھلانگ لی تھی۔ خاں صاحب اپنے جگر گوشے کی نور نظر کے کفنِ دفن کے انتظام میں مصروف تھے۔ اسلم خاں کو ہوش آیا تو میری سچی چلتا ہوا بھاگا۔ سامنے رکھی ہوئی قد آدم الماری کے آئینے میں وہ اپنی پشت پر کھلے ہوئے دروازے کے عکس کو دیکھ کر تمیز نہ کر سکا کہ وہ کھلے ہوئے دروازے کو پیچھے چھوڑ کر بند دروازے کی طرف سبھاگ رہا ہے الماری سے ٹکرا کر وہ گرا تو ایک چھینا کے سے شیشے ٹوٹ کر کھیر گئے اور الماری کا پہلے بے بسوا کے محرم کی طرح کھل گیا۔ اسلم خاں نے دیکھا کہ الماری کے نچلے خانے میں فریخ اور اسکاٹج شربتوں کی دو تین بوتلیں لٹھک گئی ہیں۔ کوئی آدمی خالی ہے کوئی پاؤں باقی رہ گئی ہے اس نے یکے بعد دیگرے سچی کچی خالص شراب کی بوتلیں خالی کر دیں آخری بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر چور چور ہو گئی تو وہ جھکا۔ الماری کے سب سے اوپر کے خانے سے نیچے گرا ہوا قرآنِ فرش پر لٹ پڑا ہوا شراب میں نہا رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر قرآن اٹھالیا اور الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں رکھ کر لڑکھاتا ہوا خاں صاحب کے وظیفے کے کمرے سے باہر نکل گیا۔



اس کے لیے بطخوں کی قین قین میں اب بھی اتنی ہی دلکشی ہے جتنی آپ کے لیے مٹی کی تانوں میں ہو سکتی ہے۔ آپ اس کو بذائق کہہ لیجیے۔ لیکن میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس کا حسین ماضی کچھ دن اسی قین قین سے اس طرح وابستہ رہا ہے کہ وہ ان کی جذباتی قدروں SENTIMENTAL VALUES سے انکار نہیں کر سکتا۔

چوڑیوں کے چٹناکوں کے ساتھ ساتھ یہی قین قین کی آوازیں اس نازندگی میں داخل ہو گئی تھیں۔ موسیٰ ندی کے کنارے کنارے، کھیت کے بیلوں کی گھینٹوں کے ساتھ ساتھ یہی آوازیں وہ گجر دم سنٹارہا تھا۔ قریبی ستے سے گذرنے والے ڈھوڑ دھنگر کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ان کے چرواہوں، سربلی اور بے سری تانوں کے ساتھ اس نے یہی آوازیں سنی تھیں۔ یہاں تک پچھلے گورہ جیل کے سنتریوں کی ہوشیار ہوشیاریں بھی یہی قین قین رات کے نمکامل رہتی تھی اور اسے ان آوازوں سے انس تھا۔

جب وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ محلہ موسبوریموں پہنچا ہے تو دونوں میاں بیوی مسرور تھے۔ ان کی انہ دو اجماعی زندگی کا آغاز شہر سے کچھ ہی دور ندی کے کنارے اسی چھوٹی سی بستی کے ایک نیم پختہ مکان اور باغیچے سے ہوا تھا جہاں لکڑی کی ”کوکو“ پیلیہ کی ”پیو پیو“ مرغیوں کی لکڑوں کوں کا ایک ضروری جُز بطخوں کی قیس قیس بھی تھی۔

بچپن سے اس نے جس کو چاہا تھا۔ جوانی میں اس نے جس سے محبت کی تھی وہی لڑکی اس کی دلہن بنائی گئی۔ لیکن اس طرح کہ عقد میں دلہن کی ماں شریک نہ تھیں۔ خاندان کے بڑے بوڑھے منہ بسورے جیسے آفتوں کو سہہ رہے تھے۔ پھلار اسہرہ لاتے ہوئے راستے ہی سے لوٹا دیا گیا تھا اور قاضی جی گھر کی بجائے محلہ کی مسجد میں بیٹھے بادام چھوہاروں کی خیر منار ہے تھے لیکن اس نے ہزار ہزار متبش کیں اور اپنے والدین کو مناسکھا کر اس روز عقد مسعود کو طے نہ دیا۔

ہاں اتنا ضرور ہوا کہ قاضی صاحب بیچارے جس عالم میں عقد خوانی سے پہلے تھے اسی عالم میں عقد خوانی کے بعد بھی رہے یعنی سوائے ان کے مقررہ ”نیک“ کے انھیں بادام چھوہارے دیکھنا تک نصیب نہ ہوا اور نہ ہی ان کے شملے کا دامن چا دلوں سے مجھرا گیا۔

ویسے دیکھنے کو لوگ کھاتے پیتے نظر آتے تھے اور کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی تھی کہ اس عقد کا انداز آخر اتنا اسلامی کیوں تھا۔ نہ نوبت، نہ روشنی، نہ دھڑیل کا ہجوم نہ میرا شنیں۔ بغیر مسند کے دروازے سے پیٹھ لگائے بیٹھے ہوئے نواشا۔ گٹھ میں ایک پھولوں کا ہار جو قاضی صاحب کے عقد خوانی شروع کر دینے کے بعد ڈال دیا گیا تھا۔ قاضی صاحب سوچتے رہے اس کو اسلامی شادی کیسے

بلی پر چھائیاں

بلی پر چھائیاں

ہا جا سکتا ہے — مسند نہ ہو تو مضائقہ نہیں لیکن چاول اور چھوڑوں کی رکت سے جو واقف نہ ہوں وہ کیا جانیں اسلام کیا ہے — ماحول کی اجنبیت نے بے چارے قاضی صاحب کو اتنی اجازت بھی نہ دی کہ وہ اپنے حقوق کے اتلاف و احتجاج کرتے — ورنہ اگر شادی جیسی شادی ہوتی اور چھوڑا ہر سے ہادام کم نظر آتے تو قاضی صاحب ضرور ٹوک دیتے کہ سمجھی ان ضروری باتوں میں بحالت نہیں کرنی چاہیے ۔ اللہ کی برکت اسی میں ہے ورنہ باجے گاجے اور جگمگاتے گولے صرف دنیا داری کی باتیں ہیں — لیکن یہاں تو سرے سے سب کچھ غائب تھا — یہاں تک کہ چہروں کی شاشت غائب تھی — ہونٹوں پر ہنسی غائب تھی اور جب قاضی صاحب نے دلہن کو عمر اور نام دریافت کیا تو سب کو خاموش دیکھ کر خود دلہا میاں بول اٹھے کہ نام یہ ہے، عمر یہ ہے اور اس انداز سے قاضی صاحب کو دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ زلوی صاحب فرمائیے تو ناک نقشہ سب نوٹ کر ادوں — لیکن قاضی صاحب کی تنکبی طروں نے دلہا میاں کو ٹوک دیا اور اس بے ضابطگی پر ان کی جھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دلہن کے ماموں نے خواستہ نا خواستہ دوسرے سوالوں کی تکمیل کروادی — نقد پڑھا دیا گیا تو قاضی صاحب نے اپنے ”نیک“ گواندر و فی جیب میں اس طرح بھالیا جیسے یہ رقم بھی انھیں غلطی سے دے دی گئی تھی، اور سیلیپر پاؤں میں اٹکائے پیڑ پیڑ کرتے دروازے کی طرف لپکے۔

غرض اس کی شادی بھی اتنے ہی ہنگاموں سے تکمیل کو پہنچی جتنے ہنگاموں کا اس کی محبت پر و ان چڑھی تھی — مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی جراثیم پیشہ کی روح وہ خاندان بھر کی نظروں میں کھٹکتا رہا تھا۔ مخالفین جتنی شدید ہوتیں ان کا

اُجلی پرچائیاں

اُجلی پرچائیاں

رو عمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا — اور شاید ان مخالفتوں کی وجہ یہ بھی تھی کہ خاندان
ہی کی ایک لڑکی سے جو اس کی قریب ترین رشتہ دار تھی اس نے بے اندازہ محبت کی تھی
ایسی محبت جو بڑی سے بڑی رکاوٹوں کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی اور جو خاندان بھر کی
پہلی محبت تھی — پہلی کہانی تھی — پہلی حقیقت تھی —

چھوٹی عمر ہی سے وہ ایک دوسرے سے بہت مانوس تھے — ساتھ کھیلنا، ساتھ
ہنسنا اور کبھی نہ جھگڑنا — اس کی امی کہتیں کہ لولو سے کوئی جھگڑنا ہے تو یہ شریہ اس
کی وکالت کرتا ہے اور سب بچوں کو ڈانٹ بتاتا ہے — پتہ نہیں یہ مزاج داریاں
کیا رنگ لائیں اور جب یہ مزاج داریاں رنگ لائیں تو سارا خاندان اس کی مخالفت پر تل گیا اور جوں جوں
محافضت برتنی گئیں کوئی اس کے دماغ پر چھنا گیا۔ دل کے اندر ہی اندر ایک چھوٹی سی دنیا تعمیر کرنا لگا، تعمیر کرتا
گیا یہاں تک کہ اس کو یقین ہو گیا کہ کوئی تحریبی قوت اس چھوٹی سی دنیا کو تھس نہیں
نہیں کر سکتی یہاں تک کہ یہ اب اس کے اپنے بس میں بھی نہیں — اور کسی نے اس
کے دل کی انتہائی گہرائیوں سے پکار کر کہا تم سچ کہتے ہو — نہ اب یہ تمہارے بس
میں ہے اور نہ میرے بس میں — میں صرف اس دنیا کی تعمیر کر سکتی ہوں اور تم نے جن
ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں مقام لیا ہے میں ان ہی ہاتھوں سے اس دنیا کے چپے
چپے کو سنوار دوں گی، ذرہ ذرہ کو نکھار دوں گی — اور آخر کار چپہ چپہ سنور گیا،
ذرہ ذرہ نکھر گیا اور وہ دونوں اپنے دل کے اندر سجائی ہوئی اس خوبصورت دنیا کو
اپنے ساتھ لیے اس مکان میں داخل ہو گئے جہاں انہیں اپنی اس دنیا کو دھرتی پر
رکھ کر کچھ اور نکھارنا تھا کچھ اور سنوارنا تھا۔

پندرہ روپے ماہانہ کرایہ کے سوا اس سے یہ مکان کافی اچھا تھا — دو ہال

ایک دیوان خانہ اور دو کمرے جن میں ایک کمرے کو مالک مکان نے اپنا کچھ سامان محفوظ کر کے منتقل کر دیا تھا۔ صحن بہت وسیع تھا۔ اصل عمارت کے نیچے صحن میں حمام باورچی خانہ وغیرہ الگ تھے۔ صحن کے علاوہ مکان کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ جس میں بہت سی سیلئے سے گلاب موتیا کے درخت، سمنٹ کے پختہ درمیانی حوض کے اطراف لگائے گئے تھے۔ سپوٹوں اور آسموں کے درختوں کی قطار چار دیواری سے لگی بلکی احاطہ کی تین سمتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک سمت کیلے کے درخت پھنیوں سے لدے ہوئے کھڑے تھے اور ایک دوسرا حوض کیلے کے درختوں کی جھنڈ میں پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ جیسے خود ان درختوں نے اپنے لمبے لمبے پتوں میں اسے سو سوختن سے چھپا رکھا ہو کیوں کہ یہ محض صفی اسی لیے بنایا گیا تھا کہ کیلے کے درختوں کی آبپاری کے لیے نل کا پانی اس میں جمع کیا جاسکے اور جیسے کیلے کے درخت اس راز سے واقف تھے کہ ان کی بالیدگی کے لیے ان کی زندگی کے لیے اس حوض کی کتنی اہمیت ہے۔

سپوٹوں اور آسموں کے درختوں کی پہلی قطار کے گھنے سائے میں ایک بہت ہی کشادہ پختہ درخت بنا ہوا تھا جس میں ایک چھوٹا سا متخل حوض بھی تھا۔ جس کی مالی باغیچے کے درمیانی بڑے حوض سے ملی ہوئی تھی۔ گھر کو ایک نظر دیکھنے پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ مالک مکان بہت ہی سلیقہ مند آدمی ہے اور نہ صرف اس کو باغبانی کا شوق ہے بلکہ اس نے خاص طور پر پختہ اور عمدہ درختوں کا اہتمام محض بطخوں کے لیے ہی کر رکھا ہے جو شاید کبھی پت پت حق حق کرتیں دھنکی ہوئی رنگارنگ رونی کے گالوں کی مانند اس جالی دار مجلس میں ایک دو سرے سے گھٹڑ ہو جاتی ہوں گی۔

تصویر میں اس کو ننھی ننھی بطخیں خراماں خراماں اس مجلس سے نکلتی ہوئی نظر

اجلی پرچھائیاں اجلی پرچھائیاں

آئیں جو قیں قیں کرتی باغیچے کی نالیوں میں اشناں کرنے لگیں۔ پاس ہی موسیٰ ندی سے آتی ہوئی یہ آوازیں اس کو اپنی ہی چار دیواری میں گونجتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاب کی ٹہنی سے ایک اور سچول توڑ لیا اور بڑے چاؤ سے اپنی بیوی کے بالوں میں سجاتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ مقام بطخوں کے دھندے کے لیے بہت موزوں ہے۔ ندی کے دونوں جانب یہی کاروبار کرنے والے آٹھ دس گھرانے بستے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ کل سویرے سویرے ہم سہلتے ہوئے ندی کے کنارے پہنچ جائیں اور ننھی ننھی بطخوں کی بچھلتا اور شوخیوں سے لطف اٹھائیں۔ اور اگر کوئی ڈھب کا آدمی مل جائے تو پانی میں تیرنے والے بادل کے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے متعلق ممکنہ معلومات فراہم کر لی جائیں۔ اس کی بیوی نے بہت احتیاط سے پھولوں کو بالوں میں سجاتے ہوئے جواب دیا۔ ٹھیک ہے میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی کہ ہمیں بطخیں پالنا چاہیے۔

دو سے دن سورج کی پہلی کرن سے پہلے ہی قیں قیں کی آوازوں نے انہیں نیند سے جوق کا دیا۔ اس کی بیوی نے کہا ہم ان دور سے آتی ہوئی آوازوں کو قریب سے سُننے کے متمنی ہیں۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہم بہت صبح اٹھنے کے عادی بھی ہو جائیں گے۔ گھر سے باہر نکلنے سے قبل انہوں نے ایک اچھٹی نظر اپنے باغیچے پر ڈالی۔ نئے گھر کی نئی صبح بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ کل تک جو کلیاں تھیں آج وہ گلاب ہو گئی تھیں۔ رات بھر نل کے جاری رہنے سے درمیانی حوض آدھے سے کچھ زیادہ ہی بھر گیا تھا۔ انجیروں پر چڑھے ہوئے پورے انیس ڈبے اپنی اپنی جگہ برابر تھے اس کی بیوی نے ڈبوں کو گنتے ہوئے کہا کہ خود اس باغیچے کے پھل پھلاری ہی سے ہم

اجلی پرچائیاں اجلی پرچائیاں

مکان کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں۔ مکان دار سچ ہی کہتا ہوگا کہ اس نے صرف اس خیال سے کہ گھر میں اچھے لوگ اتر جائیں تو درختوں کی دیکھ بھال ہوگی اتنے کم کرائے پر ہمیں یہ مکان دے دیا ہے۔

ادھیڑ عمر کا یہ آدمی روزانہ سیکل پر شہر سے یہاں تک صرف اس خیال سے آتا تھا کہ اس کا کتا بھوکا نہ رہ جائے۔ جھاڑ نہ مرجھا جائیں۔ خاص طور پر آموں کے صرف دو فیٹ اونچے دو چھوٹے چھوٹے درخت جو سیڑھیوں سے بالکل قریب تھے اور جن پر اس کو مہلت ہی ناز تھا کہ ان درختوں کو ہر موسم میں پانچ پیوندی آم ضرور لگتے ہیں۔ اور ان آموں کے بوجھ سے یہ درخت زمین پر جھک جاتے ہیں اور وہ سینہ تان کر دوست احباب کو بتلاتا ہے کہ سارے حیدرآباد میں ایسے پٹر کہیں نہیں ہیں۔

”واقعی ان دونوں پیڑوں کی ہمیں بہت حفاظت کرنی چاہیے۔ نہ صرف اس لیے کہ یہ مالک مکان کے بہت چیتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اگر واقعی ان درختوں میں آم لگتے ہیں تو یہ ایک نئی چیز ضرور ہیں۔“

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو انجیر گن لینے کے بعد کیلے کی مچنیوں کے حسن سے زیادہ ان کی مالیت کا اندازہ لگانے میں منہمک تھی اور جو حوض میں گرتے ہوئے نلکے پانی کی آواز کی وجہ سے اس کی بات نہ سن پائی تھی۔

”بہر حال خوب مکان ہے۔“ اس نے اس کو مخاطب کرنے کے لیے ذرا

بلند آواز میں کہا۔

اس کی بیوی مسکرا رہی تھی۔ اور وہ ان مسکراہٹوں کو سمجھ رہا تھا۔

اُجلی پرچائیاں

اُجلی پرچائیاں

اس کے دل کی دنیا کے چپے چپے کو سنوارنے والے ہا انتخاب اس دنیا کو زمین پر رکھ کر اس کی تکمیل کے متعلق سوچ رہے تھے۔

کیلے کی پھینیاں عربی گھوڑے کی طرح گمہ دینیں تلنے بہت مغزور انداز سے گویا اس بات کی ضمانت دے رہی تھیں کہ فکر مت کرنا چارچو ماہ کا کرایہ تو ہم ہی ادا کر دیں گے۔ اور اس کی مسکراہٹیں کہہ رہی تھیں کہ میں صفتِ تعمیر کر سکتی ہوں۔ تکمیل کر سکتی ہوں۔ اور بطخوں نے دور دور سے پکار پکار کر کہا قیس قیس قیس۔ تم سیج کھتی ہو۔ اور دونوں مسکرا دیئے۔ اس کی طفسر آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے اس کی بیوی نے پوچھا: ”یہ بطخیں کس حساب سے ملتی ہیں؟“ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ آج پوچھنے پا چھنے سے کچھ اندازہ لگ ہی جائے گا اور دونوں باہر نکل گئے۔

گلشن بوانے ٹامی کو اندر بلاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ گلشن بوا اس کی سسرال سے اس کی بیوی کے ساتھ آگئی تھیں اور لمبے لمبے بالوں والے مسٹر ٹامی گھسے ساتھ ہی گھر کے رکھوالے کی حیثیت سے ان کے حصے دار تھے۔ کعبیت کی پگڈنڈیوں پر اس نے اپنی بیوی کو سنبھال لیا۔ ٹیڑھی ٹیڑھی پگڈنڈیاں بل کھاتی ہوئی ان کے پاؤں کے پیچھے جیسے پچھ پچھ جاتی تھیں۔

چیلوں کو ہاتھ میں اٹھائے پگڈنڈی کے کناروں پر اگی ہوئی مخملی ہریالی پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کی بیوی نے اس کو مڑ کر دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ قدم قدم پر کوئل کو مل مخملی ہریالی بچھا دے اور اس کا ہاتھ پکڑے بے شمار پگڈنڈیوں پر چلتا رہے نرم ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے وہ اس کو گدگدانے والا ہی تھا کہ سامنے پل پر قیس قیس کا شور بلند ہوا۔

دونچے پاس کے نشیبی راستے سے ننھے منے مللے مللے، رنگ برنگے روٹی کے کالے لٹرھکاتے لٹرھکاتے چلے آ رہے تھے۔ قیس قیس قیس کا کورس گاتی ہوئی یہ فوج اس فاختانہ انداز سے چل رہی تھی جیسے تمام بحریر پر اس کا قبضہ ہے۔ سامنے گھنے پٹر کے پیچھے سے سورج ابھر رہا تھا۔ پل پر پہنچتے پہنچتے بطخوں کی یہ شفاف ٹولیاں پیر کی چوٹی سے چھنتی ہوئی کرنوں میں نہا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک ندی پل کے نیچے بہہ رہی ہے اور ایک ندی پل کے اوپر کہ اتنے میں ایک دزدانی ہوئی موٹر سائیکل نے اس ندی کی چادر کو دو مختلف حصوں میں بانٹ دیا۔ قیس قیس قیس۔ اور یہ بہتا ہوا پانی منجمد ہو کر اڑتے ہوئے برف کے گالوں کی طرح ادھر ادھر بکھر گیا۔ پل پر پہننے والی ندی پل بھر میں غائب ہو گئی اور پل کے نیچے بہنے والی ندی کی شاننی جیسے ڈولنے لگی۔ قیس قیس قیس قیس۔ پانی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے لہکورے پیدا ہو گئے۔ کنارے پر کھڑے ہوئے درخت، ٹیلے، چٹانیں جو ندی کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر سنور رہے تھے جیسے غش کھا گئے کیوں کہ ان کا عکس پانی میں حل ہو رہا تھا اور ان سے اپنی ہی صورت پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں سے بے نیاز، منظر کو تہ بالا کرتی ہوئی یہ بحری فوج اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے میں مگن تھی۔

وہ دیر تک کنارے پر بیٹھے ہوئے منظر کی دلکشی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سامنے کناروں پر بطخوں کی ٹولیاں مختلف سمتوں سے ندی کی طرف شور مچاتی بڑھ رہی تھیں۔ ان کے رکھوالے کوئی ہاتھ میں پتلی سی چھڑی پکڑے کوئی جوار کی ٹوکری تھامے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

اُجلی پرچائیاں

اُجلی پرچائیاں

پانی میں تیرتی ہوئی بطخیں کناروں پر آتی ہوئی بطخوں کو دیکھ کر اپنی گردنیں پانی میں ڈبولیتیں اور جلدی سے کیڑوں اور پرکلیوں کی تلاش میں مصروف ہو جاتیں جیسے دوسری بطخوں کے ندی میں اترنے سے پہلے ہی سارے کیڑوں اور پرکلیوں کو ہڑپ کر لیں گی۔ جو ذرا سنجیدہ سی تھیں، پر پھیلا پھیلا کر چوچ ڈبو ڈبو کر اپنے کچھوؤں سے پیٹھ پر پانی اچھال اچھال کر نہا رہی تھیں۔ کنارے پر سچت سچت کرتی ہوئی ایک ٹوٹی چھوٹے چھوٹے پنھروں اور پودوں سے سختی بچاتی پانی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ایک ٹکڑی اتھل پانی میں اتری کچڑ میں چوچیں دھنسلے پخ پخ کر رہی تھیں۔ کیڑے اور کچھوے چن رہی تھی۔ تیرتی ہوئی بطخوں میں ایک نر ایک مادہ کی گردن کو اپنی چوچ میں دبائے ٹھٹھول کر رہا تھا۔

اس نے پاس بیٹھی ہوئی اپنی جیتی بیوی کے چٹکی لی۔ ندی سے نظریں ہٹا کر اس کی بیوی نے اس کو دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

پل پر کھڑے ہوئے لڑکے کو اس نے اشارے سے بلایا جو کسی نہ کسی بہانے نظریں گھاگھا کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ جب لڑکا پاس آگیا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اس کو بٹھالیا۔ دیر تک جانے کیا کیا باتیں ہوتی رہیں۔ اپنی بطخوں کے ندی میں دور تک چلے جانے کا جب میراں کو احساس ہوا تو وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا، اور آؤ کی آوازیں لگاتا، کنارے کنارے بھاگنے لگا۔ اس کی اپنی ٹولی کی بطخیں گردن گھاگھا کر آؤ کی آوازوں کی آوازوں کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور سچ جواب میں قیں قیں قیں کا شور بلند ہوا، جیسے سب کی سب کہہ رہی ہوں کہ گھبرائو نہیں ہم سچہ تنھوڑا ہی ہیں جو کہیں بھٹک جائیں۔ لیکن میراں اس تسلی دینے والی قیں قیں سے مطمئن نہ تھا۔

اُجلی پرچھائیاں اُجلی پرچھائیاں
 بھاگتے بھاگتے ہی اس نے پتھر اٹھالیے اور تیرتی ہوئی لٹخوں کے عین
 سامنے پھینکنے لگا۔ بڑق، ایک پتھر دو بگیا۔ قیس قیس، مچھی پتھر نہ مارو
 ہم لوٹتے ہیں۔

بڑق، دوسرا پتھر پانی اچھالتا ہوا غائب ہو گیا۔ قیس قیس، قیس
 قیس۔ یہ کیا بد تمیزی ہے میاں۔

بڑق، تیسرا پتھر اگلی دو لٹخوں کے بالکل قریب گرا۔
 قینق۔ جلدی جلدی پانی کاٹتے ہوئے لٹخوں نے اپنا رخ بدل دیا اور مسلسل
 قیس قیس شروع ہو گئی۔

قیس قیس قیس۔ اچھا پتھر مالک سے تمہیں پٹوائیں گے۔
 قیس قیس قیس۔ آج رات کوئی اٹتا نہیں دے گا۔

لیکن میراں جیسے اس راز سے واقف تھا۔ نہایت نرمی سے وہ آوازیں دے
 رہا تھا، آؤ آؤ جیسے پچکار رہا ہو کہ دیکھو اٹدے کبھی ست بند کرنا اور نہ مالک تمہارے
 میراں کو نوکری سے جواب دے دے گا۔ آؤ آؤ۔ اور پھر میراں تمہارا دوست
 ہی تو ہے۔ ادھر بڑی بڑی چٹانوں میں کو لے گھات لگاے چھپے رہتے ہیں کہ تم
 اس کنارے کا رخ کرو اور پھر اپنے میراں کو پکار سبھی نہ سکو۔

قیس قیس۔ کو لے کہیں اس ندی کی تہ میں تو نہیں ہیں میراں؟

قیس قیس۔ تم یہیں ٹھہرو ہم آرہے ہیں۔ قیس قیس قیس۔

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تو میراں نے وہیں سے کھڑے کھڑے ہاتھ ہٹا لیا۔
 جواباً اس نے بھی ہاتھ ہٹاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ ”چلو اتنا تو معلوم ہوا کہ“

اُعلیٰ پر چھائیاں

اُعلیٰ پر چھائیاں

پاشو میاں یہاں کے سب سے بڑے بیوپاری ہیں اور واجبی دامنوں سے بطخوں کا معاملہ انھیں سے ہو سکتا ہے۔

دوسرے کنارے پر مین کے سائبانوں کے پاس کھڑے ہوئے ایک موٹے سے تھمد باندھے ہوئے آدمی کو بتلاتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے پاشو میاں وہی ہو۔“ کتنا مالدار ہو گا یہ آدمی۔ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ بطخیں۔ دل لگی نہیں ہے۔ پل کے ادھر متنی بطخیں ہیں غالباً سب کی سب اسی کی ہوں گی۔ روز کتنے ہی اٹھنے نکلتے ہوں گے۔ ٹوکریوں کی ٹوکریاں بھر جاتی ہوں گی تیرہ برس سے جب اس کی زندگی کا انحصار اسی دھندے پر ہے تو وہ بہت تجربہ کار ہو گا۔ کل ہی آپ اس سے مل لیجئے نا۔

کھیت کی باڑہ میں الجھے ہوئے آ پخل کو چھڑاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ”آج ہی کیوں نہ مل لوں۔“

دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور گھر کی طرف چل پڑے۔
ناشتے وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد دونوں گھر کی صفائی اور تزئین میں مصروف ہو گئے۔ بوا بستی کا چکر لگا کر ضروریات کی دکانوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے چلی گئیں۔ مسٹر ٹامی بھی بوا کے پیچھے دم ہلاتے ہوئے چل پڑے جیسے سدا بستی سے بوا کو متعارف کرانے کا فرض ادا کریں گے۔

آج دن بھر وہ گھر ہی کے کام دھندوں میں الجھے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے قیس قیس کی آوازیں آ آ کر انھیں یاد دلاتی رہیں کہ پاشو میاں سے ضرور ملنا۔ لیکن اس نے دوسرے دن پر اس کام کو اٹھا رکھا۔

دوسرے دن صبح جب وہ پاشومیاں سے ملنے کے لیے چلا گیا تو اس کی بیوی
 بڑے چاؤ سے سب درختوں کو پانی دیتی رہی۔۔۔ منہ تک لبالب سہرا ہوا حوض
 آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا۔۔۔ اپنے پلو کو اپنی کمر کے گرد لپیٹے وہ خوش خوش باغبانی
 میں مصروف ہو گئی۔

ہندوستان کے نقشے پر دریاؤں کی نشان دہی کرتی ہوئی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیروں
 کی مانند درختوں کی آبیاری کرنے والی نالیاں سارے باغچے میں پھیلی ہوئی تھیں۔
 وہ پھاڑے سے مٹی کرید کر ایک نالی کا منہ بند کر دیتی اور بستے ہوئے پانی کا رخ
 تیزی سے بدل جاتا اور درختوں سے چھنتی ہوئی سنہری دھوپ میں ایک روپہلی لکیر
 بہت ہی اطمینان سے بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح درختوں کے تنوں میں پہنچ جاتی
 اور پھر اس کے ہاتھوں کی ذرا سی جنبش سے یہ روپہلی بل کھاتی ہوئی ناگن دوسری
 جانب چل پڑتی۔۔۔ روپہلی ناگن کا یہ قص کافی دیر تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ
 آدھے سے زیادہ حوض خالی ہو گیا اور تمام درخت ٹھنڈا میٹھا پانی پی چکے تو اس نے حوض
 کے نچلے سوراخ میں ڈاٹ ٹھونس کر پانی کی دھارا کو روک دیا۔

کیلے کے پیروں کی بات جداتھی۔ ان کے لیے ایک بھر پور حوض الگ تھا اور بلاشبہ
 غیسے وہ اس کی ایک ایک بوند کے مالک تھے۔۔۔ پلو کی گرفت کو کمر میں اور مضبوط کرتے
 ہوئے وہ دوسرے حوض کی طرف بڑھی تو بڑے بڑے نرم پتوں نے اس کے گالوں کو
 تھپتھپاتے ہوئے جیسے جبک کر رازدارانہ انداز میں اس کے کانوں میں کہا تم
 بہت اچھی ساتھی ہو۔ ہم اپنے تمام خزانے تمہارے لیے اگل دیں گے اور اس نے سسک کر
 بہت ہی پیار سے پتوں کو ہلاتے ہوئے جبک کر حوض کا ڈاٹ نکال لیا۔

اُجلی پر چھائیاں
پانی کی تیز دھار انا لیوں سے ہو کر ایک ایک پیر کو گدگداتی گئی۔ بالکل اس طرح جیسے تازہ لہو شربانوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور جو بالیدگی کے لیے ضروری ہے تازہ گی کے لیے ضروری ہے۔ زندگی کے لیے ضروری ہے۔

قیں قیں قیں ندی سے آوازیں بلند ہونے لگیں جیسے بطخیں کہہ رہی تھیں — جالی دار مجلسرا میں جو چھوٹا سا حوض ہے اس کی ہم ہی بکاوتنہا مالک ہیں — اور وہ سوچنے لگی — دھنکی ہوئی رونی سے بنی ہوئی یہ رائیاں اپنے پیٹ میں بہت سے اندے چھپائے جب اس مجلسرا میں داخل ہوں گی تو باغچے کی وہ نالی بھی اس طرح خشک نہ رہ سکے گی جو اس چھوٹے سے حوض سے ملی ہوئی ہے اور جس کا اب کوئی پیرسان نہیں ہے۔

قیں قیں قیں — ہم آ رہی ہیں — قیں قیں قیں — اور اس کی نظریں ڈر بے کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ پل پر سے ہو کر پاشومیاں کے پاس پہنچا تو وہ ہزاروں بطخوں میں گہرا ہوا پسو بھر بھر کر جوار بکھیر رہا تھا۔

قیں قیں قیں کرتی ہوئی بطخیں ایک دوسرے سے گدگد ہو رہی تھیں۔ دوسری بہت سی ٹولیاں ندی میں اتر گئی تھیں۔ بعض کناروں پر خچ خچ خچ میں مصروف تھیں۔ ٹین کے سائبانوں کے سامنے چوتھرے پر اٹھوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں دھری ہوئی تھیں جن پر غالباً نظرانہ لگنے کے خیال سے پاشومیاں نے کپڑے اڑا رکھے تھے۔ بکھری ہوئی جوار کا ایک دانہ بھی زمین پر نہ بچا تو پاشومیاں نے تیلال کو پکار کر پوچھا پختہ سائبان والی بطخیں نالے میں اتاری گئیں یا ندی میں۔

اُجلی پر چھائیاں

اُجلی پر چھائیاں

بیری کا دھواں اڑاتے ہوئے ایک دبلے پتلے لوجوان نے آواز دی۔

نالے میں ہیں جی، نالے میں۔

”تو پھر صہدانی کہاں مر گیا ہے رے۔“

”اندر اُٹدے چن رہا ہو گا۔ اور تیاں منہ ہی منہ میں کچھ بڑھاتا ہوا۔“

دھواں اڑانے لگا۔

پاس کے سائبان سے آواز آئی۔ ”بیٹھے بٹور رہا ہوں بابو۔“

بعضے بعضے ٹوٹ گئے ہیں۔“

پاشومیاں نے ماں کی گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”بے وہ ہندوستانی بچے۔“

دن بھر سی کرتا رہے گا۔ اور جو تیری مائیں یہاں کھڑی قین قین لگا رہی ہیں یہ اگر

نالے میں انٹرپریس تب دوہری محنت کرنے کیا تیرا پاپ آئے گا۔ پاشومیاں نے

اس کو چھتی ہوئی نظروں سے دیکھا تو وہ ٹھٹھا ہوا نالے کی طرف بڑھ گیا۔

کل تک اس کو معلوم نہ تھا کہ ندی سے چالیس چاس قدم پر ہی اتنا بڑا سخت

بالہ بھی ایک ہی سمت ندی کے متوازی بہتا ہے۔ نالے میں پاشومیاں کی بطخیں

دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ گردنیں پانی میں ڈبوئے دیں اوپر اٹھا اٹھا کر وہ بالکل

سفید سفید اور رنگ برنگی اونڈھی اونڈھی صراحیوں کی طرح پانی کی سطح پر تیر رہی

تھیں۔ لیکن یہ اونڈھی صراحیوں کی طرح نہ رہ سکتی تھیں بلکہ دیکھتے دیکھتے

دیکھتے قین قین کرتی ہوئی بطیں بن جاتیں اور اچھی خاصی دوسری بطیں اونڈھی اونڈھی

صراحیوں کا روپ دھار لیتیں۔

وہ منٹ دو منٹ خاموش کھڑا ہوا تیاں کی ماؤں کے کرتب دیکھتا رہا۔

اُجلی پرچھائیاں اُجلی پرچھائیاں
پاشومیاں کی زبان میں جب وہ صمدانی کی مائیں تھیں تو یہ تیاں کی مائیں ہوں گی،
اور وہ سوچنے لگا کہ آدمی تو بالکل بدتمیز اور جاہل مطلق معلوم ہوتا ہے۔

ہمش ہمش ہمش۔ صمدانی کی مائیں نالے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اور تیاں
اپنی ماؤں کے حقوق کی حفاظت کر رہا تھا۔ اور صمدانی کی مائیں پکار رہی تھیں
۔ قیں قیں قیں قیں۔ راستہ کیوں روکتے ہو تیاں۔ ہمش ہمش ہمش
۔ قیں قیں قیں۔ تو پھر ہمارے فرزند صمدانی کہاں ہیں۔ اور ایک چنگی
دارھی والا آدمی نکر اور بنیان پہنے انڈوں کی ٹوکریاں لالاکر چوتھرے پر جا رہا تھا، اور
پاشومیاں مچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چڑٹ منہ میں دبائے سائباں کے پاس کھڑی ہوئی
ایک صفائی والی سے چیخ چھاڑ کر رہا تھا۔

صفائی والی اپنی لوہے کی ٹوکری میں ایک موٹی سی جھاڑو رکھے اپنے کولہوں
پر ٹوکری کو ٹھکائے کن انکھیوں سے انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں کو دیکھ رہی تھی
لیکن پاشومیاں اس لوہے کی ٹوکری کو نازک نازک انڈوں سے بھرنے کے لیے تیار
نہ تھیں کیوں کہ ٹوکری لوہے کی تھی اور انڈے بہت نازک تھے اور پاشومیاں سستی کا
سب سے بڑا بیوپاری تھا اور اس کے سامنے کھڑی ہوئی عورت ایک صفائی والی
تھی جو زیادہ جوان بھی نہ تھی۔

صمدانی اپنے کام سے فراغت پاچکا تو اپنے انتظار میں ٹھہری ہوئی بطنوں کو
ہانکتا ہوا ندی کی طرف چل پڑا۔ قیں قیں قیں جیسے کہہ رہی ہوں بہت دیر
ہو گئی صمدانی اور پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی بے شمار بطنیں جلدی جلدی پھٹ پھٹ
پھٹ کرتیں۔ بطنیں جھولتیں، ندی کی طرف چل پڑیں۔

اُجلی پر چھائیاں اُجلی پر چھائیاں

سائبان کے پاس کھڑی ہوئی صفائی والی ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے ہاتھ میں ٹوکری پکڑے ہوئے سائبان میں چلی گئی تاکہ بطخوں کی رات بھر کی بیٹ صاف کر دے اور پاشومیاں لمبے لمبے کش بھرتا ہوا چبوترے پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پاشومیاں کے قریب پہنچ کر بے وجہ مسکرا دیا۔

”غالباً سیٹھ پاشومیاں آپ ہی ہیں۔ مجھے کچھ بطخوں کی ضرورت تھی۔ معلوم ہوا کہ بستی بھر میں واجبی دامنوں پر آپ ہی سے معاملہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں سیدھے آپ کے پاس چلا آیا۔“

”نہیں صاحب آپ پہلے چار جگہ قیمتوں کا اطمینان کر لیجئے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعی سیکر دام واجبی ہیں یا نہیں۔“ بہت ہی مسکراتے ہوئے پاشومیاں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”مگر آپ کے دام مجھے معلوم ہو جائیں اور پھر ویسے بھی ایک دوسرے پر اعتماد ہی سے دینا چلتی ہے۔“ اس نے جواب میں کہا۔

”کس لیے چاہئیں آپ کو بطخیں۔“ میرا مطلب ہے کیا آپ کو انڈے والے جانور کی ضرورت ہے یا کچھ ان کے لیے چاہیے؟

اور اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”دیکھیے پاشو سیٹھ مجھے کچھ ایسا بڑا دھندہ تو نہیں کرنا ہے۔ بس انڈے والی بطخیں چاہئیں جس سے میں آہستہ آہستہ کچھ پیدا کر سکوں۔“

”تو پھر میں آپ کو نالے میں کے تیار جانور دوں گا جو پٹا پھٹا انڈے دیتے

اُجلی پر چھائیاں

اُجلی پر چھائیاں

رہیں۔ اور ابھی جو جانور زندگی کی طرف گئے ہیں ان میں زبان تر پٹھے ہیں۔ کھانے کے لیے ان کا گوشت لذیذ ضرور ہوتا ہے لیکن انھیں انڈوں پر آنے کے لیے بہت دین چاہئیں۔ تو سچ فرمائیے کتنا جانور چاہیے آپ کو؟

”لیکن آپ نے دام کا تعین نہیں کیا۔۔۔ دام معلوم ہو جائیں تو کل آکر میں حسب ضرورت لے جائوں گا۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ فیصلے بھی اب جانور شام تک ہاتھ نہیں آنے کا۔ پانی میں اترا اور بس سے باہر ہوا۔ لیکن ذات بڑی منڈ ہے۔ دیکھ بیجا رہی سے بالکل بری۔ مرغیوں کی طرح نہیں کہ وہ اُجلی اور چٹ پٹے ب غائب۔ آپ کی خاطر ۳۶ روپے درجن کے حساب سے چھانٹ کر دے دوں گا۔ پہلے تو ان داموں میں آپ کو ایسا جانور ملے گا نہیں اور پھر کرشمہ قریب ہونے سے اب دام بھی چڑھ جائیں گے۔ میری رائے میں یا تو آج کل ہی میں اُٹھ لیٹے یا پھر مہینہ دیر دہینہ توقف کیجئے۔ لیکن بعد میں بھی آپ کو ان داموں سے کم کیا ملے گا۔ پاشو میاں نے مسکراتے مسکراتے ایک ہی سانس میں اتنی سب باتیں کہہ دیں۔

”تو پھر یہ قطعی دام ہیں؟ کی کی کوئی گنجائش ہی نہیں؟“

نہیں صاحب آپ چار جگہ اور اطمینان کر لیجئے۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ پوری طرح یقین ہو جائے تب تشریف لائیے اور درجن۔ دو درجن۔ دس درجن جتنا چاہیے اٹھا لیجئے۔ زور نہ ظلم۔ سودا مرضی سے ہونا چاہیے۔ ہے نا صاحب۔ دغا فریب تو ہے نہیں۔۔۔ دور وزہ زندگی ہے تو یہ سب کس کے لیے۔ آپ اطمینان سے آئیے اور جب چاہے آئیے۔

اجلی پر چائیاں
مصابو کر کے رخصت ہوتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ آدمی معاملے کی حد تک سید
معلوم ہوتا ہے۔

تیس تیس تیس۔ اور اس کی نظریں نالے میں چل کر تھکی ہوئی بطنوں پر جم
گئیں۔ پتہ نہیں ان میں کون کون سی کھجوریں آئے والی ہیں۔ وہ چلتے
چلتے گھڑی بھر کے لیے رک گیا اور غور سے دیکھتا ہوا اپنی پسندیدہ بطنیں ذہن میں
محفوظ کرنے لگا۔

کافی سوچ بچار اور صلاح و مشورے کے بعد جب انہوں نے اپنی رقم پرس
سے نکالی تو اس میں جملہ ۸۰ روپے تھے۔ چار درجن بطنیں خرید لی جائیں تو ایک سو
چوالیس روپے صرف ہوتے ہیں اور صرف تریالیس روپے باقی رہتے ہیں۔
وہ لیے گھر کی ضروریات کے لیے انہیں فی الوقت کچھ خبر نہ تھا البتہ اس کی
بیوی کے لیے روزمرہ استعمال کی دو تین ساڑیوں اور بلوز کی شدید ضرورت تھی جس کے
لیے کم از کم ساٹھ پنسیٹھ روپے درکار تھے۔ آخر شش پہلے پایاکہ دو ساڑیاں اور
دو بلوز چالیس روپے کے اندر تیار کر لیے جائیں اور تین درجن بطنیں خرید لی جائیں۔ بطنوں
کی جوار کے لیے تین چار روپے علیحدہ نکالنے ہوں گے اور اس طرح تیس تیس روپے
بچ رہیں گے جو دوسری اتفاقی ضروریات کے لیے کافی ہیں۔ مہینہ بھکے غلے کا صرفہ
اس رقم کے علاوہ ان کے پاس محفوظ تھا۔

اس کے والد ایک بڑی جاگیر کے عہدیدار تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے
لو کوئی اچھی سی خدمت مل جائے جس سے وہ کھاپی کر زندگی بسر کر سکے۔
لیکن دفتر دفتر کی خاک چھاننے پر بھی ان کے بیٹے کو کوئی ایسی دسی نوکری بھی

اُجلی پرچائیاں

اُجلی پرچائیاں

زل سکی۔ آخر شش پندرہ روپے ماہانہ کا ایک مکان کرائے پر لے کر اس کے والد نے اپنی مہربانی کو بدلہ ہی میں بٹھرا دیا کہ وقتاً فوقتاً وہ تلاش روزگار میں مصروف رہ سکے کیوں کہ ان کا اپنا رہنا سہنا تو زیادہ تر گاؤں ہی پر رہتا تھا۔

گذر بکری لے وہ اس کے اس حد تک کفیل ہو سکتے تھے کہ وہ اور اس کی بیوی خالی پیٹ نہ رہ سکیں۔ سوانہوں نے اپنی طرف سے دریغ نہ کیا۔ اس سے زیادہ وہ کرم بھی کیا سکتے تھے۔ پیٹ بھر کر بچے تھے انھیں اور پھر ایک نہیں دو دو بیویاں۔ تین کنیوں کی پرورش کی ذمہ داریاں ایک جان پرستیں۔ مہی سوچ سوچ کر اس کا جی مسو ستارتا کہ کسی طرح اپنا بوجھ آپ اٹھا لینے کے قابل بن جائے اور پھر ایک بات اور بھی تھی۔ اس کی مال چاہتی تھیں کہ ان کی اپنی بہن کی لڑکی مہربان کر لانی جائے سو وہ نہ ہو سکا تھا۔

والدین کی پہلی ہی خواہش کو رد کر دینے کے بعد اس کا یہ احساس اور شدید ہو گیا تھا کہ اپنے پیڑ پر کھڑا ہو جائے۔ اپنا بوجھ آپ اٹھالے۔ احساسات کی شدت سے اس کے دماغ میں ایک گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور جب یہ احساس شدید تر ہو جاتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا جیسے سارے مخالفین اس کی کمزوریوں پر ہنس رہے ہوں گے اور اس کی یہ کمزوری خاندان بھر میں موضوع بحث بنی ہوئی ہوگی۔

شہر سے دور اس چھوٹی سی بستی میں آکر وہ اس لیے سچی مطمئن تھا کہ نوکری کی تلاش کے ساتھ ساتھ چھوٹا موٹا دھندہ ہی کر دیکھے گا۔ ویسے ایک اچھے خاندان کا فرد ہونے کے باوجود اس نے کسی معمولی سے معمولی کام میں بھی شرم محسوس نہیں کی۔ بس اس کی ایک ہی خواہش تھی، ایک ہی آرزو تھی اور وہ یہ کہ خود کچھ کرے، خود

اُجلی پر چھائیاں اُجلی پر چھائیاں

کو اس سلیقے سے سجایا ہے کہ محلہ کا کوئی آدمی اپنے پیسے بچا کر سامنے سے نہیں گزرسکتا۔
دوسرے دن سے اس نے محسوس کیا کہ اس کے لکڑی کے ڈبے میں محفوظ ہونے والے دو دو پیسے گرین ہوٹل کے خوبصورت سے کیش بکس میں جمع ہو رہے تھے۔

شام کو اس نے اپنی منیگریٹر سے کہا۔ ”میرے خیال میں کل قمیص اور کوٹ کا پٹر اٹھے نہیں خریدنا چاہیے۔ پتہ نہیں ہمیں اس سے اہم کوئی کام پڑ جائے کیوں کہ دو تین روزہ گرا کر ایک بالکل بیچ گیا ہے۔“

چٹھی چٹھی آنکھوں سے اس کی منیگریٹر نے اس کو دیکھتے ہوئے جواب دیا کیا ایک ایسا کیوں ہو گیا ہوگا۔ مگر آپ یقین کیجیے۔ چو نے میں دی میں نے اپنے ہاتھ سے ملایا تھا۔ کتھے میں دودھ، لونگ کے پھول اور الائچی کے چھلکوں کے سوا اب کے تو سالم الائچیاں بھی ملائی گئی تھیں۔ اور جوش دے کر میں نے ہی اس کو چھانا تھا اور ”مڈی“ تو بالکل پھینک دی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تم سچ کہتی ہو۔ پان کے مزے کی بات نہیں ہے گرین ہوٹل میں ایک نیا پنواڑی آیا ہے جس نے پان کی لذتیں بھی دکان کے حصن میں لگا دی ہیں۔ شوکیس کیا ہے ایک بولتا ہوا جادو ہے۔ پہلے جادو اثر کرتا ہے بعد میں گاکا پان چباتے ہیں اور ہمارے یہاں بات بالکل الٹی ہے۔ گاکا پہلے پان چباتے ہیں تب کہیں کتھا اور چونا اثر کرتے ہیں لیکن چوں کہ پان چبانے سے پہلے ہی خوبصورت الماریاں گاکہوں کو چبا ڈالتی ہیں اس لیے ہم گھٹائے میں ہیں۔ اور اس کی منیگریٹر کچھ سوچتے ہوئے داہنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی تھی۔

چوتھے دن صبح وہ پورے ایک سو آٹھ روپے لے کر پاشومیاں کے پاس پہنچا

نو وہ مین کے سائبان کے سامنے کھڑے جواز ملوا رہے تھے۔ ساری کی ساری لٹخیں سائبان میں بند قیں قیں شور مچا رہی تھیں۔

اس کو دیکھ کر پاشومیاں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”تو پھر آپ آگے صاحب۔“ اور اس نے بغیر کسی تامل کے روپے ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا بہت پیاری پیاری اور خوبصورت لٹخیں جن دیکھے سیٹھ صاحب۔ سب کی سب بھکے سفید مہوں تو بہت ہی اچھا ہے۔

پاشومیاں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ سب کی سب سفید لٹخیں لے کر یہ کیجیے گا۔ مختلف رنگ کی ملیں گی لیکن اچھی اچھی جن دوں گا۔“

اور انہوں نے پکارا۔ ”متیال اور متیال۔ ذرا یہ تالا کھولنا اور متیال نے پھٹ سے دروازہ کھولا اور قیں قیں کی آوازوں سے پوری فضا گونج گئی۔ اور چوکھٹ پھلانگتی، گر قتی سنھٹتی بے شمار لٹخیں دیکھتے دیکھتے کھلے میدان میں جمع ہو گئیں جیسے وہ بہت بڑا لیدر ہے اور سب کی سب اس کی تقریر سننے کے لیے بے تاب ہیں۔

پاشومیاں نے متیال سے کہا۔ ”اس کا پیٹ بہت جھک گیا ہے۔ ذرا اس کو پکڑنا تو، اور متیال نے عقاب کی طرح جھپٹ کر ایک لٹخ کو دبوچ لیا۔ قیں قیں قیں قیں۔ سفید رنگ، پشت پر ہلکے سیاہ بے ترتیب دھبے، بہت حسین پیاری پیاری۔ وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

ہاتھ بڑھا کر پاشومیاں نے متیال سے لیتے ہوئے دوسری طرف اشارہ کیا۔ قیں قیں قیں قیں قیں قیں قیں۔ بالکل سفید، دھنکی ہوئی رونی کی طرح دھان پان۔ پیٹ بیٹ میں اٹا ہوا، جس میں بہت سے اٹھنے محفوظ ہوں گے۔

اُجلی پرچھائیاں اُجلی پرچھائیاں

ان دونوں کو دبوچ لے شیرو۔ قینوق، قینوق۔ نر خروں پر نیاں کی
گرفت سے آوازیں حلق میں گھٹ گئی تھیں۔ پیٹھ پر سرئی رنگ کا ایک بڑا سا جبہ
اور آدمی سے زیادہ چرچ سیاہ۔ بچھوؤں پر کالے کالے دھبے اور پھر سفید۔
پاؤں سیکڑے بالکل اس طرح لٹک رہی تھی جیسے بیا کے گھولنے اُلے لٹک رہے
ہوں۔ کافی دیر تک یہ پکڑ دھکڑا چلتی رہی۔ کسی کی گردن۔ کسی کے کپڑے
کسی کی ٹانگیں۔ پاشومیاں کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنی پسند کی نشان دہی کرتا
رہا۔ لیکن پاشومیاں نے بعضوں کو پکڑا دیا۔ بعضوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ نہ رہے
اور یہ اٹھو والہ جانور نہیں۔ پاشومیاں بھرپور کا رتھا۔ اس نے عقیدتاً
اس کی بات مان لی۔

گرفتار کی ہوئی بطخیں جیل میں ٹھونس دی گئیں اور بین کے سا بُان کا دروازہ
پھر سے بند ہو گیا۔ ان میں تیس مادہ ہیں اور چھ نر۔
ایکہ برقی رو اس کے دماغ میں چکر کاٹ کر نکل گئی۔ واقعی ہم نے اس مسئلہ
پر غور ہی نہیں کیا۔ اگر وہ درجن بھر نہ رہے دیتا تو۔ لیکن وہ اپنی
ناخبرہ کاری کو چھپاتے ہوئے بے تکلف بول اٹھا۔ چھ نر تو بہت ہیں پاشو سیٹھ
صرف چار ہی نر دیتے اور بقیہ سب مادائیں۔

لیکن پاشو سیٹھ نے تجارت کے اصول اس کے سامنے رکھ دیئے۔ ہر درجن میں
دو نر ضرور ہوتے ہیں۔ عام بات ہے۔ آپ اطمینان کر لیجئے اور پھر صاحب آپ کے
اور ہمارے لیے چار نکاح جائز نہیں۔ ان کو ہم سے ایک ہی تو زیادہ ہے۔ کیا آپ ہر
نر کو پانچ مادہ یوں کی اجازت بھی نہ دیں گے۔

اُجلی پرچھائیاں
لیکن چھوڑتے ہی اس نے جواب دیا پاشو سیٹھ آپ سمجھے نہیں۔ میں تو صرف
ایک نر کو پوری ۳۵ ماداؤں کی اجازت دینے کے لیے تیار ہوں۔

پاشو میاں بات سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے مجھ سے چوک ہوئی۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ
پانچ ماداؤں سے زیادہ کسی نر کو اجازت نہ دیجئے اور انہوں نے بڑے رازدارانہ انداز
سے کہا۔ ورنہ انڈے کیسے دیں گی مادیاں۔ ایک نر تو مر جائے گا بے چارہ۔
مستی کے انڈوں سے بچے تو نکلنے سے رہے۔

بات ختم کرتے ہی پاشو سیٹھ نے نیاں اور صہدانی سے اس کے گھر کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا ٹانگیں باندھ کر، ٹوکروں میں صاحب کی بطخیں سامنے والے مکان میں
پہنچا دو۔

بطخیں ٹوکروں میں رکھ دی گئیں تو پاشو میاں نے اس کو رخصت کرتے ہوئے
کہا دو تین روز گھر ہی میں بند رکھیے۔ روزانہ دو وقت چار سیر چار بہت کافی ہے
دو تین روز میں گھسے مانوس ہو جائیں گی تو ٹانگوں کے پھلے پردوں پر نشان لگا کر
ندی کی سیر کرا لیجیے۔

بچوں کے پردوں پر نشان لگانے کا اگر کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو پاشو میاں
نے ٹوکروں سے ایک بطخ اٹھالی اور دائیں پنجے کی انگلیوں کے درمیان میں پردے
کو کچھ سوچ کر نہایت بے دردی سے چیر دیا اور خود اس کی اپنی انگلیاں بط کے
خون سے جھبکا گئیں۔ دم سادھ کر بیٹھی ہوئی ریشم کی ننھی منی جان قیں قیں کرتی
اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے لگی۔

قیں قیں کی آوازوں کو ساتھ لیے جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی آنے والے

اُجلی پرچھائیاں
 ان مہانوں کے سواگت کے لیے دروازے ہی میں کھڑی تھی جن کا مسلسل تین روز
 سے انتظار تھا۔ سروں پر دھسے ہوئے ٹوکروں کو دیکھتے ہی اس کی جھپٹیں کھل
 گئیں اور اس کی آنکھیں ان نئے ساتھیوں کے دیدار کے لیے چمکنے لگیں۔ اندر
 پہنچ کر صمدانی اور نیپال نے ٹوکروں پر بے دردی سے اوندھادیے اور قیں
 قیں کی آواز نے گھر سر پر اٹھا لیا۔

مسٹر ٹامی جو سپوٹے کے درخت کی چھاؤں میں ٹانگیں بچھلائے آرام سے
 سو رہے تھے اس اچانک ہنگامے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور قیں قیں میں اپنی
 بے سُرری بھوں بھوں کا اضافہ کرتے ہوئے لپکے۔ صمدانی اور نیپال کی اجنبی شخصیتوں
 نے ان کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی، اور وہ شور مچاتی ہوئی بطخوں کو نظر انداز کر کے
 انھیں دونوں پر غصہ اتارنے لگے۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ان ہنگاموں کی جڑ یہی
 دو شخصیتیں ہیں۔

نیپال اور صمدانی اپنا اپنا انعام لے کر چلے گئے تو اس کی بیوی نے بہت
 ہی چاؤ سے پچکار تے ہوئے ان گدڑیوں کو الگ کر دیا اور بندھی ہوئی ٹانگوں
 کی سستلی کو کاٹ کاٹ کر انھیں صحن میں چھوڑتی گئی۔

قیں قیں قیں قیں۔ گویا کہہ رہی ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ تم نے
 ہمارے پاؤں کی زنجیریں کاٹ دی ہیں۔ قیں قیں قیں۔ ہمارے بیٹوں صمدانی
 اور نیپال نے غالباً ہمیں تمہارے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ قیں قیں۔ لیکن
 ہم تم سے خفا نہیں ہیں۔ اور مسٹر ٹامی اس ختم نہ ہونے والی قیں قیں سے
 جھجھکا کر ان پر لپکے۔

اُجلی پرچھائیاں

اُجلی پرچھائیاں

اپنے پروں کو زور زور سے ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی یہ مچلی گول مول پریاں
اپنے بھاری بھرکم بدن کو زمین سے بہت اونچا اٹھا لینے کی کوشش میں خود مامی ہی
پر گر پڑیں تو بوائے ہوت ہات کمرے مامی کو بھگادیا اور قیں قیں کا شور مچا ایک بار پورے
نور شور سے بلند ہوا اور مامی کی درندگی کے خلاف شاندار مظاہرہ کیا گیا۔

اس کی بیوی مامی کی اس جسارت کو برداشت نہ کر سکی اور مسٹر مامی کنبے سے
باندھ دینے گئے اور نہایت اطمینان سے درختوں کے تنوں میں بھگی ہوئی نالیوں میں بچ
پنچ کریں مچلی کی پوٹلیاں سارے باغچے میں لڑکھنے لگیں۔

اس کی بیوی کی خوشی کو دیکھ دیکھ کر اس کی مسرتیں دو بالا ہو گئیں۔

سوپا میں حیار لیے آؤ آؤ کے نغمے بکھرتی جب وہ شاداں و فرحاں صحن میں جوار کی
بارش کرنے لگی تو قیں قیں کرتی ان ساری کی ساری مچلی پوٹلیوں نے کچھ ذرا پس پیش
کرنے کے بعد اس کو بے تکلف گھیر لیا اور وہ گلاب توڑ کر ٹوکری میں رکھتا ہوا اس منظر کو ٹری
پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

پانچویں دن صبح کو معمول سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ رضائی پھینک کے
اٹھ بیٹھا۔ اس کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا — کہاں چلے آپ، اور تیکے کے نیچے
سے سوٹر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا — سوٹر مینتے ہوئے اس نے پوچھا۔
تم جاگ گئیں آخر —

ابھی ابھی بطخوں کو دیکھ کر آئی ہوں — انڈا تو ایک بھی دکھائی نہ دیا۔ اس
کے ساتھ ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

جالی دار محل سرکار دروازہ کھول دیا گیا تو چوہنیں جالی کے باہر نکال کر قیں قیں

اُجلی پرچھائیاں اُجلی پرچھائیاں
کرتی ہوتی بطخوں کی قیادت میں سب کی سب نئی نئی دلہنوں کی طرح شرماتیں لجاتیں سہمی
سہمی بانہر نکل آئیں۔

قیں قیں قیں۔ جیسے اُٹدے نہ دینے کے لیے معافی مانگ رہی ہوں۔
اس کی بیوی نے آج وقت مقررہ سے پہلے ہی درختوں کو پانی دینا اس لیے مناجا
سمجھا کر کل دن بھر اس کی بطخوں نے چوں کندی کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی اس لیے کم از کم
بہتی نالیوں ہی میں ان کے اُشان کا انتظام ہو سکے۔

کیلے کے درختوں کے جُھنڈ میں چھپے ہوئے حوض کا پانی چھوڑ کر اس نے محل کی پوٹلیوں
کو اس طنز بانگ دیا اور خود گلاب توڑنے میں اس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔
”آج پھول والے کی دکان سے واپسی میں۔۔۔ میں ذرا پاشومیاں کی
طرف بھی ہوتا ہوں تاکہ اس کے مشورے سے کسی نہ کسی طرح اپنی بطخوں کو نندی بھیجے گا
انتظام ہو سکے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے کہ پانی ان کے لیے ضروری ہے۔۔۔ دیکھئے نا اب
کس قدر چیل میں ہیں۔۔۔ اس کی بیوی نے کیلے کے درختوں کی طنز ہاتھ اٹھاتے
ہوئے کہا اور اس نے ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے دو تین ٹہرے بڑے گلاب
اس کے بالوں میں اُڑس دیئے۔

قیں قیں کرتی نرم نرم تھمی سٹی بطخوں کے بہت پاس کھڑی ہوئی اس کی بیوی
بورے پر جوار بکیر رہی تھی۔۔۔ وہ اُٹدوں پر تاریخ درج کر کے اسٹیں ایک چھوٹی
سی ٹوکری میں رکھ چکا تو اس کی بیوی نے اس سے کہا۔۔۔ پاشومیاں نے جو بات
کہی ہے اس میں صداقت ضرور ہوگی۔۔۔ نیا مقام ہو تو واقعی نا مانوس ہونے سے

جانور خائف ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل دو کی بجائے چھ اٹڈ نے کل جائیں۔
مسٹر ٹامی دم ہلاتا بطخوں کے قریب سے گزرنے لگا تب بھی وہ اطمینان سے جوار
کھاتی رہیں۔ نہ قیس قیس کا شور بلند ہوا اور نہ خود ٹامی نے بھون بھون کرنے کی زحمت گوارا کی
— کیوں کہ ان میں سمجھوتہ ہو چکا تھا اور مسٹر ٹامی سمجھ چکے تھے کہ اب یہ بھی برابر
کی حصہ دار ہیں۔

ساتویں دن اس کی بیوی کا اندازہ صحیح نکلا۔ محل سرا کی شہزادیاں باہر نکل کر
چہل قدمی کرنے لگیں۔ اس نے جالی دار محل سرا میں داخل ہو کر پانچ اٹڈ سے چن
لیے اور ان کو لگی ہوئی بیڑا احتیاط سے دھونے کی تاکید کرتے ہوئے بوا کو دے دیے۔
دھو دھلا کر پاک صاف اٹڈوں کو بوانے اپنے پلو سے خشک کر دیا تو وہ ان پر
بدستور تاریخ ڈال کر ٹوکری میں رکھ آیا۔

اس کی بیوی حوض کی مشیر پر کھڑی گلاب کی اونچی ٹہنی کا آخری پھول توڑ چکی تو
اس کے گالوں کو پھولوں سے سہلا کر اس نے اس کے بالوں میں گلاب سجا دیئے۔
ہلکی سردیوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ کل اس نے
چھ آنے کے بجائے آٹھ آنے میں پھول بیچ لیے تھے اور آج آٹھ دو آنے زیادہ ہی
مل جانے کی امید تھی۔ سائیکل کے ہینڈل پر بیٹھی مانگ کر وہ چل پڑا تو نظروں سے
اوجھل ہونے تک اس کی بیوی اس کو کھڑکی میں سے دیکھتی رہی۔

شام کو جب وہ سب کی سب اپنے جالی دار محل میں بیٹھ کر گپ شپ لڑا رہی
تھیں تو وہ بلیڈ ہاتھ میں لیے آہستہ سے دروازے کا ایک پٹ کھول کر اندر گھس گیا
اس ناگہانی آفت سے محفل میں ایک ہڑبونگ مچ گئی لیکن اس نے جی کڑا کر کے ان میں

اُجلی پرچھائیاں
 سے ایک کو دلوچ لیا اور داپنے پنجے کے درمیان مہین سے پردے کو لمبید سے تراش
 دیا۔ ایک کے بعد دوسری کی باری آئی اور دوسری کے بعد تیسری کی اور یہی
 عمل کوئی پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کا ہاتھ لہولہاں ہو گیا
 تھا۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ کل جب وہ انھیں ندی میں اتارے گا تو سب کی سب اسے
 معاف کر دیں گی۔

اس دن سے روزانہ انڈوں کی تعداد میں اضافہ ہونا لگا۔ آٹھویں دن
 سات — نویں دن بارہ — اور دسویں دن ایک دم اٹھارہ لیکن گیارھویں دن
 یہ تعداد یکایک گھٹ کر صرف تین ہو گئی۔

گیارھویں دن صرف تین انڈے نکلے تو اس کی بیوی نے اس بات پر یقین نہ کیا
 اور بوا سے بھاتی ترکاری کا حساب لینا چھوڑ کر وہ رسوئی گھر سے نکل آئی۔ اس کو تیز
 تیز اس طرف آنا ہوا دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی کا غلط مفہوم لیتے ہوئے
 اس کی بیوی نے کہا مجھ کو یقین تھا کہ آپ مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن بہت جلد
 وہ جان گئی کہ وہ صرف اس لیے ہنس رہا تھا کہ اس کی بات کو مذاق سمجھ رہی تھی۔

حوض پر بیٹھا وہ انڈے دھونے لگا تو اس کی بیوی نے حوض کا پانی چھوڑ دیا
 اور دیکھتے کے دیکھتے ایک روپہلی ناگن ایک نالی میں بل کھانے لگی۔ اور قیں قیں کرتے
 ساری لٹخیں اس روپہلی ناگن پر ٹوٹ پڑیں۔ اس کی بیوی نے اس کی دل کی کیفیت
 سے نا آشنا اپنے ہی حال میں مگن چلی چلی لٹخوں کو رحم طلب نظروں سے کچھ اس انداز
 سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تم سب کی سب مسلسل تین روز سے ندی کا سیر کر رہی ہو
 اور وہ دن دن بھر دھوپ میں بیٹھے ستھاری رکھوالی کرتے ہیں اور میں یہاں بات

اُجلی پرچھائیاں
 کرنے تک کو ترس جاتی ہوں۔ اتنے دن کے بعد کل جب شدید بارش ہوئی تو وہ
 سسرپاؤں تک بھیگے ہوئے گھر آئے تھے لیکن آج تم نے اٹدے کم کر دیئے۔
 شام کو جب وہ اپنی قیس قیس قیس کا کورس نکاتی ہوئی فوج لے کر گھر پہنچا تو زینو جانی
 بھی اس کے ساتھ تھے۔ زینو جانی کی غیر متوقع آمد پر وہ آداب و سلام کے اخلاقی فرائض
 تک بھول بیٹھی اور سہجانی اور بچوں کی بجائے جھٹ سے اس نے زینو جانی سے اپنی باتوں
 سے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑے اور بہت ہی مشفقانہ انداز سے کہنے لگے: ”تم میاں بیوی
 نے یہ بہت اچھا کام کیا۔ یہ جانور بڑا منفعت بخش ہے۔ مجھے ان دوسالوں میں زراعت سے
 زیادہ اسی دھندے میں فائدہ ہوا۔ اب تو اپنے گاؤں کے قریبی تعلقوں اور ضلع میں بھی
 میں ہی اٹدے سپلائی کرتا ہوں اور پھر یہاں ندی کی وجہ سے تنہیں تو آسانیاں ہیں۔
 باتیں کرتے کرتے وہ سامنے رکھی ہوئی بٹ میں سے آستین چڑھا کر بھیگی ہوئی جوار کھال کھال کر
 بچھے ہوئے بوسے پر پھینکنے لگے تو قیس قیس قیس کی منظر بطینس جوار پر ٹوٹ پڑیں۔ وہ چپکے سے
 ن کے پاس بیٹھ گئے اور پکڑ پکڑ کر ایک ایک کو دیکھنے لگے۔ بچوں کے نیچے ابھری ہوئی چڑے
 لگتھلیوں کو دبا دبا کر وہ نہایت غور سے دیکھتے رہے اور آہستہ آہستہ ان کے چہرے
 تابشاشت غائب ہوتی گئی۔

قیس قیس کی آوازوں کے سوا کسی نے کچھ دیر بات تک نہ کی۔ بہت ہی
 بی ہوئی آواز میں زینو جانی نے کہا چارچھ کو چھوڑ کر سب کی سب بوڑھی ہیں۔
 یل وقفے سے ایک دو جھول میں کچھ اٹدے دے دیں گی۔ کس سے خریدی ہیں تم نے
 بچھ بطینس۔ بیچنے والا بڑا گھگھ معلوم ہوتا ہے۔ بے ایمانی کی حد کو ہی لچنے۔ اور

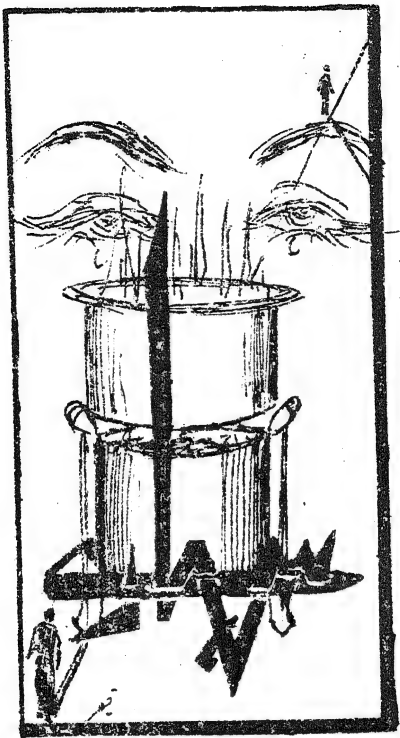
اُجلی پرچھائیاں

اُجلی پرچھائیاں

اس کی بیوی سوچنے لگی کہ اپنی دل کی دنیا کو اُس نے جس دھرتی پر رکھا تھا اس دھرتی کے پیچھے بے شمار لرزے چھپے ہوئے ہیں اور جن کو کسی انسان ہی نے چھپا رکھا ہے۔

صبح کو وہ اٹھے تو ایک انڈا بھی ہاتھ نہ لگا۔ پھول توڑتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا۔ ”کل دن میں آپ کے ندی پر جانے کے بعد مکان دار صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے کہ دو چار دن میں آکر وہ کیلے کی پھنیاں لے جائیں گے۔ البتہ آئندہ سال آدھا میوہ ان کا ہوگا اور آدھا اپنا۔“

ہنسنے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے حسب معمول تین چار بڑے بڑے گلاب اپنی بیوی کے بالوں میں سجادیئے تو اس کی بیوی نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انتہائی لجاجت سے کہا۔ ان کو بھی نیچ دیتے ہیں نا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر نرمی سے اس نے گردن جھکالی۔ اور وہ نظریں نیچی کیے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔



جب وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی تو چادروں کی خوشبو نے پہلے اس کا سواگت کیا
 بیسی داس ہری داس اگر وال رات بھر اپنی بے ہنگم تو میرا اس کو دکھانا رہا۔ لیکن بیگم نو عمر ہونے
 ، باوجود مشتاق تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ بڑی توند والوں کو کس طرح رجھا یا جاسکتا ہے
 بیگم نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اس لیے کہ سیٹھ بیسی داس، ہری داس اگر وال شہر کا
 ب سے بڑا غلے اور گرمی کا بیوپاری تھا پہلی بار جب بیگم نے سیٹھ کے ساتھ رات بسر کی تھی
 وہ اس کو اتنا خوش نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ وہ اس بات سے واقف تھی کہ سیٹھ خوش ہو جائے تو وارک
 سے ہوجائیں گے لیکن باوجود خوشی کے وہ ٹیپہ پالتھات نہ کر سکی سیٹھ بیسی داس ہری داس اپنی انتہا
 سے قریب تر پہنچاتا تو بیگم کو ابھاسیاں سی آنے لگتیں۔ مرد کے جسم کی حدت سے
 مایکی ہوئے اس کے سانسوں کی گرمی سے بیگم خوب واقف تھی لیکن سیٹھ بیسی داس
 ، داس اگر وال سب سے مختلف تھا یا بیگم نے کچھ ایسا محسوس کیا تھا کہ وہ سب سے
 صاف ہے۔ نہ اس کی سانسوں میں وہ حدت تھی جو عورت کے جسم کو گھلا سکے، نہ بدن
 میں وہ گرمی۔ بچھا ہوا کہ وہ بیگم کے سامنے کھڑا ہو گیا تو بیگم نے نفرت سے منہ پھیر لیا

اجلی پرچائیاں
رات بھر میں صدف ایک باریک مشک اس سے قریب ہو سکی تھی۔ وہ بھی اس لیے کرات
بھر کی قیمت چکانی تھی۔ پوچھنے سے پہلے ہی سیٹھ ہنسی داس ہری داس اگر وال چلا
گیا۔ جاتے وقت اس نے کہا۔

”بیغم تم بھوت سندر ہو۔ ہمارا من نہیں بھرا بیغم۔ بیغم تم ہم سے پریم کرونا۔ ہم
تمہیں بہت لڑا دیں گے۔“

اور ایک نہیں دو نہیں پانچ روپے کے ایک نئے نوٹ سے سیٹھ ہنسی داس
ہری داس اگر وال نے بیگم کو نوازا بخشش کے طور پر رقم بیگم کے لیے کچھ معمولی نہ تھی لیکن
وہ صرف اتنا سوچ سکی کہ خوش نہ کرنے پر بھی سیٹھ جی نے پانچ روپے دیے ہیں لیکن
اب بھی سیٹھ سے اس کی نفست کم نہ ہوئی۔ وہ کہہ کر سے باہر چلا گیا تو ستر پر پڑ کر بیگم نے آنکھیں
بند کر لیں۔ کبھی کچھ، کبھی کیکڑا، کبھی لوہار کی دھوئی اس کے تصور میں گھومنے لگی۔ اس
وقت اس کا دماغ خالی خالی سا تھا۔ اس خالی خالی دماغ میں کہیں سے ایک پاؤں لگی
پکھال گھس آئی۔ پھر اپنتا ہوا کچھ، کانپتا ہوا کیکڑا، لمبی سسپس بھرتی ہوئی لوہار کی دھوئی
پاؤں لگی پکھال سب گڈمڈم ہوجاتے اور ننگا، سیٹھ ہنسی داس ہری داس اگر وال بیگم کو
رجاتا۔ ”بیغم ہم تم کو بہت لڑا دیں گے۔“

سیٹھ کی جیب سے بخشش کے طور پر پانچ روپوں کا نکل جانا بجلے خود ایک بھڑ
تھا۔ بیگم کو یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی اس کو ایک رنگین سیٹھ سے سابقہ پڑا تھا۔ رزیدنسی
میں اس کی کٹھیاں تھیں لیکن چلتے وقت اس نے چوٹی بیگم کے ہاتھ پر رکھی تھی تو بیگم نے
لوٹاتے ہوئے کہا تھا کہ اس چوٹی کو شہر کے سب سے زیادہ بخیل آدمی کو دے دو۔ اور
سیٹھ نے چوٹی اپنے ہی جیب میں محفوظ کر لی تھی۔ جب سیٹھ دروازے سے باہر نکلا تو

بدر بھائی نے اپنا انعام طلب کیا۔ سیٹھ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ بیگم نے اس کی جیب خالی کر لی ہے۔ بدر بھائی دروازے میں داخل ہوا تو بیگم نے کہا کہ بہت ڈنگیں مار رہے تھے بدر بھائی بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں۔ دل کاغنی معلوم ہوتا ہے۔ انعام اکرام تمہیں اچھا ہی ملا ہو گا۔ بدر بھائی نے رنگریز کوماں کی کالی دی تھی لیکن کالی زبان سے ادا ہوتے ہوئے اس کا گلہ رند ہو گیا تھا۔ بیگم سمجھ نہ سکی تھی کہ بدر بھائی جو سارے ملک کی سیاست پر ماں کی کالی شامل کر کے تبصرہ کر دیتا ہے آج اتنا دل گیر کیوں ہے۔ بیگم نے صنفِ اتنا پوچھا کیا بات ہے بدر بھائی۔ لیکن بدر بھائی نے کچھ نہ کہا، جب بیگم نے بہت اصرار کیا تو وہ مسکرانے لگا اور اس انداز سے بات کہہ دی جیسے کچھ سہا ہری نہ تھا۔ کہنے لگا ”کل صبح سے کچھ کھایا پیانہ نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے اس سیٹھ کو لے آیا تھا۔ سالا کہنے لگا ادھر دہلیز میں پاؤں دھرا نہیں کہ انعام و اکرام کی بات شروع کر دی۔ اب پوچھتا ہوں تو صاف جمل دے گیا حرامی“

لیکن آج رات بیگم نے سیٹھ بنسی داس ہری داس اگر وال کو بہت خوش کیا تھا۔ سیٹھ جاکچا تو وہ پچھلی باتیں سوچتی ہوئی بستر پر انگرٹائیاں لیتی رہی۔ غنودگی کے عالم میں کچھ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیدار ہو کر کرڈ میں لیتے ہوئے وہ کچھ نہ کچھ سوچنے لگتی کہ نیندا سے سچر دبوچ لیتی۔

جاگتے رہنے اور سوتے رہنے کی یہ درمیانی کیفیت بس ختم ہی ہوتی تھی کہ خوشبودار چاولوں کے بھپکے نے بیگم کو مسحور کر دیا۔ بیگم سمجھ گئی کہ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگر وال کے بھیجے ہوئے چاول اور گہنی بوڑھی شہرتن بانی بڑی فراغ دلی اور بے دردی سے منسکر کر رہی ہے۔ یہ چاول اس کے لیے سیٹھ نے تحفے میں بھیجے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ انہیں بہت حفاظت سے اپنے چھوٹے بھائی مہن تک پہنچا دے۔ جو ایک

اجلی پر چھائیاں

غریب پر در حاجی صاحب کے پاس روکے سوکھے ٹکڑوں پر گزربہ کر رہے ہیں۔ لیکن کھوسٹ شہر اتن تو جیسے اس کی مالکن نبی بیٹی تھی۔ بیگم کی آنکھوں میں آنسو اٹھنے لگے۔ چادر کو ایک طرف مچھینک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کپڑے درست کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ شہر اتن بانی سامنے دالان میں سانچے کو ٹکڑوں کی دہکتی ہوئی انگلیٹھی کے پاس بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ بیگم نے انگلیٹھی میں دیکھتے ہوئے سانچے کو ٹکڑوں کو دیکھا تو اس کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ کون سے اس کے سینے کے اندر دھک رہے ہیں اور اس کا سینہ بھی ایک انگلیٹھی ہے، جس میں اس کے جذبات اس کی خواہشیں جل جل کر دم توڑ رہی ہیں۔ بیگم باہر نکلی تو اس کی پہلی غور شنید نے اس کو چھیڑا۔

”وہی سٹھانی اب بیدار ہوئی ہیں۔ رات بھر سیٹھ جی کا توند سہلا سہلا کر تھک گئی ہوں گی بے چاری۔“

بیگم نے بھوں چڑھا کر کن انگلیوں سے غور شنید کر دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ آج مہارانی کا پارہ صبح صبح ہی چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے وہ چپکے سے کھسک گئی۔

بیت الخلاء سے باہر آ کر دروازہ کھینچتے ہوئے دادھانے کہا: ”رات ایک کلومے سے سابقہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ یوں ناک بھول چڑھا رہا تھا جیسے حوروں کے ساتھ ہی سو سکتا ہے حرامی۔ میں نے آنکھ ماری تو کہنے لگا اتنی بے تکلفی پسند نہیں مجھے۔ جیسے سو کی اولاد مجھ سے نکاح کرنے ہی آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا سرکار میں آنکھ ماروں یا ٹانگ ماروں اپنی قیمت وصول کر لیجئے اور بس پوچھنے لگا وہ بیگم کہاں ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ تجھ پر زلفت ہیں صاحبزادے۔ میں نے کہہ دیا کہ یہاں سب بیگمیں ہی ہیں۔“ وہ ”نام کی کوئی بیگم یہاں نہیں رہتی۔“ کہنے لگا میری بیگم یہیں رہتی ہے۔ میں بھی جلی ہوئی تو تھی ہی

اُعلیٰ پر چھائیاں
 کہہ دیا۔ حضور آج آپ کی بیگم ہنسی داس ہری داس اگر وال کی گود گرم کر رہی ہیں۔ یقین
 نہ ہو تو ادھر جا کر دیکھ لیجیے۔ بے چارہ چپ چاپ لوٹ گیا۔ کوئی سچا عاشق معلوم
 ہوتا ہے تیرا۔“

بیگم کے سینے میں دھکتے ہوئے سانچے کوٹلوں کو رادھا نے جیسے ہوا دی۔ کھوسٹ
 شہزادہ انیسویں پر سچا پھل رہی تھی۔ چھوٹے ہی بیگم نے کہا کہ جھوٹے ہوں یا سچے ہوں عاشق
 بہر حال میسر ہی آتے ہیں۔۔۔ تجھے پوچھتا ہی کون ہے۔ کمانی میں ہوں اور کھاتے تم
 سب ہو۔ میرا جسم تو بس اوکھلی ہے۔ دن رات مٹولوں سے کوٹا پیٹا جاتا ہے۔۔۔ دونوں
 ہاتھ جوڑتی ہوں، تنھو ہے ان ہاتھوں پر کہ انھیں ہاتھوں سے سمیٹوں لیکن یہی ہاتھ پھر
 خالی کے خالی رہیں۔ سوچتی ہوں میں بھی اپنا ٹھکانہ بدل دوں۔

”کیا کرے گی ٹھکانہ بدل کر اور پھر جائے گی بھی کہاں۔ کیا لوگوں نے دروازے
 صرف اسی لیے لگا رکھے ہیں کہ ایک دن تو ان میں داخل ہوگی“ شہزادہ نے شدید۔

”آخر کمال، شائستا اور رشیدہ بھی تو اسی گھسٹے کھاتے ہیں کمیشن کٹوا دیا اور اپنے
 ام گھر میں۔ میں بھی کمیشن ہی پر کاروبار کیوں نہ کر لوں۔ ابھی دھوپ ہے جو لوگ بدن
 سینکے کے لیے آ بھی جاتے ہیں۔ یہ دھوپ ڈھلنے لگے گی تو ہیک انگلی پھروں گی۔ تم لوگوں کا
 بچہ تب ہی ٹھنڈا ہو گا۔ سٹھانی ہوں تو میں ہوں، عاشق آتے ہیں تو میسر ہی آتے ہیں
 ان دام ہی میری گرہ میں نہیں رہتے۔ یہ سب کچھ تو سنا ہی۔ اب جو مجھے ”بخشش“ ملتی ہے
 اس پر سبھی لوگ ہاتھ صاف کرتے ہیں اور میں آنکھیں بند کر کے ہر تھوڑے کے پاس
 دقتی چھڑتی ہوں۔“

شہزادہ ابائی گھاگھٹیں سمجھ گئی کہ جو تیرا دھا اور رشیدہ پر برس رہے ہیں

اُجلی پر چھائیاں

سہارے

وہ ہر سچ کر انھیں کے سینے پر لگ رہے ہیں۔ اس سے انکار تو شہر اتن بانی نہ کر سکتی تھیں کہ لوٹدیا پر مرنے والوں کا ایک انبوہ ہے۔ عمر کے ساتھ اللہ صاحب نے صورتِ شکل بھی دی ہے مزاج کی تندہی ہے سو خنوروں کے پیچھے اس طرح چھپ جاتی ہے کہ آنے والے آلو کے پٹھے ہی ہی کرتے اور ہاتھ جوڑتے رہتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن پہلے ہی داؤں نہ لگایا تو لوٹدیا ہاتھ سے نکل ہی تو جائے گی، اور اس کو ہاتھوں ہاتھ بازار میں لینے کے لیے کھموجے مسندوں کا میلہ سا لگ جائے گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود شہر اتن بانی نے ہتیار ڈال دینا مصلحتاً نامناسب سمجھا۔

”کہنے لگی بیگم یہ مزاج کی تانا شاہی چھوڑ بھی چکوا اب۔ بہت سہم چکی ہوں۔ نازِ نخی کے تو ستھے ہی، سمجھتی تھی کہ مجھ سے نہیں تو کس سے لاڈ ہوں گے۔ لیکن یہ لعن طعن یہ غصے، یہ برہمی، یہ سب سہم نہ سکوں گی۔ نوک جھونک کرنی ہو تو اپنے ہونے سوتوں سے کر دیجو۔ میں نگوڑی کوئی باندی سچی نہیں ہوں جس نے پتہ چل کر چھینک دیا ہو۔ میری ماں سوتن بانی یوپی بھر میں مشہور تھیں! کیس رنڈیاں تھیں اس کے کوٹھے پر اور وہ بھی ایسی جن کے پاس شہر بھر کے نواب زادے اور رئیس آتے تھے قسمت چھوٹے ہیں جو یہاں دو دمڑی کے دھندے کے لیے آن مری ہوں۔“

بیگم کا پارہ بھی چڑھ چکا تھا۔ ویسے بھی اس کے تلون سے اس کی ساتھ والیاں حکمتی تھیں۔ دوچار مقبول عام لڑکیاں اور بھی شہر اتن بانی کے کوٹھے سے دھندے پر جاتی تھیں لیکن ان کے انداز دوسرے تھے۔ دلال کسی کو لے آتا اور اپنا کمیشن کاٹ لیتا بانی جی مشاطگی کرتی اور اپنا کمیشن دھرتیں جو کچھ بچ رہتا وہ تو کم از کم ہر سونے والی کی گھر میں محفوظ ہو جاتا۔ بات جتنے پر طے ہوتی اس کے نصف کے لیے تو کوئی جو کم نہ ہوتا

اجلی پر چٹائیاں

سہارے

پھر انعام و اگر ان بخشش یا دین الگ ہوتی۔ بیگم کا معاملہ دوسرا تھا۔ گھر بار تو اس کا تھا نہیں جو وقت پر دوسروں کی طرح بن سہو کر چلی آتی۔ شہزاد بائی ہی کے کوٹھے سے کما شروع کیا تھا۔ شہزاد بائی ہی کے کوٹھے پر اس کی تھانہ تھی۔ ایک فوجی کرنل کے آوارہ لوٹدے نے اس کی تھانہ ماری تھی۔ صبح وہ جانے لگا تھا تو بیگم کی بیگم کی ہوئی انگلیوں کو اپنے رومال سے پونچھتے ہوئے اس نے یقین دلایا تھا کہ میں بہت جلد آؤں گا۔ جب وہ جا چکا تو بیگم نے دل کے قریب کسی نشتر کو محسوس کیا جو کبھی کسک بن جاتا، کبھی درد اور کبھی درد کی دوا اور جب وہ سو کر اٹھی تھی تو غسل خانے لے جانے تک بائی جی اس پر سو سو با تصدق ہو ہو گئیں۔ نیا فراک نئی شلوار ٹائیلٹ کمانگس اور بیس روپے بیگم کے حصے میں آئے۔ اس نے اپنی ساتھ والیوں سے سنا تھا کہ بائی جی نے پورے چار سو روپے انیٹھ لیے ہیں۔ لیکن بیگم کو ان باتوں کی پرواہ نہ تھی۔ رکشا میں سوار ہو کر بدرجائی کے ساتھ سو قین سے وہ حاجی صاحب کے مکان پر اس طرح پہنچی کہ راہ چلتوں نے اس کی انگلیوں کی پوروں کو تک نہ دیکھا۔ کسی پیشینہ و رعرت کا حاجی صاحب کے گھر میں جانا کوئی مذاق نہ تھا، وہ تو حاجی صاحب جانتے نہ تھے کہ بیگم کوئی پیشینہ و رعرت ہو گئی ہے۔ دس روپے اس نے اپنے بہن اور بدرجائی کو دے دیئے۔ پانچ روپے بدرجائی کے حصے میں آئے۔ پانچ کا ایک نوٹ خود اپنی پرس میں رکھ کر وہ خوش خوش اپنے گھر لوٹ گئی۔ شہزاد بائی کا گھر اس کا اپنا گھر ہی تو تھا۔

لیکن آج پھر دنیا بھر کی سنسناتی ہوئیں اس کے دماغ میں گھس آئی یقین جن میڈ پر اس نے شہزاد بائی کی دہلیز کو کھٹکڑا رکھا تھا جس آس میں اپنی تنک مزاجی کے باوجود شہزاد بائی کا سرد و گرم سہتی رہتی تھی۔ وہ امید وہ آس آہستہ آہستہ ایک حسرت

اُجلی پر چھائیاں
 بن کر اس کے دل میں آباد ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا اب دہرا ہی کیا ہے یہاں
 جھوٹی آشاؤں کے سوا۔ ہمت کر کے اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ نکل ہی چلو بیگم یہاں
 سے۔ اس کے ذہن نے آہِ واحد میں فیصلہ کر دیا تو وہ بائی جی پر برس پڑی۔

”چھوڑ کر ہی رہوں گی آج تمہارا گھر۔ ساری اکڑ نہ نکل جائے بائی جی تو ڈبل چوڑے
 اور کتھے کاپان کھا کر تنوک دینا میسے منہ پر۔ کماقی میں ہوں، کھاتے سب ہیں اور
 نزلہ اتارنی ہو تو اُلٹے مجھ ہی پر۔ غصہ میں تمہارا سہتی ہوں، گالیاں میں تمہاری
 سنتی ہوں، یہاں تک کہ مارنے کے لیے تم نے ہاتھ تک اٹھایا۔ بدرجہا بیچ میں نہ آتے
 تو شاید مار سبھی دیتیں۔“ بیگم کی آواز سہجائی اور وہ رورور کرین کرنے لگی۔
 ”دل میں جو بھی ہے پورا کر ہی کیوں نہ لو۔ مجھے تاؤ میں لا کر چاہتی ہو کہ میں گھر سے نکل
 جاؤں۔ اس لیے کہ لوگ تم پر انگلی نہ اٹھائیں تصویر میرا ہی ٹھہرے کہ میں خود بھاگ نکلی۔
 صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتیں۔ لیکن سن رکھو چلی جاؤں گی تو دود و دن ہانڈی نہیں
 چمڑے گی اس گھر میں۔“

ہانڈی کی بات سن کر بائی جی نے کہا: ”اس طرح بہت مت اتراؤ بیگم۔ اتنا
 غور راجھا نہیں ہوتا۔ تم چلی جاؤ گی تو ہم سب کی قسمت اپنے پلوں میں باندھ کر نہیں لے جاؤ
 جو ہم بھوکوں مرنے لگیں۔ تم کیا مارو گی ہمیں۔ جلانے والے کی قدرت سبھی تو کچھ ہے، اور
 پھر میں کب تمہیں گھر سے نکالنے بیٹھی ہوں، جوانی کے بھرے پر تم ہی تو چھوڑ جانے کی
 دہمکی دیتی ہو۔“

بیگم نے بائی جی کو بیچ ہی میں ٹوک دیا۔ کہنے لگی: ”اس گھنڈ میں نہ رہنا بائی جی۔
 کہ لو نیا دہمکی دے کر لے جائے گی۔ جوانی ہی کو سب کچھ سمجھتی، بل بوتے ہی کا

سہارے

اجلی پرچھائیاں

غروہ ہوتا تو اتنا تک ایک ایک کو ٹھابساتی چرتی۔ یوں تمھاری چوکھٹ سے چپکا کر نہ رہ جاتی۔

بائی جی نے خیریت اسی میں سمجھی کہ تنھوڑی سی نرمی لہجے میں پیدا کر لی جائے۔ بیگم نے

جتنی بار غصہ کیا اتنی ہی بار غصے میں ایسے جلے بھی کہتی رہی کہ منہ چسلا کر اس کو روک لینے کے

مواقع بھی بائی جی کے لیے پیدا ہوتے رہیں۔ سو بائی جی نے پچکارا۔ جھٹ اپنے پلو کو آنکھوں

پر رکھتے ہوئے بولیں ”بات بے بات کے بگڑ جاتی ہے۔ آگ خود لگاتی ہے، کہتی ہے میں ہوا دیتی

ہوں۔ خود کڑھتی ہے مجھے کڑھاتی ہے جس کو چاہتے ہیں اسی کی بات کڑھوئی معلوم ہوتی ہے

نا بٹیا۔ تجھے دکھ اسی بات کا ہوا نا کہ تجھ سے پوچھے بغیر مجھ نصیبوں جلی نے تیرے چا دل اور

گھٹی پر ہاتھ صاف کیا۔ محبت کی جھوکی ہوں تجھے اپنا سمجھتی ہوں۔ تیرا کھاتے ہوئے بھی غیرت

نہیں محسوس ہوتی لیکن میں ہوتی کون ہوں تیری۔ غلطی میری اپنی ہے۔ تو نے جو کچھ

کہا ہے ٹھیک ہی تو ہے۔“

بائی جی ٹسوے بہانے لگیں تو بیگم کا دل پسیم گیا۔ اور پھر اندھا کیا چاہے دوا کیس

بیگم کب اس گھر کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے دماغ میں سائیں

سائیں کرنے والی ہوائیں اب صبار رفتار ہو گئی ہیں۔ دل کے اطراف کچھ روشنیاں سی پھیل

گئی ہیں لیکن ان احساسات کو چھپائے رکھنا بھی تو تھا۔ سو کچھ کہے بغیر وہ چپ چاپ

کمرے میں جا گھسی۔

بدر بھائی نہ تھا کھٹی پی کر کہیں پڑ رہا ہو گا۔ ایسے مواقع پر وہ جب کبھی موجود

رہتا بیگم کو سمجھا منا کر روک لیتا۔ اس کی موجودگی میں بیگم اس طرح فوری ہتیار نہیں ڈالتی

تھی۔ جتنا ہنگامہ کر سکتی تھی کرتی۔ اپنا ٹرنک چادر اور نیکے اٹھا کر بار بار دروازے کی

طفر ٹھکتی اور بدر بھائی بار بار آڑے آکر راستہ روک لیتا لیکن آج وہ دروازے

ایک پنج جاتی تو بڑھ کر راستہ روکنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ شہزاد بانی چاہتی ضرور تھی کہ بیگم اسی گھر کی رونق بنی رہے لیکن اس کے جاتے وقت راستہ روک لینے سے تو سارا بھرم کھل جاتا۔ ادھر خود بیگم یہی سوچتی کہ اس کی زندگی کا کوئی بہت پیارا جذبہ اسی گھر کے در و دیوار سے وابستہ ہے۔ وہ جیتے جی تو اس گھر کو نہ چھوڑ سکے گی لیکن اس بات کا اظہار کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اس کمزوری کا علم بانی جی کو ہو جاتا تو مگنی کا ناچ نہ پنا دیتیں؟ اس راز سے صنفیدر بھائی واقف تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نہ شہزاد بانی بیگم کو گھر سے نکال سکتی ہے اور نہ بیگم گھر چھوڑ سکتی ہے اور یہ بھی کہ ایک دوسرے کی کمزوریوں سے دونوں ہی واقف ہیں۔

بیگم کے میں جا گھسی تو دیر بھائی اس کو بے اختیار یاد آ رہا تھا۔ آج وہ نہ تھا تو وہ خود کو کس قدر مجبور پارہی تھی۔ بانی جی اس طرح چوڑی نہ بھولتیں تو۔؟ اور وہ کانپ کانپ گئی۔ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگر وال چیکے سے اس کے ذہن میں گھس آیا۔ نہ جانے کیوں اس کو اس بات سے تسکین ہوئی کہ کوئی اس کا خیال کرنے والا تو ہے۔ اس تسکین کے پیچھے پیچھے پاؤں لگی ہوئی پکھال، ہانتا ہوا کچھو اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں اس کے تصور میں اُبھنے لگیں تو اس نے اپنے خیالات کے اڑن کھٹولے کو دوسری سمت میں موڑ لیا۔ اس لیے بھی کہ وہ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگر وال کے خلاف اس وقت کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

کچھڑی دم ہو چکی تھی۔ چاول اور گھی کی خوشبو نے اس کو بھر جھنجھوڑا۔ اس نے سوچا کہ رات کو بھی اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگر وال نے کھوٹی پر ٹٹکے ہوئے کوٹا کے اندرونی جیب سے چکناٹا سے اٹی ہوئی ایک پٹری نکالی تھی اور

اصلی پرچھائیاں

سہارے

حلوہ سوہن کا ایک بڑا سا ٹکڑا اپنی آغوش میں اس کو بچھتے ہوئے اس کے منہ میں رکھ دیا تھا۔ اس نے سوہن پٹی کاٹنے کے بہانے سیٹھ کی انگلی کو کاٹ لیا تھا تو وہ اس مذاق پر بہت خوش ہوا تھا اور اس کو گدگدانے لگا تھا۔ سیٹھ کے منہ میں سوہن پٹی کا ایک ٹکڑا اٹھوٹنے کی جب خود اس نے کوشش کی تھی تو سیٹھ نے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

”بیگم ہم کو وہ مٹھائی کھلاؤ جس میں چینی ڈبل ڈبل ہے۔“ بیگم سمجھ نہ سکی تو سیٹھ نے اس کو پھر ایک بار بھینچا اور اس کے منہ کی طرف اپنا منہ بڑھا کر کہا ”منہ سے منہ ملا کر اپنا جھوٹا کھلاؤ جو بیگم“ لیکن بیگم کو ابکاٹی سی آگئی۔ اس کا جی ملانے لگا۔ اس نے سیٹھ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر منہ پھیر لیا، اور جلد ہی سے کمرے سے باہر نکل کر سوہن پٹی تھوک آئی۔ گو اس کیفیت کو اس نے سیٹھ پر ظاہر ہونے نہ دیا۔ لیکن اس کو کھانے کی ہر چیز سے اس وقت گھن آنے لگی۔ سیٹھ کے تصور سے اس کی طبیعت پھر مکرر مہر رہی تھی۔ جانے کیوں اس کو یہ احساس بار بار مہر ہا تھا کہ ایسی باتیں جس میں سیٹھ سے بیزارگی شامل ہو نہ سوچنی چاہئیں۔

یکایک اس کو بدر بھائی کا خیال آیا۔ مسلسل دو دن غائب رہ کر ایک بار وہ اسی طرح جب واپس آیا تھا تو وہ بہت خوش تھا اس نے چپکے سے بیگم کے کان میں کہا تھا۔ ”پنگلی تیرا وہ آرہا ہے۔“ تجھ کو پوچھ رہا تھا۔ میں نے رات اس کا کام بنا دیا۔ لوٹو ادا کا بُرا نہیں ہے۔ ایک بڑھیا مال پھانس کر لے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا بس آدمیوں کا بدر بھائی جلد ہی۔ بیگم کو سہارا سلام کہہ دینا۔“ وہ کہیں کھوسی گئی تھی۔

”بدر بھائی نے چپت لگا کر کہا تھا۔ کہاں کھو گئی ہے۔ اب وہ آنے کا نہیں۔“

اُجلی پچھائیاں

سہارے

یہاں کی کوئی چیز اس کو پسند نہیں ہے۔ آتا تو اب تک تیرے لیے ہی آجاتا۔ اس کی اڑا بہت اونچی ہے بیگم۔“

”اب بھی میسر لیے تو آسکتا ہے نابدر بھائی“

”اب کیا خاک تیرے لیے آئے گا۔ پیشہ شروع کر کے قریب قریب چھ ماہ تو بچہ ہو ہی گئے ہوں گے۔ آنے والا ہوتا تو اب تک کئی بار آچکا ہوتا۔ تیری قدر اس سے بڑھ کر اور کون کر سکتا تھا لگی جس نے تجھے لڑکی سے عورت بنایا۔“

وہ سوچنے لگی۔ بدر بھائی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ آخر وہ نہ آیا۔ لیکن آج بدر بھائی اس کو ساتھ لے آئے تو۔۔۔ میں اس سے نہیں بولوں گی۔ لیکن وہ لوٹ جائے گا۔ میں اس کے قدموں پر۔۔۔ رکھ کر خوب رولوں گی۔ آہستہ آہستہ وہ اس سے قریب ہوتا گیا۔ آہستہ آہستہ لاتعداد بوسے اس نے اس کے لبوں، نگالوں، آنکھوں اور پیشانی پر جڑ دیے۔ محبت اور پیار کی بہت ملائم اور لطیف فضا نے اس کی ہستی کو اپنی وسعت میں سمیٹ لیا۔ وہ اپنے لبوں پر اس کے بوسوں کی حدت آج بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیگم نے دوشیزگی کے حدود کو پیچھے چھوڑ دیا تھا، اور زندگی کے نئے تجربوں میں اس کے ساتھ ساتھ بڑھنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ اس خوش فہمی میں بیگم کی معصومیت کو قتل نہ تھا۔ جب اس نے اس کے پاؤں پکڑ کر کہا تھا کہ مجھے اس گندگی سے نکال لیجئے نا۔ تو اس نے بیگم کو یقین دلایا۔ اس اعتماد اور یقین پر کہ وہ پہلا شخص ہے جو بیگم کی زندگی میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے بیگم کی معصومیت اور پاکیزگی کی تسلیں کھائی تھیں۔ رات بھر میں جتنی ہی باتیں بیگم نے اس سے کی تھیں اتنی ہی گرمجوش سے اس کی باتوں کا اس نے جواب دیا تھا۔ وہ بار بار میری جملے دہراتا۔ بہت معصوم ہے۔ قسمت نے کہاں لا پھینکا ہے۔

یہ جملے دہراتے ہوئے اس کی باتوں اور حرکتوں پر بار بار ہنستا ہنستے ہنستے

اچھی پرچھائیاں

سہارے

اس کو بیچ کر بے اختیار چوم لیتا۔ کہتا تمہیں بھول جانا بس کی بات نہ ہوگی۔ تمہیں دھوکا دینا بہت مشکل ہے۔

رات بھر اس کی آنکھ تک نہ جھپکی۔ بیگم کو سہی اس نے پلک جھپکانے نہ دیا۔ کیسی یسی نرم نرم سی میٹھی میٹھی سی باتیں کرتا رہا۔

بیکام پوچھ بیٹھا ”مجھے سونے سے پہلے پیر دہوانے کی بری لت ہے بیگم۔ تم روز پیر داب دو گئی نا۔“

بیگم نے کہا تھا ”اب آپ آرام کیجئے میں پیر داب دیتی ہوں“ اور وہ پاؤں دابنے لگی تھی۔ وہ کس قدر فائن انداز سے بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کس قدر پیار تھا۔ پھر بیکام وہ اٹھا اور اس نے یہ کہہ کر بیگم کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا کہ آج کی رات تمہیں چھٹی ہے کل سے تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔ آج میں سونا بھی نہیں چاہتا ہوں۔ پھر بیگم کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ دو کچھ سناؤ نا۔“

”تم اس دلدل میں پھنس کیسے گئیں“

بیگم پس و پیش کرتی رہی۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو اس نے سب کچھ بتا دیا یہاں تک کہ اپنے ماں باپ کا نام بھی۔ جب وہ کہہ رہی تھی کہ اٹدین آرمی نے جس وقت اس کے باپ کو گرفتار کیا تو وہ بھی وردی ہی میں تھا۔ لیکن جب اس کو گولی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اس وقت اس کی وردی تار تار ہو چکی تھی۔ اس کی پیشانی اور گھٹنوں سے لہو برس رہا تھا۔

”اور جب ایک فوجی نے بددوق اٹھائی تو فیر ہونے سے پہلے میری ماں چلتی

اصلی پرچھائیاں

سہارے

چلائی میسے راہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اس وقت میں جھوٹی تھی۔ مجھے اپنا چٹ پن اس وقت بہت کھل رہا تھا مجھے پا کر فوجیوں کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ انہوں نے مجھے کلائیوں سے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پھر یہ کہہ کر ہاتھ جھٹک دیا تھا کہ ابھی جھوٹی ہے۔ اُن کی اس حقارت کو میں اس وقت سمجھ نہ سکی تھی۔ آج سوچتی ہوں کہ اگر میں اس وقت بڑی ہوتی تو شاید میسرے کے مال باپ بچ جلتے۔ بالآخر بد روق کی آواز کے ساتھ میسرے کے مال اور باپ دونوں کی دل دوزخیں بیک تہ تھا میں بلند ہوئیں اس کے بعد کچھ اندھیرے میری طرف بڑھے اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

اتلہ کہتے کہتے بیگم کا کھلا رنڈ دیا۔ بیگم نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں چاکیں تو اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبائی تھیں۔ بیگم جھکی تو اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک پڑا، اور اس کے گال پر گر کر پھسلنے لگا۔ عین اسی وقت اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک قطرہ اس کے گال پر پھسل کر بیگم کے آنسو سے جا ملا۔ بیگم کے زانو سے سر اٹھا کر اس نے بیگم کے اور اپنے آنسو خشک کیے اور اس کو ہنسنے کے لیے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرتا رہا۔ بیگم سوچنے لگی۔ میں کس طرح اس منظر کو جھلا سکتی ہوں کہ اس کی آنکھیں میرے لیے بھیگی تھیں۔ ان آنسوؤں کے مہارے تو میں ساری زندگی بتا سکتی تھی۔ لیکن وہ پھر کبھی نہ آیا۔ یہ سب کچھ اس دنیا میں کس طرح ممکن ہو جاتا ہے۔

ساری باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے اس کے سینے میں کیسی ہل چل ہوئی۔ ایک سمندر تھا جو اٹا اٹا کر آنکھوں سے ٹکراتا تھا، ایک سیخ متقی جو کسی نے آپنچ دے کر سینے میں کھڑی کر دی تھی اس کو یہ ایک خیال آیا۔ خورشید کہہ رہی تھی تیرے لیے کوئی آیا

تھا۔ پوچھتا تھا بیگم کہاں ہے۔ لیکن اس نے پھر خود ہی تردید کی — وہ نہیں ہو سکتا — وہ اس طرح چپ چاپ لوٹ جانے والا کب تھا۔ میں سات پیرزوں میں ابھی ہوتی تو وہ مجھ سے مل کر ہی جاتا — اور پھر اس کے آگے خورشید کی چرب زبانی کہاں چل سکتی تھی بھلا۔ لیکن اس وقت خورشید سے پوچھ لینے کی بھی اس میں تاب نہ تھی۔ وہ بالکل بھول گئی تھی کہ خورشید نے اس آدمی کا تذکرہ کرتے وقت کھلو ہا کہا تھا۔ لیکن وہ تو سرخ و سفید تھا — سینے کے اندر موجیں اارتا ہوا سمندر آنکھوں کے بند توڑ کر جیسے بہنے لگا۔ اس نے نڈھال ہو کر تکیوں میں منہ چھپا لیا اور دیر تک روتی رہی۔ روتے روتے کب اس کی آنکھ لگ گئی اس کو پتہ نہ تھا۔ جب بیدار ہوئی تو خالی پیٹ اس کے پندار کو اذیت پہنچا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بانی جی نے جوٹے منہ اس کو ناشتے پر تک نہیں بلایا۔ حالانکہ اس نے سوچا تھا کہ بانی جی منا سمجھا کر اس کو دونوں الے ضرور کھلوائیں گی لیکن بدرجہا کی غیر موجودگی اس کو کس حد تک بے سہارا کر دیتی ہے۔ اس بات کا احساس اسے رہ رہ کر ہوا رہا تھا۔

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ اس وقت تک باہر نہ نکلے گی جب تک کہ بانی جی یا پھر خورشید یا رادھا اس کو منانے کے لیے نہ آئیں کہ پٹاخ سے دروازہ کھول کر بدرجہائی کمرے میں داخل ہوا۔ اوندھی ٹپڑے ٹپڑے سگم نے گردن اٹھا کر بدرجہائی کو دیکھا تو ایک چمک سی اس کے چہرے پر آتے آتے رہ گئی۔ رہ اس لیے گئی کہ بیگم نے کوشش کر کے چہرے کی چمک کو ادا سیوں اور آنسوؤں کے پیچھے چھپا دیا ورنہ بدرجہائی کی ہمدردی کیسے حاصل ہوتی۔ لیکن اس پر بھی بدرجہائی نے ہمدردی نہ کی تو بیگم نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے اسے گھور کر دیکھا — بدرجہائی بڑے جوش میں اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن بیگم کی سوچی ہوئی

اُجلی پر چھائیاں
 آنکھوں اور بھاری پوٹوں کو دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے بے حس سا کھڑا رہا پھر کچھ
 سوچے بغیر آگے بڑھ کر اس نے بیگم کو اٹھا کر کمر اُگرایا اور بڑی لجاجت سے کہنے لگا کہ چل
 ذرا جلدی سے تیار ہو جا۔

”کیوں۔ میں اب کہیں نہیں چلوں گی۔“

”چلنا کہیں نہیں ہے۔“ ایک ٹائم ”کے لیے اپنے گھر ہی پر آیا ہے۔“
 بیگم کو برا معلوم ہوا۔ وہ بدر بھائی جس کو بیگم نے دل دکھنے پر ہمیشہ اپنا سہارا
 سمجھا۔ آج اس نے بیگم سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو اس قدر اس کیوں ہے۔ کمرہ بند کیے
 اندھیروں کی کیوں ہو گئی ہے، آنکھیں کیوں سو جی ہوئی ہیں تیری۔

”میں منٹ بج کر لیے بھی کسی کے ساتھ اس وقت نہیں رہ سکتی بدر بھائی۔“

بدر بھائی نے پچکارا ”چلو سبھی اب چلو سبھی۔ ٹیرٹری شکل سے آیا ہے۔“

بیگم برس پڑی ”مشکل سے آیا ہے تو آسانی سے واپس کر دو۔“ شخص کو بس
 اپنی ہی ٹیری ہے۔ کسی پر کچھ بیتے۔ کوئی جل کر اندر اندر رکھ ہوتا رہے۔ لیکن پوڈر چہرے
 پر مل کر روشن ہو جائے۔ آنسو اٹا اٹا کر آئیں تو مسکرا مسکرا کر باتیں کرے۔ یہ سب زندگی
 بھر تو ہوتا ہی ہے بدر بھائی لیکن آج نہ ہو گا۔“

بدر بھائی بہت تھکا ہوا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں وہ خود
 بھی جل کر اندر اندر رکھ ہو رہا ہو، صورت تو کچھ ایسی ہی بنا رکھی تھی اس نے۔
 اس نے پھر منت سماجت کی ”چلو مھٹی اتنی اچھی سی ہو۔ مجھ سے اب حجت نہ کرو۔
 میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ لونڈا اتنا نرالا ہے۔ کچھ زیادہ پر ہی راضی ہو گیا ہے۔ رقم
 باقی جی کو دلو ابھی دی ہے۔ بس اب غصہ تھوک دو۔“

اُجلی پر چھائیاں

سہارے

”بائی جی نے رقم اینٹھ لی ہے؟“ بیگم کا پارہ بہت تیزی سے چڑھ گیا۔ بدر بھائی کو پرے ڈھکیل کرو کر سنے نکل گئی۔ کہنے لگی، اچھا تو بائی جی کے کیسل بن کر آئے ہو تم بدر بھائی۔ سولے میری کوئی ہوتی سوتی۔ میں تو منٹ بھگے لیے بھی تیار نہیں ہوں میں نے سارے گھر کا گتہ نہیں لیا ہے۔ ٹھیکہ تو تم نے لے رکھا ہے بائی جی کا۔ کوٹھے بھر میں کیا میں ایک ہی عورت رو گئی ہوں جو گود گرم کرنا جانتی ہے اور سچی تو ہیں نا۔ جو آتا ہے میسرے لیے ہی کیوں آتا ہے۔ زیادہ دام ملتے ہیں تو کچھ کم لے کر کسی اور کو بھجوا دو نا۔

بدر بھائی نے ڈانٹا۔ ”بیگم تیرا داغ روز بروز خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو میرے منہ بھی آنے لگی ہے کسی کو لے آتا ہوں تو خود دالا مال نہیں ہو جاتا ہوں۔ احسان نہیں کرتی ہے تو مجھ پر جو نیرا ٹمپر سہہ لوں۔“

بیگم نے کچھ جواب نہ دیا۔ سیدھی رسوئی میں پہنچ کر سارے چہرے پر اکھ اور کالا پوت آئی اور بیچ صحن میں کھڑی ہو کر چلانے لگی۔ ”بلا لاؤ کون ہے وہ مجھ سے منہ کالا کرنے والا۔ مجھے دیکھو بغیر پیشگی رقم چکانے والا۔ دل بھر کر سولے میسرے ساتھ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بدر بھائی ہکا بکا کھڑا اس کو بغور دیکھتا رہا۔ مزید ڈانٹنے یا جھگڑنے کی اس نے جرات نہ کی۔ چپکے سے اس کے پہلو سے نکل کر باہر کے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگا۔

”کہہ دوں گا جس شخص نے بیگم کی تعریف کے پل تمہارے سامنے باندھ دیے ہیں اس سے کہہ دو کہ بیگم اپنے غصے کے سبب پاگل ہو گئی ہے۔“

بیگم کے کانوں پر سے جیسے شوکتی ہوئی گولی گزر گئی۔ بدر بھائی دروازے کے

اُجلی پر چھائیاں
 قریب پہنچا تھا کہ اس نے آواز دی۔ بدر بھائی کے لیے جیسے یہ آواز متوقع تھی۔ اس نے
 پلٹ کر بیگم کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں علانیہ التجاسی تھی۔

بیگم جانتی تھی کہ بدر بھائی آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگالے۔ پچکار کر منالے۔
 اس لیے کہ اس طویل و غریض دنیا میں ایک بدر بھائی ہی ایسا تنہا جس کو وہ اپنا سہارا
 سمجھتی تھی۔ لیکن آج وہ اس کو بھی پیچھے چھوڑ کر جیسے اتنی دور نکل گئی تھی کہ بدر بھائی
 بھی اتنی دور آ کر سہارا دینے تیار نہ تھا، اور اب جب کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی
 تو اس کی ڈب بانی ہوئی آنکھوں کے آگے بدر بھائی کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا
 تھا۔ اس کے نقوش واضح نہ تھے اس کے خدو خال ظاہر نہ تھے۔

”پہیلیاں کیوں بھجواتے ہو بدر بھائی۔ صاف صاف کہتے کیوں نہیں۔ کون
 ہے وہ۔ لوٹ جائے گا تو کیا لے جائے گا میرا۔“

بدر بھائی نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا ”وہ اسی کرنل کے لوٹنے کا دوست
 ہے۔ تمہاری تعریفیں کر کے اس نے تم سے ملانے کے لیے اس کو میرے ساتھ بھجوا دیا ہے۔“
 جواب دیتے دیتے جب بدر بھائی بیگم سے قریب ہو گیا تو بیگم نے آپنچل سے اپنی
 آنکھیں خشک کر لیں اور اس کا آپنچل کا لک کی نخی سے گزرا ہو گیا۔ دونوں آنکھوں
 پر دو سفید سفید جھنموں اور ہوسے — بدر بھائی بڑے پیار سے اس کو دیکھ رہا تھا۔
 ”کیا تم رات کو اسی کے ساتھ تھے؟ وہ خود کیوں نہیں آیا۔“

”رات گئے مجھے چند شراہی حرامیوں نے تھوڑی سی تکرار پر شہر سے دور موٹر
 رک کر اتار دیا اور مس کالی کو لے کر چلتے بنے میں رات بھر اس وقت سے اب تک
 پیدل چلتا رہا ہوں۔ بھوک اور تھکن سے نڈھال ہوں۔ وہ تو یہیں اپنے گھر کے

اُجلی پر چھائیاں
سہارے
قریب ملا تھا۔ موٹر روک کر میری ہی تلاش میں تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ منٹ دو
منٹ کے لیے چلا آئے۔ لیکن وہ مجھ سے کہنے لگا مجھ میں بیگم کے سامنے آنے کی ہمت
نہیں ہے۔ اس کو میرا سلام کہنا۔ اور کہنا کبھی آجاؤں گا۔

جب اس کا دوست نیچے اترا تو موٹر کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”یہ وہی بیگم ہے جس کی تم تعریفیں کرتے ہو۔“

اس نے جواب دیا ”ہاں وہی بیگم ہے۔ اسی کے پاس تو بھجوار ہا ہوں تمہیں۔“

”بڑی پیاری سی، بڑی معصوم۔“

بیگم نے دالان کی طرف نظر اٹھائی تو رادھا کچھڑی سے بھری ہوئی پلیٹ ہاتھ میں
تھامے شہزاد بائی کو دونوں اے کھا لینے کے لیے راضی کر رہی تھی۔

بیگم بدر بھائی سے مخاطب ہوئی تو وہ شہزاد بائی کو کچھ اس طرح تک رہا تھا جیسے
کہہ رہا ہو بیگم اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی میں نے اس کو پھر فید کر دیا ہے۔ لیکن بیگم کچھ بھی
نہ سمجھ سکی کہ بدر بھائی کی آنکھیں شہزاد بائی سے کیا کہہ رہی ہیں۔

اس نے بدر بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا سہارا لیا۔ ذرا کی ذرا چکر
آجانے سے آنکھیں سوند کر لمحے بھر کو اونکھ گئی۔ اور پھر آنکھیں ملتے ہوئی بولی۔

”بدر بھائی میسرے حقے کی کچھڑی رکھی ہوگی۔ تم ناشتہ کر لو، اور۔۔۔ وہ کون ہے

اس کو ٹھیرالو۔ میں ابھی تیار۔۔۔“ اور اس کا کلا پھر رندھ گیا۔ آنکھیں پھر
ڈبڈبائی گئیں۔ بدر بھائی کے نقوش پھر غیر واضح ہو گئے۔ اور وہ غسل خانے میں گھس گئی۔



سات سال کی ننھی منی جان نے دور تک چمکتی ہوئی ریل کی پٹریوں کو دیکھا تو اس کو یہ خیال نہ آیا کہ پٹریوں پر ادھر ادھر دوڑتی ہوئی ٹرینوں میں بیٹھ کر دور دور کا سفر کرے، بلکہ اس نے پہلی بار یہی سوچا کہ اس پٹری پر یا تو آہستہ خود لیٹ جانا چاہیے یا گورے جانی کو چپکے سے سٹلا کر کہیں دور بھاگ جانا چاہیے۔

لیکن وہ روز چمکدار پٹریوں کو دیکھتا رہا، دوڑتی ہوئی ٹرینوں کے ڈرائیوروں کو ملے بتاتا رہا۔ زبان چڑاتا رہا یا پھر سلوٹ کرتا رہا۔ پٹری پر لیٹ جانے یا گورے جانی ہی کو چپکے سے سٹلا دینے کی خواہش کے باوجود اس نے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔ گورے جانی بدستور یا تو اس کی گود میں جبار ہا یا پھر پھسل کر اس کی کمر اور گولہوں پر ٹکتر رہا۔ بھاگتی ہوئی ٹرین کے ڈرائیور کو سلوٹ کرنے پر کبھی اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا تو میاں جانی کے دوسرے ساتھی تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے لیکن میاں جانی کو کبھی یہ آزادی نصیب نہ ہوئی کہ وہ بھی تالیاں بجا بجا کر ناچ سکے۔ ڈیڑھ سال کے گورے جانی کے بوجھ کو وہ ہمیشہ ہاتھ اور گولہوں کے سہارے سنبھالے رہتا، اور حسرت سے

اچکی پر چھائیاں
تالیاں بجا بجا کر ناچتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو تھکا کر تیا، اور دندنا تھی ہوئی ٹرین اس
کے سامنے سے گزر جاتی۔

اس کی زندگی میں اگر کچھ رس تھا تو صرف اس تصور سے کہ گورے جانی جب
چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا تو وہ خوب کھیلے گا۔ دن دن بھرتیلیوں کے پیچھے بھاگتا پھر گا
اپنی غلیل سے اتنی چڑیاں مارے گا کہ چڑیاں اس کے خوف سے اس طرف کا رخ کرنا
چھوڑ دیں گی۔ لیکن یہ سب کچھ کب ہو سکے گا۔ وہ دن کب آئے گا جس کے انتظار میں وہ
اپنی بے رس زندگی سے نا جا چڑے ہوئے ہے۔ اس کا اس کو کچھ بھی علم نہ تھا۔

ابھی تک وہ اپنی ڈبڈائی ہوئی آنکھوں اور دیکھتے ہوئے بدن کے ساتھ جو تک
کی طرح چمٹے ہوئے گورے جانی کی پرورش کر رہا تھا صرف اس لیے کہ اگر اس کے آنسوؤں
سے گورے جانی کی پیشانی تر نہیں ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کی آنکھوں میں مریچ لگا
دیتی ہے۔ صرف اس لیے کہ گورے جانی اس کے دیکھتے ہوئے ہاتھ اور کوہلے کے سہارے
لگنا نہیں رہتا ہے تو اس کا باپ امرود کے درخت سے پتلی سی لچکتی ہوئی ٹہنی توڑ کر اس
سے چھڑی کا کام لیتا ہے۔ اور وہ اس ٹہنی کے سامنے جس پر چمکتی ہوئی چڑیوں کو غلیل کا
نشانہ بنانے کے لیے وہ بے تاب رہا ہے، مکرٹی کی طرح ناچنے لگتا ہے اور کوہلوں پر
اول آجانے کے بعد بھی گورے جانی کا بوجھ اس پر لا دیا جاتا ہے۔

ایک دن اس نے اپنی ماں سے بہت سنجیدگی سے کہا: "ماں۔ اگر میں گورے جانی
کو ریل کی ٹری پر سلا دوں تو۔؟" ماں نے ڈانٹ بتائی۔ پولیس میں پکڑے جانے
کا خوف دلایا۔

اس نے کہا: "ماں، اور جو میں خود چڑیوں پر سو رہوں تو پولیس تمہیں، آبا کو

اور گورے جانی کو کپڑے لے گی؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”نوٹریوں پر سورہ۔ ریل کے نیچے کچلا جائے گا تو تیری بوٹی بوٹی چلیں اور کوڑے کھائیں گے۔ ہمیں پولیس کیوں کپڑے لگی۔ ہم تنہا ہی تھے ریل کے نیچے چھینک دیں گے۔“

میاں جانی نے کچھ سوچ کر کہا۔ تو پھر تم مجھے دوڑتی ہوئی ریل کے نیچے چھینکنا۔ ماں۔۔۔ پھر وہ مسکرایا۔ لیکن تم ایسا کرو گی تو گورے جانی کو کون سنبھالے گا۔ اور وہ قہقہہ مار مار کر تالیاں بجانے لگا۔

اس کی ماں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو پیار کیا اور چپکے سے گورے جانی کو اپنی گود سے اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے گورے جانی کو اپنی کمر کے سہارے سنبھال لیا، اور اسے پیار کر کے گدگدانے لگا۔

جس گھر میں وہ رہتا تھا اس کی ماں وہاں باورچن کی خدمت انجام دیتی تھی سو رچ کی پہلی کرن سے پہلے ہی اس کے ماں باپ کی مصروفیت شروع ہو جاتی تو ماں کے سینے سے چمٹا ہوا گورے جانی چھینچلا نا شروع کر دیتا، اور اس کی ماں میاں جانی کو جھنجھوڑتی۔ نیند سے جھیل آنکھوں کو ملتا ہوا میاں جانی اٹھ کھڑا ہوتا اور بادل ناخواستہ گورے جانی کا بوجھ اٹھا لیتا۔ اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی نیند جیسے گورے جانی کے خوف سے کہیں بھاگ جاتی، اور چپکے سے چمکتے ہوئے آنسو اس کی جگہ لے لیتے اور میاں جانی کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی ماں اور باپ کے ساتھ زندگی کی دوڑ و صوب میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

گھٹنوں کے اوپر سے پٹے ہوئے پاجامے کی دھجیاں لٹک کر زمین کو چومتی رہتیں اور میاں جانی گورے جانی کو کو لہوں پر لٹکائے اس قدر احتیاط سے قدم اٹھانے لگتا جیسے اس کی ماں آٹھویں مہینے میں گورے جانی کو پیٹ میں چھپائے ہوئے اٹھایا کرتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جن دنوں ماں نے بوجھ اٹھا رکھا تھا ان دنوں گورے جانی بھی جیسے اس سے سمجھوتہ کیے ہوئے بالکل خاموش کسی تاریک گوشے میں پڑا رہتا تھا، اور آج جب کہ میاں جانی نے اس کا بوجھ اٹھالیا تھا تو وہ باوجود اس روشن اور صبح دنیا میں سانس لینے کے روتا چیختا، چلاتا اور محل محل کر ضد کیا کرتا۔ اس سے میاں جانی کی مصیبتیں بہت بڑھ جاتیں۔ وہ طرح طرح سے گورے جانی کو سنبھالتا، مناتا، مہلاتا۔

آری چوں چوں آ۔۔۔ اور چوں چوں کبھی پھدک پھدک کر امرود کے درخت کی ٹہنی پر آجاتی، کبھی وہ خود چوں چوں کی آوازیں نکالنے لگتا۔
آری متو آ۔۔۔ متو اطراف میں کہیں بھی نہ ہوتی۔ اور میاں جانی میاؤں میاؤں کرتا متو بن جاتا۔

کوئی نگہری سجاؤ بتا کر سامنے ناچنے لگتی تو میاں جانی گورے جانی کو اس طرف متوجہ کرتا۔ لیکن اس سے پہلے کہ گورے جانی توجہ کرے نگہری کہیں چلی جاتی۔
ایسے مواقع پر میاں جانی کو اکثر اپنی غلیل کا خیال نہ آتا، اور اگر کبھی آجاتا تو گورے جانی کے بچھ کے نیچے اس کے سارے جذبے اس کی ساری دلچسپیاں، اس کی مختصر سی زندگی کا سارا حسن، ساری خوبصورتی دب کر سسکنے لگتی، اور وہ گورے جانی کو اپنے کو اپنے کے سہارے لٹکائے ہوئے سسکیاں لینے لگتا۔

میں نے کئی بار اس کو گورے جانی کو زمین پر لٹا کر اپنی غلیل اٹھا لینے کے لیے اکسایا۔
میں نے اس کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ گورے جانی کو تختہ پوری دیر کے لیے چھوڑ دیا
کرے اور کوئی پروا کیے بغیر میرے بچوں سے کھیلے۔ لیکن اس کو میرے خلوں پر پوری
طرح اعتماد نہ تھا۔ اس نے کبھی میرے مشوروں پر عمل نہیں کیا۔

گورے جانی جب تک خاموشی سے بیٹھا کھیلتا رہتا، وہ سبھی اس کے سامنے
کچھ دیر کھیل لیتا اور اس وقت سبھی کسی نہ کسی طرح اس کو بھلاتا رہتا۔ اور اس کی دلجمعی
کے سامان فراہم کرتا کہ مباد اس کی بے رخی پر گورے جانی برہم نہ ہو جائے اور اس کی
یہ بہت محنت سہی آزادی سلب نہ ہو جائے لیکن بہت جلد یہی ہوتا۔ گورے جانی بہت
نرم سروں میں رونا شروع کر دیتا، اور وہ ایک بے جان کنجی کے پتلے کی طرح آگے
بڑھ کر گورے جانی کو اٹھا لیتا۔

میاں جانی کو میں اپنے سچوں کی طرح کھیلتا ہوا دیکھنے کے لیے ترس جاتا۔ وہ
کبھی ان کے ساتھ کھیلنے لگتا، تو بھی اس کے چہرے پر کسی نامعلوم خوف کی پرچھائیاں
سی نظر آتیں۔ — میرے بچے فرید کی ٹرائسکل کے پیچھے وہ بھاگتا رہتا تو اس کے
پاجامے کی دھجیوں سے الجھتے ہوئے پیروں کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اس طرح
بھاگتے بھاگتے ایک دم ساکت ہو جائے گا۔ اس کے قدم آہ و احد میں زمین میں
دھنس کر رہ جائیں گے۔ کوئی بجلی اس پر دیکھتے ہی دیکھتے گرے گی۔ گورے جانی
رونا شروع کر دے گا اور میاں جانی ہاجم حرکت نہیں کرے گا۔ اس کا اٹھا ہوا
قدم ٹھہر جائے گا۔ اس کا دم ٹرکتا ہوا دل ٹھہر جائے گا۔

میاں جانی کے ۳۸ سالہ لیکن بوڑھے کوڑھی باپ کو میں اس زمانے سے

جانشا تھا جب اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر ایک دو کوڑھ کے دھبے تھے۔ ان دنوں وہ اپنے ضلع کا بہت مشہور اور رکھنا پیتا درزی تھا۔ تین چار شینیں، دو تین ملازم۔ سیٹھ صاحب کا ان دنوں صفر اتنا کام متکا ٹیپ لے کر آنے والوں کا ناپ لے لیتے، نوٹ بک میں لکھ لیتے، اور کپڑوں کی کٹنگ کر کے ملازمین کو سینے کے لیے دے دیتے۔ میں بھی اس کے پاس تیلوں، قمیص اور شیر و ایناں سلوا چکا تھا، اور اس کی ہنرمندی و فنکاری کا قائل تھا۔

ضلع کی زندگی چھوٹی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس معمولی درزی کو یاد رکھتا جس کے فن کی سارے ضلع میں دھوم تھی چنانچہ وہ میسر دھن سے حرف غلط کی طرح محو ہو گیا عید سے کچھ دن پہلے محلے کے ایک درزی کو بچوں کے کپڑے سینے کے لیے دیے گئے تو درزی صاحب نے دکان میں تالا ڈال دیا۔ عید سے ایک دن قبل میسر ملازم نے درزی کے گھر کا پتہ اٹھا کر اسے پکڑا اور تنبیہ کی تو وہ اپنے ساتھ ایک اور خیف و ناتوان شخص کو لے کر میسر گھر آیا، اور زندہ مردے کی طائر اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا اس شخص نے جو اس کی دکان پر ملازم ہے بہت سے کپڑے کہیں رہن کر دیئے ہیں جس میں میرے بچوں کے کپڑے بھی شامل ہیں۔

میں نے گردن جھکائے سامنے کھڑے ہوئے ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کو دیکھا جس کے چہرے پر پھیلے ہوئے کوڑھ کے سفید دھبے اس کی ڈاڑھی کے سفید سفید بالوں سے زیادہ نمایاں تھے۔

میں نے اس مجرم کو ڈانٹا۔ آنکھیں چار موٹی۔ سرخ ٹوئیڈ کی شیر وانی پہنے ہوئے کوئی عجیبی پہچانی صورت میسر دماغ کے گوشوں میں جھٹکنے لگی۔ کوئی

مانوس سا چہرہ ذہن میں اسجرا، پھر کہیں جا چھپا۔ کوئی دیکھی بھالی صورت نظروں کے سامنے دھندلائی، اور چہرہ چمک اٹھی۔ پھر کوئی بے تحاشہ میری طرف بھاگتا ہوا آیا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھا، اور پھر ٹہریوں کے ایک ڈھانچے کے روپ میں میرے سامنے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

ہائیں۔ کرامت علی۔؟

اور نئے درزی نے کہا۔ یہ پولیس ایکشن کا ستایا ہوا، کوڑی کوڑی کو محتاج اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ غید گاہ میں سارے مسلمان ننگے ہو کر اللہ میاں کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں، اور کرامت علی عید گاہ کے باہر ہاتھ میں ٹیپ لیے کھڑا ہے کہ فوری ان کی ستر پوشی کا انتظام کرے۔

میں نے رہن کے پیسے دے کر سارے کپڑے چھڑوائے اور کرامت علی نے میرے گھر پر سلانی گھر کے اپنا قرض ادا کر دیا۔

اس کے بعد کرامت علی میرے پاس آتا رہا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ میری بیوی کو بہت تکلیف پہنچ رہی ہے، وہ کسی ماما کو تلاش کرے۔

بہت مشکل سے کرامت علی مجھ سے کہہ سکا۔ ”میری بیوی کو ملازم رکھ لیجئے صاحب“ اس نے آج تک کہیں نوکری نہیں کی۔ میں اس کو کہیں رکھوانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس گھر کی بات اور ہے وہ یہاں رہ سکتی ہے۔

ہاں کرامت علی نے یہ بھی کہا تھا کہ سودا لانے کے لیے اس کی بیوی کو باہر بھیجا جائے کیوں کہ وہ ایک شریف گھرانے کی عورت ہے، اور سڑک پر مارے مارے پھرتا اس کے بس کی بات نہیں۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی، اور وہ اپنے دونوں بچوں اور

بیوی کے ساتھ میسر گھر آگیا۔

اپنی بیوی کے بجائے خود کرامت علی سودا سلف لادیا کرتا۔

لیکن جب پروس میں سفارش کرکے میں نے اس کو بھی نوکر رکھا دیا تو وہ اپنی بیوی کلاتھ

بٹانے سے معزور ہو گیا۔

ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا — ”اجی تم خود ہی سودا لے آیا کرو نا۔

اس میں کیا ہرج ہے۔ پسینہ بہا کر روزی کمانا تو عین شرافت ہے، اس طرح کرامت علی اور اس کی بیوی نے شریفانہ کمائی شروع کی تو میاں جانی نے گورے جانی کا بوجھ اٹھالیا۔

ایک دن میاں جانی باورچی خانے میں بیٹھا ہوا گورے جانی کو سہارا ہاتھ، اس کی ماں کچھ سامان لانے کے لیے بازار گئی ہوئی تھی — گورے جانی نے باورچی خانہ کی دہلیز پر اجابت کر دی، تو میاں جانی سوچنے لگا کہ مالکن دیکھیں گی تو بہت برہم ہوں گی اس سے پہلے بھی ایک بار یہی حادثہ پیش آیا تھا تو مالکن نے اس کی ماں سے اس غلاظت کی شکایت کی تھی اور اس کی ماں نے اپنا غصہ میاں جانی پر اتارا تھا۔ میاں جانی کو وقت کم تھا۔ اس کو بہت جلد کوئی قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ بازار سے اپنی ماں کی واپسی کا انتظار کرنے میں اس کا احتمال تھا کہ یہ بات مالکن کو معلوم ہو جائے۔ کچھ سوچ کر اس نے فوراً ایک کاغذ اٹھایا اور ساری غلاظت کاغذ سے صاف کر کے بہت احتیاط سے ڈرتا ڈرتا صحن میں پہنچا۔ تاکہ مالکن کی نظر بچ کر غلاظت باہر پھینک آئے۔ وہ جب آہنگن میں پہنچا تو میری نظر اس پر پڑی۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ کسی چیز کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور میری موجودگی سے بالکل ناواقف تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ سوئی گھر سے یقیناً کوئی چیز چرا کر باہر لے جا رہا ہے، تاکہ اطمینان سے بیٹھ کر کھا سکے۔ ٹاٹو، کیری یا

اٹلی پر چھائیاں
اٹلی یا اسی قسم کی کوئی چیز اس کے ہاتھ میں ہو نا یقینی تھا۔ میں نے ذرا تیز آواز سے کہا۔

”ٹھہرو۔ چوروں کی طرح کیا چیز چھپا کر لے جا رہے ہو؟“
میری آواز بجلی بن کر میاں جانی پر گری۔ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، لیکن میکر اصرار پر بھی اس نے اپنا وہ ہاتھ میری طرف نہیں بڑھایا جس میں اس نے کاغذ چھپا رکھا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا تو میاں جانی نے ڈرتے ڈرتے اپنا وہ ہاتھ میری طرف بڑھا دیا جس میں چھپی ہوئی کیرٹی ٹانگہ یا اٹلی کے دیکھنے کے لیے میں باؤلا ہوا جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ غلاطت میں اٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ فوری چھوڑ دیا۔ مجھے اس وقت اس پر بڑا پیار آ گیا لیکن میں نے اپنے غصے کو قائم رکھتے ہوئے پوچھا کہ:

”گورے جانی کہاں ہے؟“

میاں جانی نے رسوئی گھر کی طرف اشارہ کیا۔
ساری باتیں میکر ذہن میں جمع ہو گئیں۔ میں نے اس سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”سبھاگ جاؤ اور فوراً ہاتھ صاف کر لو۔ بی بی سو رہی ہیں۔ لیکن آئندہ سے اگر تم نے رسوئی گھر کو گندہ کیا تو پھر میں بی بی سے کہہ دوں گا۔“

میاں جانی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اتنی بلتی نظریں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں نے اس پر احسان کیا ہے، اور وہ میرا احسان عمر بھر نہیں بھولے گا۔

زمین پر رگڑ رگڑ کر اس نے اپنے ہاتھ کو خوب خوب دھویا۔ اس کے چہرے کو

اُجلی پرچھائیاں
 دیکھ کر میرے لیے یہ معلوم کر لینا بہت آسان تھا کہ کرامت کی وجہ سے وہ بڑے ذہنی کرب
 میں مبتلا ہے۔ تین تین چار چار بار ہاتھ دھونے کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ میاں جانی اپنے
 اس ہاتھ کو اپنے بدن سے اس طرح دور رکھے ہوئے تھا جیسے غلاطت ابھی تک اس
 کے ہاتھ کو لگی ہوئی ہے۔ اس دن میاں جانی نے اپنے اس نجس ہاتھ سے کوئی کام
 نہیں لیا۔

میاں جانی سگریٹ کی خالی ڈبیاں جمع کرتا رہتا۔ لیکن کبھی اطمینان اور فرصت
 سے بیٹھ کر ان ڈبیوں سے کھیلے ہوئے میں نے میاں جانی کو نہیں دیکھا کبھی کبھار جب
 گورے جانی سو جاتا تو وہ ان ڈبیوں سے کھیل لیتا لیکن سگریٹ کی ڈبیوں سے بنی ہوئی
 اس کی ریل گاڑی دو چار سیٹیاں بجا کر دو چار اسٹیشن ہی چل پاتی کہ گورے جانی جاگ
 جاتا۔ میاں جانی اپنی ریل گاڑی کے سارے ڈبوں کو الگ کر دیتا اور ریل کے یہ ڈبے
 سگریٹ کی خالی ڈبیوں کی صورت میں ایک ٹوٹی ہوئی ٹوکری میں محفوظ ہو جاتے اور رہتا
 ہوا گورے جانی اس پر سوار ہو جاتا لیکن کئی منٹ تک میاں جانی کے دل و دماغ پر
 ریل گاڑی قابض رہتی۔ وہ کچھ سوچ کر گورے جانی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیتا
 اور ریل کی سیٹی کی آواز نکالتا، جھک جھک کرتا، پاؤں گھسیٹتا ہوا گورے جانی کو اٹھائے
 باہر نکل جاتا۔ اس کے باوجود سگریٹ کی خالی ڈبیاں وہ بڑے انہماک سے جمع کرتا رہتا۔
 مجھے میاں جانی پر ترس آتا۔ جو چیزیں اس کو حاصل نہ تھیں ان کا تو خیر ذکر ہی کیا
 لیکن جو چیزیں اس کو حاصل تھیں ان پر بھی اس کو اختیار نہ تھا۔ اس کی غلیل کھوٹی سے
 تنگی رہتی۔ اس کی سگریٹ کی خالی ڈبیاں ٹوکری میں پرسی رہتیں، اور وہ صرف ان کی
 حفاظت کر کے خوش ہوا لیتا۔ صرف اس امید میں رہتا کہ گورے جانی سے جب اسے

نجات ملے گی تو وہ ان سے نہایت اطمینان سے کھیلے گا اور جی بھر کر کھیلے گا۔

یہاں میاں جانی مجھے بالکل اپنی تصویر نظر آتا اور میں سوچنے لگتا کہ میاں جانی میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں جس دفتر میں ہوں وہاں کام کی اس قدر کثرت ہے کہ مجھے دفتر کے اوقات سے ہٹ کر گھر پر بھی فائیس لانا ہوتا ہے۔ میں جب کبھی نئی کتابیں خریدتا ہوں انھیں الماری میں جمادیتا ہوں یا اپنی مینر پرقرینے سے رکھ دیتا ہوں اور ایک لفظ بھی پڑھنے نہیں پاتا۔ لیکن کتابوں کو صفحہ دیکھتے رہنے سے بھی مجھے تسکین ہوتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ دفتر سے کبھی فرصت ملے گی تو بڑے اطمینان سے ساری کتابیں پڑھ لوں گا اور اسی امید میں جیتا ہوں۔ اس طرح میرے معاشرے نے مجھ پر بھی ایک گورے جانی کو لاد رکھا ہے لیکن اس کے باوجود میاں جانی کا دکھ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے زخم میرے زخموں سے زیادہ گہرے ہیں۔ اس لیے کہ میں زندہ ہوں گا تو کبھی نہ کبھی ان کتابوں کو پڑھوں گا لیکن میاں جانی زندہ رہے گا بھی تو گورے جانی سے نجات حاصل کرنے تک اس کی عمر زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے گی جہاں اس کے لیے خالی سگریٹ کی ڈبیوں اور غلیل میں کوئی دلکشی نہ رہے گی اور وہ اپنے ان پسندیدہ کھلونوں سے لطف اٹھائے بغیر زندگی کی موجودہ منزل سے محروم ہی گزر جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کھلونوں سے گورے جانی ہی کیلے۔

میاں جانی کا کوڑھی باپ قریب قریب روزی نہ کرتا۔ ایک آنے کی خشکاش کی کلیاں خرید کر پانی میں بھینکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور رات کو اس پانی کو چھان کر عطار لیتا۔ بڑی رات کو جب وہ اپنے کام دھندے سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا تو اتنے ہی بستر پر پڑ رہے کی بجائے سچ انگن میں کھڑے ہو کر اونگھنے لگتا۔ اس وقت اس کو

دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا جیسے جوار کا کوئی سوکھا ڈنٹھل فصل کٹ جانے کے بعد کھیت میں اکیلے مانچ گیا ہو، اور اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہا ہو، لیکن طوفان میں اس ایک ڈنٹھل کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ بڑی رات کو اس کے گھر واپس لوٹنے تک میاں جانی اور گورے جانی سوچکے ہوتے۔ وہ اپنے حصے کا رات کا کھانا لے کر پہنچتا تو وہ اور اس کی بیوی میاں جانی کو جھنجھوڑتے کہ کچھ کھلا پلا کر سلا بیٹیں لیکن میاں جانی آنکھیں بند کیے ہوئے ہی چیخنے لگتا کہ ”مجھے نیند آرہی ہے۔ میں گورے جانی کو نہیں اٹھاؤں گا۔ میں گورے جانی کو نہیں اٹھاؤں گا۔“

میسرے بچے کی امتحان میں کامیابی پر میں نے اس کو کچھ کھلونے لادے تو اس نے اپنا پرانا لٹو میاں جانی کو دے دیا۔ میاں جانی کے لیے یہ بہت بڑی نعمت تھی۔ اس کی باجیس کھل گئیں لیکن فوراً ہی میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے جگنو بجھنے لگے اور وہ گورے جانی کو اپنے ہاتھ اور کوہے کے سہارے لٹکائے ہوئے لٹو کو بڑی حسرت سے گھورنے لگا۔ اس دن میاں جانی کو اس کا موقع ہی نہ ملا کہ وہ دل بھر کر اپنے لٹو سے کھیل سکتا۔ میسرے بچے کے لٹو سے اپنے لٹو کا مقابلہ کر سکتا۔

دوسرے دن صبح کو جب اس کی ماں بازار گئی ہوئی تھی تو میاں جانی، گورے جانی کو لے کر کہیں غائب ہو گیا۔ دوپہر تک سبھوں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلا گیا ہے لیکن جب وہ دوپہر کو سبھی نہ آیا تو اس کی ماں اس کے باپ سے پوچھ آئی۔ جب اس نے لاعلمی ظاہر کی تو مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میاں جانی محلے ہی میں کہیں گورے جانی کے رونے اور چلنے سے سب سے زیادہ ہو کر اپنا لٹو گھما رہا ہو گا اور گورے جانی اس کے پاس ہی کہیں بیٹھا چنچ چنچ کر احتجاج کر رہا ہو گا۔ مجھے میاں جانی کی اس باغیانہ حرکت سے

جلی پر چھائیاں
 ایک حد تک سکون ہوا، اور میں نے طے کر لیا کہ شام کو وہ گھر لوٹے گا تو میں پوری طرح
 اس کی حمایت کروں گا اور اس کو پٹائی سے بچا لوں گا۔

میاں جانی نے چون کر زندگی میں پہلی بار اس قسم کی بغاوت کی تھی، اس لیے اس
 کی ماں کچھ متفکر سی رہی اور اس کا باپ بھی اس کو اس پاس میں دیکھ آیا۔

شام ہوئی تو میاں جانی اپنے کو لہے پر گورے جانی کو لٹکائے دے پاؤں اپنے گھر
 میں چلا آیا۔ میں نے اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی، اور آئندہ ایسی حرکت سے باز رہنے کی تاکید
 کی، اور اس کی ماں نے بھی میری نظر سچا کر اس کی گوشمالی کی۔ اس پر ان ساری باتوں کا
 کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ کچھ دیر نہ چھلائے وہ کھڑا رہا، اور گورے جانی کو ماں کی گود میں
 دو دو پتیا ہوا دیکھ کر اپنے کھانے کا مطالبہ کرنے لگا۔ بھوکا ہونے کے باوجود میں نے
 دیکھا وہ بہت مطمئن تھا۔

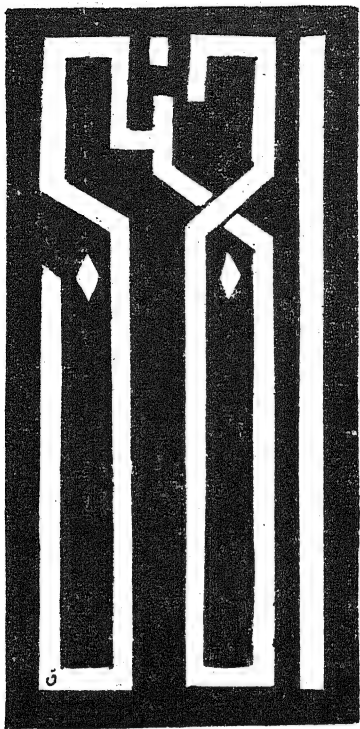
دوسرے دن میاں جانی اپنا لٹوا اور غلیل لے کر پھر غائب ہو گیا اور ابکی بار گورے
 جانی کو سبھی اس نے اپنے ساتھ نہیں لیا۔ دن بھر گورے جانی چچ کر آسمان سر پر اٹھاتا
 رہا۔ اس کی ماں منٹ دو منٹ اس کو بچکا کر پھر اپنے کام دھندے میں مصروف ہو جاتی
 — ماں کو سامنے چلتا پھرتا دیکھ کر گورے جانی کی نظریں اس کا احاطہ کیے رہتیں۔ لیکن
 جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو گورے جانی زور زور سے رونے لگتا۔ گود میں
 آنے کی غرض سے اس کے ہاتھ اٹھتے تو بے سہارا ہی رہ جاتے۔ آج میاں جانی کا داس
 گورے جانی کے آنسوؤں کو خشک کرنے کے لیے نہ رہا تو کسی داس نے بھی اس کے
 آنسو جذب نہ کیے۔ وہ جس قدر رو سکتا تھا روتا رہا۔ میاں جانی کو تلاش کرتی ہوئی اس
 کی منتظر نظریں جب تنہا گئیں تو نیند نے اس کو سہارا دیا۔ لیکن وہ تھوڑی دیر بعد

اُجلی پر چھائیاں
پہنناڑہ دم ہو کر اٹھ بیٹھا، اور نہایت اطمینان سے پھینچھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ
اس نے ریاض شروع کر دیا۔ اس کی ماں میاں جانی کو بددعائیں دیتی رہی۔

اس بار میاں جانی دن ڈھلنے کے بعد درانا خیر سے گھر لوٹا۔ مجھے اطلاع ملی تو میں
سمجھ گیا کہ آج اس کی بہت پٹائی ہوگی کیوں کہ میں کسی کام سے باہر جا رہا تھا اور میری
عدم موجودگی میں اس کے ماں باپ بہت فرائض دے سکتے تھے۔ چنانچہ یہی
ہوا۔ جب میں گھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ میاں جانی کی جلتی ہوئی لکڑی سے تواضع کی گئی ہے اور
اس کو رات کا کھانا بھی نہیں دیا گیا۔

صبح ہوئی تو اسے ناشتہ بھی نہیں دیا گیا۔ مجھے سچی اس کا خیال نہ آیا۔ دن ڈھلے
مجھے معلوم ہوا کہ میاں جانی کی ماں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی شکایت مجھ سے
کیے بغیر اپنا لٹو اور غلیل چپ چاپ جلا دے تو وہ اس کو کھانا دے گی، ورنہ نہیں۔ اور
میاں جانی نے مجبور ہو کر اس کی بات مان لی۔

میں لپک کر باورچی خانے میں پہنچا تو دیکھتے ہوئے چولے میں میاں جانی کا لٹو اور
غلیل جل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اڑ رہے تھے اور وہ دیکھتے ہوئے شعلوں
کو چپ چاپ تکتا ہوا تیز تیز نالے اٹھا رہا تھا



6

۲۳۴

کیسا عجیب تنہا نیا ماسٹر۔ آبا کے سامنے آتا تو بالکل اس طرح ایٹھتا جیسے خشک کباب کو آگ پر رکھ دیا گیا ہو۔ شام ہوتی تو لان پر کرسیاں بچھ جاتیں۔ بچوں بیچ آبا کی ڈک چیر ہوتی۔ ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ برف میں لگی ہوئی ٹھنڈائی بھجی جاتی عین اسی وقت سبز و شاداب ترلشے ہوئے پودوں کی بارٹ کے پاس نیا ماسٹر کچھ اس عالم میں کھڑا ملتا جیسے اس کا دوسرا قدم اس کو سیدھے دار تک لے جائے گا۔

آبا کی نظر پڑتی اور وہ اپنی بارعب آوازیں اس کو بلا لیتے — ”آئیے ماسٹر صاحب آئیے“

ماسٹر صاحب اس طرح آبا کی طرف بڑھتے جیسے ان پر ”ہینا ٹیزم“ کا عمل کیا گیا ہو۔ بالکل بے جان سے جیسے دل و دماغ سے عاری ہوں، اور پھر۔ آبا کے قریب پہنچے پہنچے تک جیسے مڑ مڑ کر ٹوٹتے رہتے، شیروانی کے دامن کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر اپنی رانوں میں دبائے ہوئے، ایک ہاتھ سے پٹھے ہوئے کالر کے ہک لگانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دائیں کندھے کو نیچے جھکا کر بائیں کندھے کو اوپر اٹھائے ہوئے

اجنبی اُجلی پر چھائیاں
زبان کو کبھی دانتوں میں دبائے، کبھی جبروں میں اس طرح ٹھونکتے ہوئے جیسے کسی
نے گھوری دبا رکھی ہو اور باہر سے کمال پھولے پھولے نظر آئیں۔

”بیٹھے بیٹھے پان تنہو کر شربت تو پی لیجیے۔ بانس کے بدوں کا بنا ہوا کوئی پیتلا
قسم کا آدمی۔ بے یار و مددگار مسکور و خائف اس طرح کرسی پر بیٹھ جاتا جیسے کسی نے
سر پر ہاتھ رکھ کر اتنی قوت سے دبایا ہو کہ پاؤں جواب دے گئے۔ گلاس پر انگلیوں کی گرفت
کچھ اس طرح رہتی جیسے گلاس توڑ کر انگلیاں لال لال شربت خود پی جانا چاہتی ہوں شربت
کچھ اس طرح پیتا جیسے جنم جنم کا پیسا پانی پی رہا ہو۔ اور اس سے پہلے کہ آبا پان...
لینے کے لیے کہیں۔ ان سے نظریں ملائے بغیر دھرا ہو کر کورنش بجا لاتا۔ پتلی پتلی اکڑی ہوئی
انگلیاں جوار کے سوکے ڈنڈے کی طرح جیسے ہوا میں جھولتیں۔

منی نے پہلی بار اس کو آبا کے سامنے کھڑا ہوا دیکھا تو دل ہی دل میں اس نے طے کر لیا کہ
چاہے کچھ ہو جائے اس نے ماسٹر کے پاس بہر حال نہیں پڑھے گی۔ روہانسی ہو کر امی
سے کہنے لگی۔ ”امی اسکو فٹس آتے ہیں۔ اپنی نورینی کا کلو ہے نا امی بس بالکل اس کی طرح
نیا ماسٹر کھڑا کھڑا اینٹھنا ہے۔“

”لو جی، یہ کہاں سے پڑا جھڑا اٹھا لائے تمہارے آبا“ امی کچھ اس طرح کہتیں
جیسے نیا ماسٹر کسی پرانے سامان کی دکان سے دستیاب ہو گیا ہو۔ سبھی منی کی ہاں میں
ہاں ملاتے۔ لیکن جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو جیسے وہ آدمی کوئی اور متعجبانے ماسٹر
کے ساتھ ساتھ اس کو کمرے تک پہنچانے آیا تھا۔ بالکل اطمینان سے ہم بچوں میں بیٹھا
ہوا ہنس بول رہا ہے، نہایت تمکنت سے کتابیں الٹ پھیر کر دیکھ رہا ہے۔ بیٹھی بیٹھی
باتیں کر رہا ہے۔ ”دیکھو بھئی، ہم تمہارے ماسٹر نہیں ہیں، ہم تو دوست ہیں تمہارے۔“

”لوجی، مشو میاں سوچنے لگے۔“ یہ تو دوست بنے آئے ہیں۔ بنا ہی لیں گے دوست، تب پتہ چلے گا۔“ اور انھوں نے اپنے ذہن میں دوست بنانے کے پروگرام پہلے بنانے شروع کیے۔

”نوج، کس کھنڈرے لڑکے کو پکڑ لائے ہو۔ بچوں سے کہہ رہا تھا کہ ہم تمہارے ماسٹر نہیں دوست ہیں۔“ امی نے آبا سے شکایت کی۔

”صدر مدرس صاحب نے بہت تعریف کی۔ کہتے تھے کہ اس کے تفویض جتنی جتنی کی گئی ہیں سب کے نتائج اچھے رہتے ہیں۔ بڑا معننی اور ذہین نوجوان ہے۔“

”بھئی خوب نوجوان پسند کیا آپ نے، بوڑھوں کو منہ چڑھاتا ہے مواء ذہانت بھی ایسی کہ دیکھتے ہی آدمی ذہن کا اندازہ لگا لے اور مارے خوف کے چنچ اٹھے۔ پتہ ہے آپ کو منی مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ دھائیں دھائیں رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ کلو کی طرح نے ماسٹر کو فٹس آتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے بچوں کے بیچ میں لمبا ہو کر لگے گا ضیں ضیں کرنے۔ آبا بے اختیار منہس پڑے منی کو پکڑ کر گود میں اٹھالیا، جوامی کے پیچھے کھڑی مکر مکر آبا کی صورت دیکھے جا رہی تھی۔ وہ منی سامنے چہ منتر رہے اور ہنستے رہے۔“ منی نے ان کو مجھ سے ملنے آتے وقت دیکھا ہو گا۔“

”ہاں مشو کہہ رہا تھا کھڑی چپ چاپ تکتی رہی اس کو پھر بغیر کچھ کہے سنے ایک دم وہاں سے بھاگی تو مجھ سے چمٹ کر دم لیا۔“

آبا پھر ہنسے۔ ”بھئی اس کو چلتے ہوئے دیکھ لیا ہے نابینا نے۔“
امی بھی ذرا سا مسکرا دیں۔ ”آپ نے کہہ کیوں نہ دیا کہ نیا ماسٹر آنے لگے تو بچوں کی آنکھوں پر کس کر پٹیاں باندھ دی جائیں۔ بھئی خوب پسند ہے آپ کی،“ اور امی کو تو نیا ماسٹر

لیکن پہلے ہی دن نئے ماسٹر نے ہم سب کو رجھا لیا۔ منی البتہ اس روز نہ آنا تھی نہ آئی جب وہ جانے لگا تو ٹوپی سر پر اوڑھتے ہوئے اس نے کہا۔ بابا ڈاڈیکو تو لینا۔ آبا باہر ہیں یا اندر چلے گئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اتنا جلد اندر نہیں جلتے اور پھر بات کرنے میں ان کی آوازیں بھی تو مٹا سناؤ دے رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے پیٹ سے اپنی آگہی کا ثبوت دیا۔

ہاں بھئی۔ آواز تو آرہی ہے۔ لیکن اچھے بچے اپنے ماسٹر کی بات فوری مان لیتے ہیں۔ یہ پہلے دن بہت ہی نرم قسم کی تنبیہ تھی۔ میں نے محسوس کیا اور فوری کسر کے دروازے تک بڑھ کر آبا کو دیکھ آیا۔

”میں ماسٹر صاحب“

”دیکھ میں یاد دوسرے بھی کچھ لوگ۔“

اور میں نے بات کاٹ دی، ”جی ہاں اور لوگ بھی ہیں۔“

”اچھا بابا، آبا دیکھ کس طرف سر ہے؟ ان کا چہرہ اس طرف ہے یا پیٹھ؟“

میں نے آبا کو زندگی میں لاکھ بار دیکھا تھا۔ ان کو چھو استھا، ان کو پیار دیئے تھے

پیار کیا تھا، جب ذرا اور چھوٹا تھا تب باہیں گلے میں ڈال کر اپنے پیرزین سے اٹھالے

تھے اور جھولتا رہا تھا۔ لیکن اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی پیٹھ اس طرف ہے

تو چہرہ اس طرف ہونا چاہیے۔ لوگ بات کر رہے ہوں تو ان کو اونگھنا چاہیے ماسٹر جا رہا ہو تو

ان کو باہر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ماسٹر صاحب کے جانے سے ان

کے ادھر ادھر دیکھنے کا کیا تعلق ہے۔ میں بھی سب کچھ سوچتا رہ گیا تو اس نے پھر مجھ سے کہا۔

”بابا ذرا دیکھ تو لینا کہ آبا کس طرف....“

میں نے دیکھ کر کہا کہ ان کا چہرہ اُس طرف کو ہے اور وہ متم صاحب پولیس سے باتیں کر رہے ہیں۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ جیسے سین کر کھل اٹھا۔

ٹوپی اڑھٹی، سہمے ہوئے سے، ڈرے ہوئے سے، میسرہیوں تک پہنچے پلٹ پلٹ کر دو تین بار آبا کی طرف دیکھا۔ اچھی خاصی ٹوپی کو چپ سے درست کیا۔ شیروانی کے دامن کو پتلی پتلی انگلیوں کی گرفت میں لے کر اپنی رانوں میں اڑس لیا۔ زبان دانتوں میں دبالی پھر فوری جیسے گلوری کال میں دیا کر کال بھلا لے رہے مڑ مڑ کر کن کھاتی ہوئی تنگ کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بارہ کی طرف لپکے جیسے اب گریں گے اب گریں گے اور اب لے سامنے ہی دیکھتے کے دیکھتے اٹھریاں رگڑ کر مر جائیں گے۔ کیسا عجیب سا معلوم ہوا تھا۔ جیسے ہم کو پٹر جانے کے بعد ہمارا ماسٹر... دروازے تک گیا۔ اور وہاں سے کسی دوسرے آدمی کو آبا کے آگے ڈھکیل کر خود بڑے اطمینان سے جیسے پیچھے ہٹ آیا۔ بالکل نیا اور اجنبی سا کوئی شخص ہمیں باہر نظر آتا، جو دروازے تک ہمارا ماسٹر ہی تھا۔ لیکن اب جانے کون ہو ہم تو نہیں جانتے تھے اس کو۔

منی پر نہ اخی نے جبر کیا نہ آبانے۔ ہاں ہم سب سے جب اس نے نئے ماسٹر کی تریف سنی تو اس کی ہمت بندھی، آیا کی انگلی تھامے دروازے تک آکر تاک جھانک کرنے لگی پھر آہستہ آہستہ دروازے کی دراز سے نئے ماسٹر کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی۔ دونوں میں اسی طرح مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا، اور ہم سب کے سب منی کو نئے ماسٹر سے قریب کرنے کے لیے گویا اس کی مدد کرتے اور کچھ دیر پڑھنے لکھنے کی بوجھل بوجھل سی فضا منی کی آمد سے مسکراہٹوں اور تفریح کی نظر ہو جاتی، جو ہمارے لیے ایک وقتی نعمت سے

ماسٹر پسند آجھی جائے تو ساری کی ساری کتابیں کیسے پسند آجائیں گی، اور پھر حساب میں تو میں ٹھیک تھا۔ سو منی کی آمد ہم سب کے لیے اہمیت کی حامل ہوتی۔

منی اب اکیلی بھی دروازے تک آنے لگی پھر کمرے میں بھی اس نے قدم رکھا۔ پھر نئے ماسٹر کی گود تک آ پہنچی۔ پھر روزانہ ہمارے ساتھ بولتنا قاعدہ اور رنگ پر امر بغل میں دا بے وہ ماسٹر صاحب کے پاس آنے لگی۔ اب ظاہر ہے کہ منی میں ہمارے لیے کوئی دلکشی باقی نہ رہی۔ لیکن ہم کبھی نئے ماسٹر سے بور بھی نہیں ہوئے۔ اس میں پتہ نہیں کہ کون ایسی خوبی تھی۔ نئی نئی دلچسپیاں ہمارے لیے پیدا کر دیتا۔ اس نے کوئی بات نصیحت کرنے کے انداز سے کی ہی نہیں۔ شرارت کی بھی تو مارنا تو رہا ایک طرف ڈانٹ تک اس نے نہ بتائی۔ کچھ عجیب سی آنکھوں سے سنٹ بھرتا رہتا۔ پھر بہت نرمی سے کہتا۔ ”جاؤ اب پڑھنے سے جی اچاٹ ہو چکا ہے تو تھوڑی دیر کھیل لو، اور ہاں تم دن میں شاید بہت کم کھیلتے ہو اور پڑھنے میں بہت وقت لگا دیتے ہو۔ دن میں جی بھر کر کھیلنا چاہیے تاکہ میری موجودگی میں دل لگا کر پڑھ سکو۔ جاؤ تھوڑی دیر کھیل لو“ لیکن میں جانے سے انکار کرتا۔

مشو میاں نے کتاب کا ورق ورق الگ کر رکھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے مشو میاں کو کچھ نہیں کہا۔ لگے کتاب ہی کی برائی کرنے۔ کہنے لگے اتنی بری جلد ہو تو بھلا ورق ورق الگ نہ ہو گا۔ وہ تو مشو میاں نے اس قدر احتیاط سے رکھا ورنہ ساری کتابیں ٹکڑا کے کٹے ہوئے پتنگ بن کر ہواؤں میں بھرتی رہتی۔ جھٹ سے انھوں نے کتاب کو ہسی سلا کر کورس پر چڑھایا۔ الٹی سیدھی تصویر اس پر بنائی، شوخ و شنگ رنگ بھرے

اور مشویمیاں کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ”دیکھیں ماسٹر صاحب کی بنائی ہوئی تصویروں کی مشویمیاں کتنی قدر کرتے ہیں مشویمیاں نے نئی جماعت میں نرنی کی توجہ کتابوں کی توں رہی۔

دل ہی دل میں ہم سب نئے ماسٹر کو چاہنے لگے اور نئے ماسٹر نے ہماری محبت کا

خوب خوب فائدہ اٹھایا کوئی دن ایسا نہ گذرتا جو ہم سارے کا سارا ہوم ورک خوشی خوشی نہ کر دیتے۔ ”غنجہ“ پھول۔ پیام تعلیم۔ سب ہی رسالے آبا کے پاس عریضہ لکھ کر ماسٹر صاحب

نے جاری کر دئیے۔ کتنے شوق سے ہم یہ رسالے پڑھتے۔ ماسٹر صاحب کبھی کوئی کہانی کبھی کوئی نظم پریشان کر دیتے کہ ہم غور سے پڑھ کر اپنی رائے لکھ رکھیں۔

مشویمیاں اور میں اپنی اپنی رائیں ایک دوسرے سے چھما کر لکھ رکھتے۔ اپنے ہوم ورک میں یہ اضافہ ہمیں بہت بھلا لگتا۔ آبا نے سنگوانے کو تو سارے پرچے سنگوالیہ لیکن

ہمیں انہماک سے پڑھتا ہوا دیکھ کر وہ کچھ زیادہ خوش نہ ہوتے۔ ایک دن کہنے لگے کہ بھئی تم لوگ اپنی کورس کی کتابوں پر زیادہ وقت دیا کرو۔ ہم دبی زبان سے انہیں سمجھاتے

کہ ہم نے سارے کا سارا ہوم ورک کر رکھا ہے۔ رہ گئے یہ رسالے سو وہ لفظ لفظ چاٹ لینے تک ہمیں چین نہ پڑتا۔ لیکن یہ بات آبا سے کس طرح کہی جاسکتی تھی۔

بلی کو دودھ سے بھری ہوئی پیالی تک پہنچانے کے لیے جن بھول بھلیوں سے گزارنا تھا وہ مجھے بھلا اور نہ مشویمیاں سے۔ ”پیام تعلیم“ کے آخری صفحے پر بنے ہوئے اس خاکے کو تکتے تھکے

ہماری آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ انگلی کو کاغذ پر گھما کر کچھ دوسرے ہم بلی کو لے جاتے کہ راستہ آگے کے لیے نہ ملتا، اور ہماری پوسی رانی گویا دودھ کے لیے تڑپ کر رہ جاتی

اب باسٹر صاحب آئیں تب ہی دودھ ملے اور پیٹ بھرے پوسی رانی کا۔ ماسٹر صاحب پوسی رانی کی دودھ کی پیالی تک پہنچنے میں مدد کر رہے تھے کہ سنی کی آئے آکر کہہ

”آبا نے کہا ہے کہ ماسٹر صاحب جانے سے پہلے ضرور ملتے جائیں“

ماسٹر صاحب جیسے دودھ کی پیالی تک پہنچنے کا راستہ خود بھول گئے تھے۔ آبا کہہ کر چلی گئی۔ لیکن ادھ کھلے دروازے کی دراز کو وہ اس طرح گھور رہے تھے جیسے آبا کا چہرہ اب تک تک رہے ہوں۔ ان کا جی دیکھتے دیکھتے اچاٹ ہو گیا۔ کدھر ٹیٹھی باتیں کرتے۔ ہنستے بولتے پوسی رانی کو دودھ کے پیالے ہم پہنچانے کی فکر میں تھے کدھر آبا کا پیام سن کر جیسے سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ مجھے پتہ نہیں کیوں ایسا احساس ہوا جیسے آبا کے ساتھ ماسٹر صاحب بھی کہیں چلے گئے ہیں اور ہیں اس آدمی کے حوالے کر گئے ہیں جو روز شام کو دو وقت آتے اور جاتے آبا کے آگے سے گذرتا ہے۔ جو ہمارا ماسٹر نہیں ہے بلکہ کوئی اجنبی ہے جس کو ہم صرف آتے اور جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

مشو میاں نے کہا ”ماٹ صاحب وہ جو بھول“ میں ایک نظم ہے نا — وہ — وہ جس کا غٹو ان ہے“

لیکن ماسٹر صاحب کن کھائے تنگ کے مانند خلاؤں میں کہیں ڈول رہے تھے۔ مشو میاں کی بات جیسے ان کے اپنے کانوں ہی میں دس ٹپکا کر رہ گئی تھی۔

”ماٹ صاحب — وہ جو —“

لیکن جیسے آبا کے سامنے سے گزرنے والے اجنبی نے پوچھا، ”بابا“ آبا نے کیوں ملنے کو کہا ہو گا؟“

”امی کہہ رہی تھیں کہ کل جن لوگوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہے، ان میں ماٹر صاحب بھی شامل ہیں“ میں نے امی سے سنی ہوئی بات دہرا دی لیکن ماسٹر صاحب نے سچے

اجلی پر چچائیاں
اجنبی
”آج کچھ کہا تھا کیا آبا نے؟“

”ہاں ماٹ صاحب“ مشومیاں جھٹ سے بولنے لگے۔ لیکن میں نے انکشافات کا سہرا اپنے سر لینے کے لیے کہا۔ ”آبا کہہ رہے تھے کہ ہم کو رس کی کت میں چھوڑ کر کہا نیوں اور نظموں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

”کن کھایا ہوا پننگ جیسے غوطہ کھا کر زمین پر سر کے بل بیٹھ گیا۔“

”بابا، کیا آبا نے رسالے پڑھنے سے منع کیا تھا؟“

”نہیں ماٹ صاحب“ میں نے اور مشومیاں نے یک آواز کہا۔

”پھر کیا کہا تھا آخر؟“

ہم نے وہی باتیں دہرائیں۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ماسٹر صاحب کچھ بھی نہ سن سکے تھے۔ اس لیے کہ وہ میرا اس اجنبی کو ہمارے نرغے میں چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے پڑھنا ختم کر کے وہ اٹھنے لگے تو مجھ سے کہا۔ ”بابا، ذرا دیکھنا تو آبا کیلے ہیں یا اور بھی کوئی؟“

میں نے سیڑھیوں پر پہنچ کر دیکھا تو دو ایک آدمی اور بھی تھے۔ جو میں نے

ماسٹر صاحب کو بتا دیا۔ انھوں نے بالکل ایک بے جان لکڑی کے پتلے کی طرح کمرے سے

باہر قدم نکالا، بالکل اس طرح آبا کی جانب بڑھے جیسے دبے پاؤں ان تک پہنچ کر ان

پر حملہ کر دیں گے۔ منہ میں نے غلط کہہ دیا۔ حملہ کرنے کے ارادے کے پیچھے کس تند و خوراعا

رہتی ہے۔ یہاں تو ماسٹر صاحب آبا کے حلقے سے بچنے کی فکر میں تھے۔

بالنس کے بدوں کا بنا ہوا کوئی پتلا قسم کا آدمی بے یار و مددگار مسخ و خا

سٹوڈس گزرا فاصلہ طے کرنے تک مڑ مڑ کر ٹوٹتا رہا۔ شیر دانی کے دامن کو چٹکی میں پکڑ کر

انوں میں دبائے پھٹے ہوئے کالر گاگ لگانے کی ناکام کوشش میں جوار کے سوکھے

اٹلی پر چھائیاں

اجنبی

ٹنٹھ کو ہوا میں پختے وہ آبا کے آگے مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا، پھر ان کے اشارے پر اس طرح کرسی پر بیٹھ گیا جیسے راری کے اشارے پر بندر یا چھوٹی سی تپائی پر ٹک جاتی ہے۔

آبا نے یقیناً انہیں دوسرے دن دعوت میں آنے کے لیے نہیں کہا۔ میں برآمدے میں کھڑا ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔ سب کچھ تو میرے لیے نہ پڑا۔ ہاں اننا ضرور سمجھ سکا کہ آبا رسالوں میں ہماری غیر معمولی دلچسپی کے تعلق سے ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں میں چاہتا تھا کہ ہمارا ماسٹر دل کھول کر آبا سے باتیں کرے، انہیں وہ ساری باتیں سمجھائے جو ہمیں سمجھانا ہے۔ وہ صاف صاف کہہ دے کہ آبا ان معاملات میں دخل نہ دیں جیسے وہ کئی بار ہمارے سامنے کہہ چکا تھا کہ صدر مدرس صاحب کے بچوں کو اس نے صرف اس لیے پڑھانا چھوڑ دیا کہ وہ بے سبب دخل و معقولات کرتے تھے۔ لیکن اس نے آبا سے کچھ نہ کہا۔ یہ کہ نہ کہا کہ ہم لوگ اپنا ہوم ورک برابر کر لیتے ہیں۔ کبھی ادھر رہا نہیں چھوڑتے اور نہ ان رسالوں ہی کے ہو کر نہیں رہ جاتے، اور پھر ان رسالوں کی مدد سے اس نے ہم میں نہ سنسٹر پڑھنے کا شوق پیدا کیا تھا بلکہ اتنی بصیرت پیدا کی تھی جو ہماری عمر کے بچوں میں نہیں سمیٹ کر سکتی۔

مجھے ماسٹر صاحب کی اس خاموشی اور بندولی پر جہاں قصہ آیا وہیں بے پناہ ہمدردی بھی ہوئی۔ ہمدردی اس لیے کہ آبا کے آگے ہمارا ماسٹر موجود ہی نہ تھا۔ وہاں تو وہی اجنبی تھا۔ جو روز شام کو دو وقت لان کے آگے سے سہا سہا سا گذرتا ہے۔ دوسرے دن سارے کے سارے پرچے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ میں اور مشویماں باور کیجیے دو روز بالکل اداس رہے، پڑھنے میں جی ہی نہ لگتا۔ اب یہ رسالے ہیں

ابھی پرچھائیاں

ابھی

ہفتے میں عشر ایک دن ملنے لگے۔ نیا ہفتہ شروع ہوتا تو ہم نئے شمارے کی آمد کے منتظر رہتے، لیکن ابکی بار نیا شمارہ بھی غائب تھا۔

ایک دن ماسٹر صاحب آئے تو معمول سے کچھ زیادہ ہی خوش خوش تھے۔ غنچے کا نیا شمارہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں اور مشومیاں جھپٹے تو انہوں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر رسالے کو ہماری پہنچ سے دور کر دیا۔ کہنے لگے کہ آج تو ہم دونوں ہی سے مٹھائی کھائیں گے۔ لیکن یہ بات انہوں نے کچھ اتنے دھیمے سر میں کہی جیسے خوشی کی نہیں غم کی خبر سن رہے ہوں۔ ان کے چہرے پر بس نامعلوم خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ مجھے ان دنوں تو کم ہی محسوس ہوئیں، لیکن آج خیال کرتا ہوں اس کرب کی شدت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اس خوف نے ہمیں بھی سمجھا دیا کہ چیخ چیخ کر خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ دراصل ایک لمحہ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا مشردہ سنانے والے ہیں۔ اور اسی لیے بہت بے چین تھا۔

میں نے اچھل کر ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی گرفت سے نیا رسالہ چھین لینا چاہا تو انہوں نے مجھے جھک کر سینے سے لگا لیا۔ پھر خود ہی کچھ ورق الٹا کر رسالہ میری طرف بڑھا دیا۔ علانیہ میرا نام جیسے چمک رہا تھا۔ میری کہانی چھپ چکی تھی، میں چاہتا تھا کہ رسالہ اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ ناچتا، اچھلتا سمجھا گا بھاگا آبا کے پاس جاؤں، امی سے چپٹوں، انھیں بتاؤں کہ میرا نام چھپ کر آیا ہے۔

مشومیاں الگ اچھل پڑے ان کی پہیلی بھی چھپ چکی تھی۔

ماسٹر صاحب جانے لگے تو پرچہ انہوں نے ہمیں دے دیا۔ کہنے لگے ”ابا اور امی

سے چھپا کر پڑھنا اور ابھی انھیں بتلانا مت۔

اس قسم کی مجبوری خدانہ دے کسی کو۔ اپنا کارنامہ کسی مذموم فعل کی طرح چھپاتے پھرنادو بھی اس عمر میں جو بجائے خود کارنامہ ہی کا رنامہ ہو۔

دل پر وہ دہکتی ہے کہ آج اس شدت احساس کا اعادہ مشکل ہے۔ رسالہ بند کرتا تو مشو میاں جھپٹ پڑتے۔ مشو میاں جھپٹ پڑتے تو جھٹ سے بند کیے ہوئے رسالے کو کھول کر جہاں میری اپنی انگلی پہلے ہی سے بطور ترک محفوظ رہتی میں اپنا نام پھر ایک بار دیکھ لیتا جو کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے روشنائی سے نہیں روشنیوں سے لکھا گیا ہے۔

کتنی بار دل فرستچ پائی ہے۔ وہ تو جیسے قسم کھائے بیٹھا تھا کہ ماسٹر صاحب خواہ بُرا مانیں یا روٹھ جائیں لیکن اس قسم کی مہمل پابندیوں کو اپنے پر عائد نہیں کریگا۔ دل ہی تو متناوہ بھی نتھامتنا سا۔ آبا بھلا برا کیوں مانیں گے۔ کلاس میں تو سب ہی پاس ہوتے ہیں۔ اس طرح کہانی تو ہر ایک کی نہیں جھپتی نا۔ لیکن میں کچھ بھی تو نہ کر سکا۔ کوئی چپکے سے کانوں میں کہتا۔ آبا اور امی سے چھپا کر پڑھنا۔ ابھی انہیں بتلانا مت۔ آبا اور امی سے۔۔۔۔۔ ابھی انہیں بتلانا مت۔

دل میں پھٹھڑیاں چھوٹ رہی ہوں تو اس کی جوت کم سے کم چپکے پر تو دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ جوت کسی نے نہیں دیکھی۔ میں نے ہمت کی۔ پرچہ اپنے ہاتھ میں تنھائے بے وجہ امی اور آبا کے آگے سے سبوا گزرا ہوں۔ کن انکھیوں سے میرے ہاتھ میں پرچے کو دیکھ کر انھوں نے دانستہ ہی اس ضمن میں کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔ جی کس کس طرح چاہا ہے کہ امی جھوٹ موٹ پوچھ لیں کہ ہاتھ میں کیا ہے اور میں انہیں چمٹ کر بتلاؤں کہ ہاتھ میں پرچہ ہے اور پرچے میں میرا نام ہے۔ لیکن آبا یا امی نے ایسی کوئی بات ہی نہ کی۔ آبا اٹھ کر سونے کے لیے جب اپنے سونے کے کمرے میں جانے لگے تو میں

اُٹلی پر چھائیاں

اجنبی

سچی کچھ اس طرح اپنے بستر تک پہنچا جیسے کسی غنچوار کے سینے پر سر رکھنے کی خواہش کے آگے مجبور ہو گیا ہوں۔ چپکے سے لیٹ گیا تو پتہ نہیں کیوں میرا تکیہ میسر آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ لیکن میں نے دوسرے دن یہ بات ماسٹر صاحب سے نہیں کہی حالانکہ اب دل یہ چاہنے لگا تھا کہ تکیے میں سر دے کر اپنے کارنامے پر سسکنے کا حال ماسٹر صاحب کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہو جائے۔ دل بیک وقت کتنا چالاک اور مور کھ ہے۔ آج سوچتا ہوں تو صرف اس عمر پر پیار نہیں آتا ساری انسانی فطرت پر پیار آتا ہے۔

دوسرے دن جب ماسٹر صاحب نے پرچہ واپس لے جانے کے لیے مانگا تو میرا جی چاہا کہ ان سے لپٹ کر پھر روٹیروں اس طرح گئی رات کا راز بھی ان پر افشا ہو جائے اور پھر ان کی ساری ہمدردیاں الگ۔ سٹیٹ لوں گا۔ لیکن یہ آنسو بھی عجیب سی شے ہیں بعض وقت اس طرح جل دے جاتے ہیں جیسے ہم سے آشنا ہی نہ تھے۔ لیکن ماسٹر صاحب نے خود ہی کچھ محسوس کیا اور کہا کہ ایک دن اور میں پرچہ اپنے پاس رکھوں۔

اسکول میں سالانہ امتحانات قریب میں ہونے والے تھے۔ ہمیں اس امتحان سے کچھ لینا دینا نہ تھا کیوں کہ آباہمیں آئندہ سال اسکول میں شریک کروانے والے تھے۔ بیٹھے بٹھائے ماسٹر صاحب نے میری نوٹ بک سے ایک کاغذ نکالا اور لگے عرضی گھسیٹنے۔ لکھ چکے تو جاتے ہوئے میسر ہاتھ میں تنہا کر کہا کہ آبا کو دے دینا آبا بابر لان ہی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ پانی کا چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ ہوا میں مٹی کی کچھ سوندھی سوندھی سی بو تھی۔ ماسٹر صاحب کے جاتے ہی خوب خوب کھیلنے پر طبیعت مائل تھی۔ مجھے ایک لمحہ بھی ضائع کرنا پسند نہ تھا۔ آبا تک ماسٹر صاحب کی

اجنبی

اُجلی پرچھائیاں

عرضی پہنچا نا۔ ان کے پڑھنے تک ادب سے کھڑے رہنا پھر ان کا جواب ماسٹر صاحب تک پہنچا نا۔ میں نے سوچا، صاف صاف کہہ دوں کہ ماسٹر صاحب آپ خود آبا سے مل لیجیے نا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں۔ سٹیڑھیوں تک آتے آتے ہمارے ماسٹر صاحب غائب ہو چکے تھے اور آبا کے آگے کن کھائے ہوئے نینگ کی طرح کوئی اجنبی ڈول رہا تھا۔ بالکل بے جان سا۔ جیسے دل و دماغ سے عاری ہو۔ مڑ مڑ کر ٹوٹتا ہوا۔ دائیں کندھے کو نیچے جھکا کر بائیں کندھے کو اوپر اٹھائے ہوئے۔ اف کیسی عجیب سی بات تھی۔ وہ یقیناً ہمارا ماسٹر نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں آج بھی نظروں سے اوجھل ہونے تک اس اجنبی کو دیکھتا رہا۔

میں نے ماسٹر صاحب کی عرضی امی کے حوالے کی کہ آبا اندر آئیں تو وہ انہیں دے دیں، اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کھیلنے چلا گیا۔

رات کو آبا اندر آئے تو میں ساری باتیں بھول بھال کر اپنا ہوم ورک کر رہا تھا اور اس بات سے بالکل ناواقف تھا کہ آبا اور امی مسکرا مسکرا کر بڑی محبت سے میری طرف دیکھ دیکھ کر میسرے تعلق سے باتیں کر رہے تھے۔ آبا نے مجھے پکارا تو میں چونکا جب میں قریب گیا تو وہ کہنے لگے ”تمہیں کچھ پتہ ہے کہ تمہارے ماسٹر صاحب نے کیا لکھا؟“ ظاہر ہے کہ میں نفی میں سر ہلا سکتا تھا۔ اس لیے کہ ماسٹر صاحب نے اس ضمن میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ آبا کہنے لگے کہ ”وہ تمہیں چھٹی جماعت کے امتحان میں بٹھانا چاہتے ہیں تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ تو اسکول میں ٹل کلاس میں تمہیں داخل کر سکیں تم دے سکو گے چھٹی جماعت کا امتحان؟“

میرا گھبرا جانا ضروری تھا۔ اس لیے کہ میں نے آج تک نہ کسی اسکول میں تعلیم پائی

اصلی پرچھائیاں
تھی اور نہ کہیں دیکھا ہی تھا کہ امتحان کس طرح دیا جاتا ہے ابانے مکر پر چچا تو میں نے
صرف اس قدر کہہ دیا کہ ماسٹر صاحب کہتے ہیں تو میں دے سکتا ہوں۔ میں نے دیکھا ابائیر
جواب سے کچھ مطمئن ہی تھے۔ لیکن امی کہنے لگیں کہ وہ ان کا ماسٹر خود نا تجربہ کار ہے۔ ذرا
آپ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی تو مشورہ کر دیکھیے نا۔ وہ تو آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔
ابانے صفحہ اتنا کہا کہ میں ماسٹر صاحب کو یہی جواب دے دوں کہ وہ اس ضمن میں
ہیڈ ماسٹر صاحب سے مشورہ کر کے انھیں جواب دیں گے۔

دوسرے دن ماسٹر صاحب آئے تو انھوں نے نشست سنبھالنے سے پہلے ہی مجھ
سے پوچھا کہ ابانے کچھ جواب دیا۔ میں نے جواب کہہ سنایا۔ تو وہ بڑے منموم سے بیٹھے
ہوئے کچھ دیر غلاؤں میں گھورتے رہے۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ بیٹھے نہیں ہیں بلکہ
نظرے کھڑے ہی اس اجنبی سے گلے مل رہے ہیں جو روزِ شام کو ابائے کے سامنے سے گزرتا
ہے۔ اس دن ماسٹر صاحب نے نہ ہمارا ہوم ورک ہی ٹھیک سے دیکھا نہ پڑھانے
میں دلچسپی لی۔

ماسٹر صاحب جانے لگے تو دروازے تک پہنچ کر وہ ٹھٹھک گئے، کہنے لگے ”بابا“ ذرا دیکھنا
ابائے کے پاس کون کون ہیں؟ میں نے دیکھا تو ابائے اور ہیڈ ماسٹر صرف دونوں ہی تھے میں
نے جب ماسٹر صاحب سے کہا تو ان کے قدم جیسے زمین میں گر کر رہ گئے۔ بڑی مشکل سے
انھوں نے ہمارے سلام کا جواب دیا اور ٹیڑھ بول پر پہنچتے پہنچتے جیسے کہیں غائب ہو گئے
زمین نے دیکھا کہ آج وہ اجنبی کچھ زیادہ ہی بوکھلایا ہوا ہے جو ابائے کے سامنے سے گزرتا
ہے لیے حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ چلتا چلتا بالکل اس طرح رک جیسے
لوں میں اس کا غن بچھو گیا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب نے وہیں سے پکارا ”ماسٹر صاحب ذرا“

اُٹلی پر چھائیاں
 اجنبی اور اجنبی محرموں کی طرح سہما سہما ان کی طرف بڑھنے لگا۔ کسی غیبی قوت
 نے اس کو دہرا کیا پھر سر پر اتنا بوجھ پڑا کہ اس کے سر جواب دے گئے۔ اور وہ سیدھا
 تنہا اُٹنی کے گڑے کی طرح کرسی پر ٹک گیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اس سے مخاطب ہوئے۔ ”صاحب کا خیال ہے کہ اگر آپ کو اس
 بات کا پوری طرح یقین ہے کہ بابا کامیاب ہو جائیں گے تو انہیں امتحان میں شریک کر دیجئے۔
 کامیاب نہ ہوں تو آئندہ سال ساتویں جماعت میں داخلے کا امکان اس لیے ختم ہو جائے گا
 کہ صاحب اس کو مناسب نہیں سمجھتے۔

اُور ہاں ”ابا کہنے لگے۔ ”پہلی بار ناکام ہو تو بچہ امتحان سے ہمیشہ کے
 لیے خائف ہو جاتا ہے۔“

”ہاں صاحب یہ بچوں کی نفسیات ہے۔“ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایمان
 لانے کے انداز میں تائید کی۔

میراجی کس قدر چاہا کہ ہمارا ماسٹر اس خود آہنگی اور خود اعتمادی کا مظاہرہ
 ان لوگوں میں کرے جو وہ پڑھاتے وقت کیا کرتا ہے۔ لیکن جیسے یہ ناممکن تھا۔ اس
 لیے کہ وہاں تو ہمارا ماسٹر تنہا ہی نہیں۔ وہ کم آمیز اجنبی تھا جو شاید اپنے وجود سے
 بھی ڈرتا ہے۔

جوتے کی ٹو سے قدموں تلے بچھی ہوئی لان کو کریدتے ہوئے اور جھکی جھکی
 نظروں کو ابا سے ملانے کی کوشش کرتے ہوئے جب وہ مبہوت بیٹھا رہا تو ابا نے
 اس کو پھر سوتے سے جگایا۔

”آخر آپ کا کیا خیال ہے؟“

اجلی پر چھائیاں

اجنبی

اس نے اس لجاجت سے درخواست کی کہ جیسے آپ کے انکار پر ان کے قدم ہی تو پکڑ لے گا۔ جیسے میرا امتحان میں نہ بیٹھنا اس کے لیے باعثِ تفریر ہو۔

میری امتحان میں شرکت طے ہو گئی تو وہ دوسرے دن سے غائب تھا۔ تین دن ہو گئے لیکن اس نے ہمارے گھر کا رخ نہ کیا۔ مجھے ہمارے ماسٹر صاحب کے چھوٹے بھائی سے جو میرا دوست تھا اور کبھی کبھی ملنے آتا تھا معلوم ہوا کہ وہ بالکل اچھے خاصے ہیں اور بلاناغہ اسکول جاتے ہیں۔

آپا نے منشی جی کو سمجھا کر انھیں بلوایا اور نہ آنے کا سبب دریافت کروایا تو ماسٹر جی نے کہلا بھیجا کہ انھیں شدید بخار تھا۔ مجھے یہ جھوٹ اچھا نہیں معلوم ہوا لیکن ماسٹر صاحب تو ہمارے چیتے تھے نا۔ میں نے پردہ پوشی کی جیسے ان کا محسن ہوں۔ وہ پھر آنے لگے اور مجھ سے تین دن نہ آنے کا کوئی سبب بھی نہ بتایا۔

امتحان ختم ہوا تو اپنی کلاس کے ضلع جہ کے سارے بچوں میں مسیکر نمبر زیادہ تھے ہیڈ ماسٹر صاحب آپا کو مبارک باد دینے آئے تو آپا نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمارے ماسٹر صاحب کی بہت تعریف کی اور اتنے اچھے ماسٹر کے مقرر کرنے پر ہیڈ ماسٹر صاحب کا منوں نے پھر ایک بار شکریہ ادا کیا، ہمارے ماسٹر صاحب ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ باتیں مجھے کچھ زیادہ سہلی بھی نہ لگیں۔ اس لیے کہ میری اپنی اہمیت میری سنایاں کا مانیابی کے باوجود جزوی ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری پٹیٹھ ٹھونک کر مجھے چٹا کر میری تعریف کی اور اپنے پاس ہی کرسی پر بٹھالیا تو پتہ نہیں کیوں میرا جی چاہا کہ اب وہ ہمارے ماسٹر صاحب کی اتنی تعریفیں کریں کہ آپا ان کے قائل ہو جائیں۔ چنانچہ پھر ماسٹر صاحب کی باتیں شروع ہو گئیں — خود آپا کہنے لگے کہ اس مبارک و مسعود موقع پر ماسٹر صاحب

اجلی پر چھائیاں

جنی

کے اب ناک نہ آنے کا انھیں بڑا دکھ ہے۔ انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ انھیں اس کی اطلاع ہے کہ ماسٹر صاحب ان سے کچھ خطا بھی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو آبا کا یہ سنجیدہ رد عمل، میں نے محسوس کیا کہ کچھ ٹھیک نہ معلوم ہوا، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آبا ایک معمولی ماسٹر کو اتنی اہمیت دیں کہ اس کے حوصلے ان سے خفگی تک بڑھ سکیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔ ”یہ آپ کیا فرماتے ہیں صاحب۔ وہ جدا آپ سے کیا خفا ہو سکے گا جس قدر ایسا نادر آدمی ہے اتنا ہی سخی بھی ہے۔ بالکل موڈی۔ لیکن آبا کی نظر میں جیسے ان باتوں سے بڑھ کر ہمارے ماسٹر صاحب کی اہمیت کم نہ ہوئی۔“

وہ کہنے لگے ”میں بابا کو نشی جی کے ساتھ ان کے گھر بھجوا رہا ہوں۔ وہ اس پر بھی نہ آئیں تو سوچا ہے خود ان سے ملنے چلا جاؤں۔“

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ بابا تمھارے آبا چوں کہ ضلع کے سب سے بڑے عیدار میں اس لیے ذرا سے سینک بھی ہیں۔ بالکل موڈی۔ لیکن جیسے ان کی لگائی بندھ گئی تھی۔

میں نشی جی کے ساتھ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا تو انھوں نے مجھے آتا ہوا دیکھ کر ایک ہی جست میں اپنی چو کوٹ اور سیڑھیاں پھلانگ لیں۔ جھپٹ کر مجھے اپنے سینے سے چٹالیا۔ میری آنکھیں، میرے گال، میری پیشانی چٹا چٹ چومنے لگے۔ مجھے شرم آتی رہی اور نشی جی کھڑے اپنی محدب شیشے والی عینک سے اپنی آنکھوں کی جوت بڑے پیار سے ہم پر پھینکتے رہے۔ ماسٹر صاحب مجھے چوم کر سیدھے ہوئے تو فوری انھوں نے منہ پھیر لیا۔ لیکن ان کا آنسو پہلے ہی میری پیشانی سے دھلک کر میری ناک پر پہنچ چکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ انھوں نے جس عطر سے مجھے لپٹا یا تھا۔ اسی

اجلی پر چھائیاں

اجنبی

سرعت سے مجھے چھوڑ کر وہ الگ کیوں ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اپنے سینے میں بھی آنسوؤں کا ایک سمندر ہے اور وہ آنکھوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور میں بے طرح سسکنے لگا۔ یہ سب کچھ دیکھتے کے دیکھتے ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ مجھے تنہا کر اپنے برآمدے تک لے آئے، اپنے آنسو چھپا کر میرے آنسو پونچھے۔ سامنے دھری ہوئی لکڑی کی معمولی سی کرسی کھینچ کر مجھے بٹھایا۔ اسٹول منشی جی کی طرف بڑھایا اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ کیوں کہ ان کے اپنے بیٹھنے کے لیے صرف مٹی کا فرش باقی تھا۔ ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کیں۔ ان کو کھڑا دیکھ کر میں بھی اسٹول کھڑا ہوا تو وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے برابر بٹھالیا۔

میں لوٹنے لگا تو آنکھوں نے میری پیشانی پر منی چاہی، جیسے بہت بزرگ آدمی ہوں۔ دراصل ایک امی تو انھیں فسر اس لیے خاطر میں نہیں لاتی تھیں کہ ان کی نظر میں نیا ماسٹر بالکل نا تجربہ کار لڑکا تھا۔

میں نے لوٹتے لوٹتے ان سے پوچھا کہ وہ سارے پرچے میرے حوالے کر دیں تاکہ میں کم سے کم اپنی چھپی ہوئی چیزیں اس موقع پر آبا اور امی کو بتلا سکوں۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ ایک دم کھل کر گلزار ہی گلزار بن گیا۔ کہنے لگے ”بابا میں تو سمجھتا ہی گیا تھا۔ پیا تعلیم میں تمھاری تازہ کہانی چھپ چکی ہے۔“ اور وہ اس طرح اندر جھپٹے جیسے ایک منٹ کی تاخیر بھی کسی بنے بنائے کام کو بگاڑ دے گی۔ جیسے تنھوڑی سی دیر ہو جائے تو میری کہانی کے صفحات بالکل سادھا سادھا سے لگنے لگیں گے اور ان کے سارے کے سارے حروف مٹ جائیں گے۔

سہ رنگی ٹائٹل کا خوبصورت سادہ سا امیگر ہاتھوں میں تھا۔ میں جب اوراق

اجلی پر چھائیاں
الٹ پھیر کر دیکھ چکا تو اسخوں نے مجھ سے یہ کہہ کر واپس مانگ لیا کہ آج شام ”میں خود اپنے
ساتھ وہ پرچے بھی لے آؤں گا جن میں تمھاری کہانیاں چھپی ہیں میں چاہتا ہوں کہ آبا
کو ساری چیزیں خود ہی بتاؤں۔“

شام تک ماسٹر صاحب کا منتظر رہنا سیکر لیے معمولی بات نہ تھی۔ میں نے صرف
ایک ہی بار تو اپنا نام ”پیام تعلیم“ میں دیکھا تھا۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس دل ہی دل میں
رہ گئی تھی۔ جس کے لیے شام تک انتظار کرنا تھا۔

شام کو لان پر کرسیاں بچھ گئیں تو آبا کی آمد سے پہلے ہی میں کھیں کو دیں حصہ لیے
بغیر بہت ہی مقطع بنا ماسٹر صاحب کا منتظر تھا۔ وہ دیر تک نہیں آئے تو میری بے چینی بڑھنے
لگی، آبا نے دو ایک بار کہا بھی کہ ”جاؤ کھیل لو، آج اس طرح یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“ میں
نے کہا ”ماسٹر صاحب آنے والے ہیں نا۔“ آبا مسکرائے۔ کہنے لگے ”مجھے معلوم ہے بھی
وہ آجائیں تو میں تمہیں بلالوں گا۔“

لیکن اس غیر معمولی تاخیر میں مشتبہ ہو چلا تھا، ہو سکتا ہے کہ وہ گھر آکر نہ آئیں
اور مجھ سے جھوٹا ہوا ہی کہہ دیا ہو۔ میں گیٹ تک جا کر ان کا انتظار کرنے کے لیے اٹھا تو
ترشی ہوئی شاداب ہارٹھ کے پیچھے سے وہ بہت ہی مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔
میں نے دبی زبان میں آبا سے کہا بھی کہ وہ آگے ہیں لیکن وہ کسی صاحب سے باتیں کرنے
میں منہمک تھے۔ جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔

ماسٹر صاحب آج پتہ نہیں اس آدمی کو کہاں چھوڑ آئے تھے جو آبا کے آگے
ہمیشہ ان کی نمائندگی کرتا آیا تھا۔ آبا کو باتوں میں منہمک دیکھ کر مجھے یک گونہ سکون
ہوا کہ چلو ماسٹر صاحب کو یہ احساس تو ہے کہ آبا ان کی طرف نہیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن

نبلی پر چھایاں
اسٹر صاحب آج آبا کے وجود اور عدم وجود ہی سے جیسے بے نیاز تھے میں نے پہلی بار اسٹر صاحب کو آبا
سے سامنے اس طرح دیکھا جیسے وہ کمرے میں بیٹھے ہم بچوں کے نرغے میں مطمئن ہوں۔
اس اثنا میں آبا کی نظر ان پر پڑی تو انھیں دور ہی سے دیکھ کر آبا تغلیماً اٹھ کھڑے ہوئے
البا اس تکبریم کے پیچھے کچلی ساری شکر بخیر یوں کا ازار بھی آبا کا مقصود ہو۔

آج اسٹر صاحب میری سمجھ سے باہر تھے۔ آبا کو کھڑا دیکھ کر بھی وہ اطمینان سے
سکرتے ہوئے ان کی طرف بڑھتے رہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ آدمی چھتے زندہ
ہیں ہو سکتا جو ہمارے ماسٹر کو باڑھ تک لا کر پیچھے ڈھکیل دیتا تھا، اور خود آبا کے آگے
اس طرح کی حرکتیں کرتا جیسے بقول منی کے۔ کلو کے فٹس آرہے ہوں۔

ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں پیام تعلیم اور غنچہ کے رسالے دیکھ کر میری توجہ ان کی
خصیت سے ہٹ کر انہی شخصیت میں مرکوز ہو گئی کہ ابھی ابھی دیکھتے کے دیکھتے آبا کے
نگے میری ادبی حیثیت مسلم ہو جائے گی۔

ماسٹر صاحب آبا کے قریب آئے تو انھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور میری کامیابی
زنجیں مبارک باد دی۔ میں نے اس درجہ خود اعتمادی اپنے ماسٹر میں کبھی نہیں دیکھی
فی۔ مجھے آبا سے ان کا اس طرح ملنا ایک عجوبہ سا نظر آ رہا تھا۔ اس آدمی کی موت پر
بے غایت درجہ خوشی ہوئی چاہیے تھی جو ماسٹر صاحب کو بے طرح اپنے شکبے میں جکڑے رہتا
نا اور جس کے ہاتھوں ماسٹر صاحب کی زندگی ہی میں کئی بار موت واقع ہو چکی تھی لیکن
برا ذہن یہ ساری باتیں سوچنے کے لیے اس وقت تیار نہ تھا۔ میری ایون خواہش تو
نشری تھی کہ ماسٹر صاحب کی بغل میں دبے ہوئے سارے رسالے پکب جھکے تک آبا
سے ملنے کھل جائیں اور ان کے صفحات پر میرا نام چمکتا، دکھتا ہوا انھیں نظر آئے۔

ماسٹر صاحب بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے میری تعریفیں کر رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے ہمارے کمرے میں بیٹھے ہم سے باتیں کر رہے ہوں۔ کئی بار تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اب موجود نہیں ہیں ورنہ آبا کی موجودگی میں ماسٹر صاحب کا اس آدمی میں پناہ لینا بالکل یقینی تھا جو اپنے اندر ماسٹر صاحب کے سارے وجود کو چھپا لیتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں آج وہ ذلیل اور بزدل آدمی کہاں فرار ہو چکا تھا۔ میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ میکے پر تو زین پر نہ تھے۔ جیسے اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہوں۔

جب ماسٹر صاحب نے آبا سے کہا کہ آپ بابا کو رسالے اور دوسری کتابیں بھی پڑھنے کی اجازت دے دیجیے۔ وہ جو بھی پڑھتے ہیں اس میں میری مرضی کو دخل رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے کورس کی کتابوں کے سوا کچھ اور پڑھنے سے انہیں منع کیا ہے۔ تو آبانے دینی زبان میں صفا اتنا کہا کہ ”میں نے بالکل منع تو نہیں کیا تھا۔“ ماسٹر صاحب نے رسالے ان کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”دیکھیے ان کی کہانیاں اور مضامین ان رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اسکول بچوں کوئی لڑکا اول تو آجھی سکتا ہے۔ لیکن یہ صلاحیتیں ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتیں۔“

آبا مسکراتے رہے، اور رسالوں کے ورق الٹ الٹ کر میرا نام دیکھتے رہے مجھے اتنی خوشی زندگی میں کبھی حاصل نہ ہوئی تھی جو ماسٹر صاحب کی زبانی اپنی تعریف سن کر اس وقت حاصل ہوئی تھی۔ آبانے رسالے امی کو بتانے کے لیے رکھ لیے۔

اس کے بعد ماسٹر صاحب براہ راست رہے۔ تعطیلات ہی میں نئی جماعت کی نئی کتابیں شروع کر دی گئیں اور پڑھنے لکھنے میں مجھے بڑی لذت سی محسوس ہونے لگی۔ کبھی کورس کی کتابیں، کبھی رسالے یا دوسری کتابیں پڑھتا رہتا۔ رسالے

بلی پر چھائیاں
 رہتے وقت بھی کبھی امی آجائیں تو مجھے ان کی آمد کی پرواہ نہ ہوتی۔ بعضے تو ایسا بھی
 کرتا کہ امی میری ہانہ پکڑ کر مجھے ٹیبل سے اٹھا دیتیں کہ بھری شام کو پڑھتے رہنے
 سے آنکھیں اور صحت خراب ہو جاتی ہے۔ کھیل کود کے وقت کھیلنا بھی تو چاہیے
 ضر۔ اس طرح اٹھاتے وقت انہوں نے نصاب یا غیر نصاب کی کتاب کی کبھی بھی
 زیق نہ کی اور یہی بات مجھے بڑھاوا دینے کے لیے بہت کافی تھی۔

مشومیاں کہنے لگے کہ امی اب ماٹ صاحب بالکل اچھے ہو گئے ہیں۔ انہیں
 پاس بھی نہیں آتے، اور منی ان کی بہت دوست ہو گئی ہے۔ — مجھے
 شومیاں کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ میں نے انہیں دس ڈانٹا۔ فس کب آتے تھے جھلا
 سٹر صاحب کو۔ وہ تو منی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی تھی۔ لیکن تم تو سیدنے
 نا، تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ ”مشومیاں تو خیر چپ ہو گئے لیکن امی نے مجھے
 ی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ سچی بات کرو می لگتی ہے ہمیشہ۔

آہستہ آہستہ ہم اس شخص کو سچول گئے جو ہار ھ کے پاس سے ماسٹر صاحب کو
 چھ دھکیل کر آگے آگے سے گذرنا ہوا ہمارے کمرے کی سیڑھیوں تک پہنچ کر گئیں
 سب ہو جاتا تھا۔

میں تو اپنے کمرے میں ہمیشہ ماسٹر صاحب ہی ملے۔ سبھی گھبی وہ دبے پاؤں ہمارے کمرے
 مداخل ہونے کی کوشش کرتا بھی تو جیسے ماسٹر صاحب سے خائف ہو کر فرار ہو جاتا۔ لیکن
 کے آگے تو وہ ماسٹر صاحب کو اس طرح دبوچ لیتا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ لیکن
 یہ باتیں قریب قریب سب کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں یہاں تک کہ غدیرے اپنے ذہن سے بھی۔
 ماسٹر صاحب بڑے اطمینان سے کتابیں بغل میں دبائے چلے آتے۔ آباہوئے
 ماتو نہایت بردباری سے گردن ذرا سا خم کر کے ان کو سلام کرتے وہ بھی

اپنی کرسی سے نیم استادہ ہو کر جواب دیتے۔

ہم پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میں اپنے پرچے، اپنے رسالے بغیر کسی پس و پیش کے جب چلے پڑھتا، اور اب کبھی بھی آبا اور امی کو دیکھ کر نصاب اور غیر نصاب کی تفریق کا احساس ہی نہ ہوتا۔ اپنی ہر حرکت اور ہر عمل پر ایک بھرپور اعتماد کا عالم زندگی کو کس قدر موقع بنادیتا ہے۔ غیر شعوری طور پر میں کچھ اسی عالم سے گذر رہا تھا۔

امی اب ماسٹر صاحب کا نام لیتی تو اس میں عزت و توقیر شامل رہتی۔ وہ اگلا سا انداز نہ ہوتا جس سے کبھی کبھی مجھے دکھ ہوتا تھا۔

ایک دن ماسٹر صاحب تین دن تک نہیں آئے معلوم ہوا کہ ان کی ترقی کا مسئلہ پیش ہے اور وہ اسی لیے کوشاں ہیں مجھے معلوم تھا کہ ماسٹر صاحب کو ان کے اسکول میں ترقی دے دی گئی ہے لیکن کچھ روز سے یہ افواہیں بھی تھیں کہ ان کے کسی ساتھی نے اس ترقی کے خلاف اپیل کی ہے۔ اسکول میں جب وہ مجھ سے ملے تو انہوں نے صفا اتنا کہا کہ ”بابا، اپیل آبا کے پاس ہی کی گئی ہے اور ان کا فیصلہ قطعی اور آخری ہو گا۔ اس لیے کہ اور آگے جانے کی ہمت میسر مخالف میں نہیں ہے۔“

میں نے اتنے دن سے نہ آنے کا سبب پوچھا تو جواباً انہوں نے شب کو آنے کا وعدہ کیا اور کچھ کہے سے بغیر چلے گئے۔ میں ان کی شخصیت کے اس پہلو سے بھی بہت متاثر ہوا۔ پتہ نہیں میسر ذہن نے کیوں اس طرح سوچا کہ وہ ان دنوں دانستہ ہمارے گھر آنے سے گریز کر رہے ہیں۔ تاکہ آبا بغیر کسی جانبداری کے اپیل کا فیصلہ کر سکیں۔ چاہے وہ ماسٹر صاحب کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ شام کو ماسٹر صاحب آئے تو آبا لان پر پڑی ہوئی ٹاکس چیر نیم دراز حالت میں سگاری پی رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں نیا رسالہ دیکھ کر میں چھٹا تو ترشی ہوئی شاداب باڑھ

اُجلی پر چھائیاں

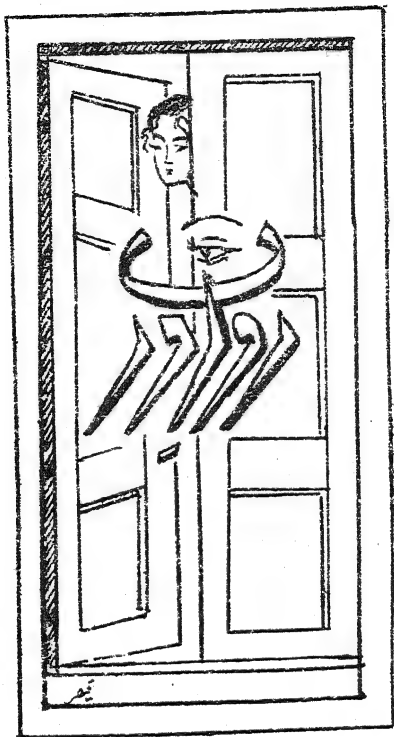
اجنبی

سے آگے بڑھتے ہی ان کی آنکھیں آبا سے چار ہوئیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔
ماسٹر صاحب جیسے کہیں غائب تھے۔

اسی بزدل آدمی نے بڑھ کر ان کو آج پھر دبوچ لیا تھا اور وہ آبا کے آگے اس طرح
مضمحل اور ٹڈیال قدم اٹھا رہے تھے جیسے اب دم توڑ دیں گے اب دم توڑ دیں گے۔
سہمے سہمے سے آبا کی طرف کن آنکھوں دیکھتے ہوئے ٹوپی کو درست کرتے ہوئے
شیروائی کے دامن کو چمکی سی لے کر اپنی رانوں میں اڑتے ہوئے۔ ٹرٹڑ کر کون کھائے ہوئے
پتنگ کی طرح۔ افسیر اللہ۔

ایانے مجھے پکارا تو جیسے میں سہم گیا۔

ان کے قریب پہنچتے پہنچتے جانے کیوں ہاتھ پیچھے کر کے میں نے اپنا
رسالہ چھپانے کی کوشش کی، پھر گھبرا کر باڑھ میں پھینک دیا۔ جس میں میری کہانی
تھی۔ جس میں میرا نام روشنائی سے نہیں روشنی سے لکھا ہوا ہوگا۔



ذکیہ آج پھر تمھاری گھنی پلکوں پر موقی چمک رہے ہیں۔ میں نے ان موتیوں کو کبھی بٹورنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف اس لیے کہ میں ان کی قدر و قیمت سے واقف ہی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ موقی اٹھول ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان موتیوں کی آب نے کسی کے دامنِ دل کو جھلس دیا ہو لیکن تم برا نہ مانو تو تم سے ایک بات کہوں میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ تم جب کبھی روٹی ہو اس وقت روٹی ہو جب کہ تمھیں ہنسنا چاہیے تھا، کم از کم مسکرانا تو ضرور چاہیے تھا تمھیں۔ نرم مسکراہٹ، شیریں مسکراہٹ، مسکراہٹ جو ستارہ صبح کا ہی کی گول کرن کی طرح گداز ہو۔ مسکراہٹ جس کی سرخی گھلتی ہوئی نکلا لی کلی کے سینے میں تمھارے روئے ہوئے خون کے آنسوؤں سے دھل کر منجمد ہو گئی ہو۔ اور مجھے تمھاری یہ مسکراہٹ بہت پسند ہے ذکیہ۔ میں اس مسکراہٹ کا احترام کرتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مسکراتی رہو۔ کرنیں ہی کرنیں کھیرتی رہو۔ کلیاں ہی کلیاں چمکاتی رہو۔ لیکن نہیں مجھے معاف کرنا۔ میں نے تم سے کوئی ایسی بات ضرور بچائی ہے جس کا میں تم سے اظہار کرتا تو شاید تم رو پڑتیں۔ درآئیں لیکہ اس بائیس کے

اُجلی پر چھائیاں

روزِ نادر

اظہار کے باوجود مجھی تم مسکرا سکتی ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے اور مجھے تمہاری ہلکوں پر جھلکتے ہوئے ستاروں سے وحشت ہوتی ہے لیکن ٹیپٹہ انجام سے بے خبر ہو کر میں تمہیں صفا اتنا بتا دوں کہ میں نے ایک بات تم سے غلط کہی میں نے کبھی بھی تمہاری مسکراہٹ کا احترام نہیں کیا۔ کوئی مرد کسی عورت کی مسکراہٹ کا احترام نہیں کر سکتا۔ یا پھر کر سکتا ہو گا۔ مجھے اس سے کیا لینا۔ میں اپنی بات کہے جاؤں تو ٹھیک ہے۔ باوجودیکہ تم سب سے بہت عزیز ترین دوست کی بیوی ہو لیکن میں اس کو کیا کروں ذکیہ کہ زندگی کی ساری رعنائی، زندگی کی ساری شادابی صفا تمہارے ہونٹوں کے مقدس آگئی ہے۔

دنیا کے سارے اجالوں کو تم نے اپنے ہونٹوں کے محراب میں محصور کر رکھا ہے اور جب تم مسکراتی ہو تو میں کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ تمہارے ہونٹوں سے پھوٹی ہوئی اُجلی کرنوں کے تانے بانے میں بے طرح بکرا جا رہا ہوں۔ لیکن اسی لمحہ مجھے اپنی دیانت داری خود کو فریب دینا سنبھالیتی ہے اور میں احترام کا لفظ استعمال کر کے خود کو فریب دیتا ہوں۔ تم کو فریب دیتا ہوں اور اپنے عزیز ترین دوست کو فریب دیتا ہوں جس کی تم بیوی ہو۔ اس لیے کہ میں تمہاری مسکراہٹ کا احترام نہیں کرتا بلکہ تمہاری مسکراہٹ مجھے پسند ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مجھے کسی کی گوری یا پس پسند ہیں۔ کسی کی خروچی انگلیاں پسند ہیں کسی کی ناک کا تل پسند ہے۔ یہاں تک کہ کسی کا طرز گفتگو پسند ہے۔ کسی کا انداز سپردگی پسند ہے۔ اسی طرح ذکیہ مجھے تمہاری مسکراہٹ پسند ہے۔ میں نے گوری یا ہوں سے لے کر عالم سپردگی تک کسی کا احترام نہیں کیا ہے تو میں تمہاری مسکراہٹ کا کیسے احترام کر سکتا ہوں — لیکن یہ سب باتیں میں تم

جلی پر چھائیاں
 سے کہ نہیں سکتا کیوں کہ تم میرے بہت عزیز دوست کی بیوی ہو، اور میرا دوست
 مجھ پر بہت اعتماد کرتا ہے۔ اتنا اعتماد کہ تمہیں خود پر اتنا اعتماد نہیں ہو سکتا۔ اور نہ
 خود مجھے اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہے۔ میرا دوست غالباً تمہیں بے اندازہ چاہتا
 ہے لیکن اس کے باوجود تم نہیں مسکراتیں۔ تم نہیں مسکوا سکتیں اور نہ میں تم سے مسکرانے
 کا خواہش کر سکتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی مسکراہٹ کا
 تمہیں بھی علم ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر تم اس بات کو سمجھ چکی ہو کہ تمہارے
 زانیوں میں گھٹ کر جس اُجالے نے دم توڑ دیا ہے، جس اندھیرے نے جہنم لیا ہے
 اس اندھیرے پر تم فستح نہیں پاسکو گی۔ لیکن اس میں میرے دوست کا کوئی تصور
 میں ہے۔ تمہارے دونوں بچوں کا کوئی تصور نہیں ہے، اور نہ خود میرا اپنا اس میں کوئی
 شے ہے کہ میں ایک عزیز دوست کی بیوی کی مسکراہٹ کے لیے تڑپ رہا ہوں لیکن میرے
 بچے کا انداز بالکل وہی ہے جو گوری باہوں کے میری گردن میں حائل نہ ہونے تک تھا
 بڑی انگلیوں کے میسرے لیے بالوں سے نہ کیلئے تک تھا۔ اداس آنکھوں کے میری اپنی
 نبوں میں نہ جھانکنے تک تھا، اور ناک کے تل تک میرے ہونٹوں کے نہ پہنچنے تک تھا۔
 سب بے گناہ ہیں ذکیہ۔ یہاں تک کہ تم سبھی بے گناہ ہو۔ تم جو میری موجودگی میں اپنی
 بیوی ہوئی مسکراہٹ کو ڈھونڈ کر لے آتی ہو۔ تم جو میری قربت پر اپنے ہونٹوں سے
 جی ہوئی بچلیوں کو اپنے معاشرے کے ظالم ہاتھوں سے چھٹ کر اپنے ہونٹوں پر
 سے لہرانا چاہتی ہو، لیکن بچلیوں کے بجائے صفحہ جگنو چمک کر رہ جاتے ہیں۔ اور
 جگنوؤں کی روشنی سے بھی میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اس خیرگی کو میں تم پر
 نہیں کر سکتا، اور پوری قوت سے اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔ انہیں چھپکنے تک

اُعلیٰ پر چھائیاں
 نہیں دیتا، صرف اس لیے کہ تم میرے عزیز ترین دوست کی بیوی ہو، اور صرف اس لیے
 کہ اگر میری آنکھیں جھپکتی ہیں تو تمہارے ہونٹوں کے مخراب میں یہ جھللاتے جگنو ایک دم سے
 گہرے اندھیرے میں بھٹک جاتے ہیں۔ ایسے اندھیرے میں جہاں وہ روشنی نہیں اُگل سکتے
 بلکہ تاریکیاں ان کی روشنی کو نگل لیتی ہیں اور تمہاری گھنی پلکوں پر موتی چمک اٹھتے ہیں،
 صبر اس لیے کہ میں تمہارے شوہر کا عزیز ترین دوست ہوں اور وہ تم پر اور مجھ پر
 دونوں پر اعتماد کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ مجھے تمہاری پلکوں پر چمکتے موتی
 ان موتیوں سے کیا لینا ہے جن کی قدر و قیمت سے میں واقف نہیں ہوں اور جو
 میرے عزیز دوست کی زندگی کی پونجی ہیں۔

ہاں اور سونو ذکیہ — کیا میں آج تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے تمہارے ہنسنے
 اور رونے کے سوا تمہاری خاموشی سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ جب تم روتی ہو تو مجھے
 ہنستی ہوئی دکھائی دیتی ہو، اور ہنستی ہو تو تمہارے لبوں پر مسکراہٹ کی بجائے آنکھوں
 میں آنسو دکھائی دیتے ہیں، اور جب تم خاموش ہوتی ہو تو میں محسوس کرتا ہوں جیسے
 تم کچھ بول رہی ہو، اور جب تم بولتی ہو تو محسوس ہوتا ہے جیسے بالکل خاموش ہو،
 اتنی خاموش کہ تمہاری اپنی آواز بھی تمہارے اطراف پھیلے ہوئے بیکراں سناٹے
 سے بچ کر خود تمہارے اپنے کانوں تک بھی نہیں پہنچ پاتی ہے۔ تمہیں بتاؤ
 ذکیہ کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے، کیا ہے، کیا تم وہی ہو جو تم نظر آتی ہو یا وہ
 ہو جو نظر نہیں آتی۔

تم اس دن کرید کرید کر سر ٹیڈا نا سے متعلق پوچھ رہی تھیں — میں دانستہ
 اس موضوع سے گریز کر رہا تھا۔ تم چاہتی تھیں کہ میں کسی بات کا اعتراف کر لوں کسی

جلی پر چھائیاں

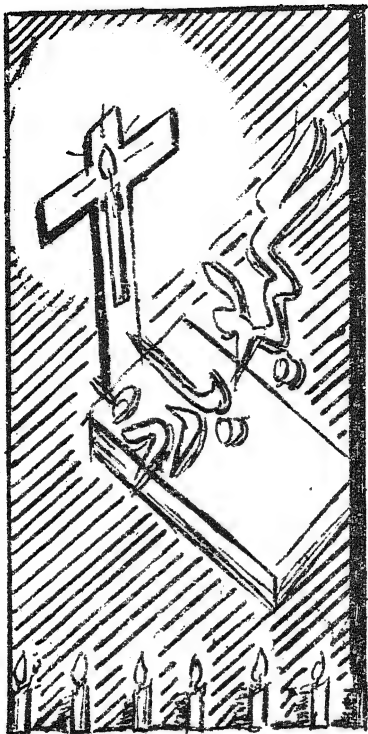
روزانہ در

یسی بات کا جس کے غلط ہونے سے شاید تمھیں تکین ہوتی — دیکھو ذکر سر ڈرانا
 ناشوہر اس کو بے پناہ چاہتا ہو گا۔ اس کی محبت کی تاریخ اور جزافیہ سے میں قطعی
 واقف نہیں ہوں، اور نہ میں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں
 کہ سر ڈرانا ایک خوبصورت عورت ہے۔ ایک بچے کی ماں ہے اور اس ایک بچے کے
 مدد و محسوس کرنے لگی ہے کہ اس کو ایسے محرم استعمال کرنا چاہیے جس میں سینے کو
 بڑکھڑکھاتا دوشیزگی کی حدوں کو چھوتی ہوئی محسوس کرتی ہے، اور وہ سہول
 قی ہے کہ یہ اسباب پر کڑے کے کلف کارہن منت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بچہ پالنے والی
 کا بچہ ہو۔ مجھے شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کڑاں کو پورا یقین
 ہے اور سر ڈرانا بھی کچھ ایسا ہی سمجھتی ہے۔ لیکن مجھے تو مفروضہ معلوم ہے کہ کڑاں
 رڈرانا کو زمین سے بہت بلند یوں پر ہواؤں میں اڑانا چاہتا ہے۔ اڑتے ہوئے
 ہلکے بادلوں کی نمی سے اس کی ملائم ریشمی زلفوں کو جھگو کر اپنی انگلیوں سے اس کی
 زل میں کنگھی کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سر ڈرانا اس کے ساتھ زمین سے
 تہ اوپر اٹھ کر زمین کی پستیوں پر مسکرائے، اور وہ اٹھتے ہوئے چاند کی کرنوں
 زکر سر ڈرانا کے ہونٹوں پر قرض کرنے کے لیے چھوڑ دے اور اس کو بتائے کہ
 اگے ہونٹوں پر لب اسٹیک نہیں بلکہ شفق کی سرخیاں مل دی گئی ہیں، اور
 برانا ان باتوں پر ایمان لے آئے۔ لیکن سر ڈرانا کو زمین سے بے حد انس ہے
 باہتی ہے کہ اس کے پاؤں بالکل زمین پر رکے رہیں، اور اس سے کوئی چپکے
 کہہ کہ تمھارا حسن خود زمین و آسمان کو اپنے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ شفق کی
 یاں تمھارے گلنار عارض پر نشان رہیں، اور تمھاری ریشمی زلفوں کے آگے

نرم اور ملائم ابر کے ٹکڑے ہیج ہیں۔ تمہارے کانوں میں سجے ہوئے ٹاپس پر سو باہر ستارے نقد کیے جاسکتے ہیں۔ تم مسکراتی ہو تو سویرا مہونے لگتا ہے اور تم خاموش ہو جاتی ہو تو آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ اور میں نے اپنی مضبوط باہوں میں سر ڈالنا کو چھوڑ کر اس سے کچھ اسی قسم کی باتیں کیں۔ ایسی باتیں جس سے اس کا وقار اس کی اپنی نظروں میں اور بڑھ گیا۔ ایسی باتیں جس سے وہ خود کو زیادہ حسین محسوس کرنے لگی۔ ایسی باتیں جن سے اس نے خود نمائی سیکھی اور اس کے غرور نے پائلٹ زال کو آسمان کی وسعت میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا اور سر ڈالنا مجھ سے قریب تر ہوتی گئی لیکن بہت جلد پائلٹ زال کے مجھ سے ہوئے پٹل نے سر ڈالنا میں جاگی ہوئی خود نمائی کے پرچے اڑائیے اور میرے سارے انقلابی نظریوں کو اپنی گولیوں سے سسما کر دیا، اور پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ لیکن سر ڈالنا کی آنکھیں آج بھی میرے لیے بے خواب ہیں، وہ آج بھی زال کے پہلو میں بیٹھ کر میرے متعلق سوچتی ہے۔ اس کا دل کمزور ہو گیا ہے۔ پائلٹ زال اب اس کو آسمانوں کی وسعتوں کی سیر نہیں کر سکتا۔ یہ زندگی کی کوئی بہت بڑی ٹریجڈی نہیں ہے ذکیہ۔ ہمارے سماج کا حسن ان ہی سانچوں سے نکھرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی خوبصورتی انہیں حسرتوں سے قائم ہے۔ ہمارے شب و روز انہیں ناکامیوں سے تابناک ہیں۔ ہم زندگی میں کسی چوٹ کے، کسی کسک کے، کسی ہلکے سے درد کے قائل ہیں۔ کسی ایسے درد کے، کسی ایسی کسک کے جس کے بغیر ہماری تخلیقی صلاحیتیں ختم ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ درد زندگی میں صرف تمہیں اور مجھے ہی حاصل نہیں۔ پائلٹ زال کو بھی حاصل ہے۔ سر ڈالنا کو بھی حاصل ہے۔ قریب قریب اپنے وطن کے ہر مرد اور ہر عورت کو حاصل ہے جو زندگی کے ناخدا ہیں تخلیقات کے خدا ہیں۔

اچھا اب تم بھاگ جاؤ ذکیہ۔ میری بیوی آرہی ہے اور اپنے پانچوں بچوں کو ساتھ لیے ہوئے آرہی ہے اور اب میں تمہیں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا، ورنہ وہ سمجھے گی کہ میں ہمیشہ افسانہ ہی لکھتا رہتا ہوں اور کھڑی کھڑی دور دور تک خلاؤں میں گھورے گی لمحہ محو کے لیے مجھ سے اور اپنے پانچوں بچوں سے بے نیاز ہو جائے گی۔ ہاں ذکیہ سوچ رہا ہوں کہ جب تم خود اپنے بچوں میں گھری ہوئی میرا یہ اوٹ پٹانگ خطا پرستی رہو گی تو تمہاری نظریں کبھی میری تحریر پر ہوں گی، کبھی اپنے دروازے پر کہ کہیں تمہارا شوہر نہ آجائے۔ میرا دوست نہ آجائے لیکن کبھی جب میں تم سے ملوں گا تو تم اپنی اس کیفیت کا اظہار تک مجھ سے نہ کرو گی جو تم پر میرا خط پڑھتے وقت طاری ہوگی۔ یہ سارے جذبے کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور اپنی موت مر جاتے ہیں۔

ذکیہ چپکے سے مجھے بتاؤ تم نے اپنے سینے میں کس کس طرح مجھے چھپا رکھا ہے۔ بھری برساتوں کے روپ میں یا دینی دینی چنگاریوں کے روپ میں۔



اس کی ممی نے دروازہ کھول کر مجھے دیکھا اور فوراً کہہ اٹھی کہ ”وہ گھر پر نہیں ہے۔“

میں جانتا تھا کہ اس کی ممی ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنہیں ہماری دوستی ناپسند ہو۔

پھر وہ مسکراتی کیوں نہیں؟

”تم سے کہیں اپائنٹ منٹ (APPOINTMENT) تھا کیا۔“

”ہاں“ میں نے کہا۔ ”میں کوئی نصف گھنٹہ انتظار کر کے آ رہا ہوں۔“

”وہ گریویارڈ گیا ہو گا۔“

”گریویارڈ!! — مجھے بہت تعجب ہوا — ہارڈنگ تو ان لوگوں میں سے

ہے جو مر کر بھی گریویارڈ نہیں جاتے۔

میں نے پوچھا۔ ”کیوں خیریت تو ہے؟“

کہنے لگی۔ ”کوئی خاص بات نہیں۔ تم بھی چلے جاؤ تو خود سمجھ لو گے۔“

مئی تو پہیلیاں بھجوا رہی ہے۔ میں نے دل میں کہا۔

”دو اکیلا گیا ہے یا اپنی بھی آئی تھی؟“

”دو اپنی کوئی پہینے بھستے اور نہیں آئی۔“

میں نے بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے جی چاہتا تھا کہ اپنی کے پہینے بھجے کے طویل غیاب کے بارے میں مئی سے تاثر تو پڑ بیسوں سوالات کر دوں لیکن یہ سوچ کر کہ میرے استفسارات کو وہ جذبہ رقابت پر محمول نہ کرے میں نے کوئی بات ہی نہ پوچھی۔
حالانکہ مئی کو بہ وجہ غلط فہمی تھی۔ لیکن کچھ دنوں سے وہ مجھ پر زیادہ ہی مہربان تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔

میں نے اس سے وداع ہوتے ہوئے سوچا کہ ہارڈنگ نے بھی مجھ سے کچھ نہ کہا۔ اور اپنی کے ساتھ تو گئے اتوار ہی کو میں نے پی تھی اور وہ معمول سے زیادہ ہی خوش تھی۔ کوئی ایسی بات اس نے بھی نہیں کی۔

گریو یارڈ کوئی دور نہ تھا۔ ام۔ ال۔ ایز کوارٹرس کے بالکل سامنے۔

میں نے اپنی اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا اور ہارڈنگ کی مئی نے مسکرا کر دروازہ بند کر لیا۔

میری نظروں میں ہارڈنگ کا ہنسی مسکراتا ہوا چہرہ گھوم گیا۔ اس کی مسکراہٹ اس کی مئی کی مسکراہٹ سے کس قدر مشابہ تھی۔ پچھلا ہونٹ دیا کر باجھوں کو خفیف سی جنبش دے کر کچھ اس طرح مسکراتا جیسے ہونٹ کم اور آنکھیں زیادہ کھل رہی ہوں۔
گریو یارڈ پہنچا تو وہ ساری اداسیاں جو راستے میں ذہن نے پیدا کی تھیں اور جسے دل نے چپکے سے اپنے پر مسلط کر لیا تھا پتہ نہیں کہاں لکھک گئیں۔

اُجلی پرچھائیاں گریویارڈ
 زندگی کی ہل چل، اس کی حرارت، اس کی چہل پہل، اس کی چلت پھرت —
 زندگی کا سب سے برا حصہ یہی تو ہے۔ گریویارڈ کے تصور نے یہ سارا حسن مجھ
 سے چھین لیا تھا۔ اور پھر ہارڈنگ کبھی بھی کسی قبرستان کو نہیں جاسکتا۔
 اس کی فطرت، اس کا کلنڈراپن، اس کی شرائط ان کے لیے ایسے مقامات پر ہیں
 جگہ ہی نہیں ہے۔

اب جب کہ گریویارڈ کے قریب پہنچا ہوں تو سمجھ میں آیا کہ ہارڈنگ اپنی ساری
 شخصیت کے ساتھ جوں کا توں یہاں تک آسکتا ہے۔
 گریویارڈ پر اپنی لمبی لمبی گھنی شاخیں پھیلا کر رات کی تاریکیوں میں جھومنے والے
 دیونا درخت بجلی کے چھوٹے چھوٹے قمقموں اور قبروں پر سبھی ہونی موم بتیوں کی روشنی کے
 آگے جیسے اپنی ساری رعوت اور طنطنہ کھو چکے تھے۔ ان میں بڑی نرمی آگئی تھی بڑا
 گداز آگیا تھا، مختصر یہ کہ بڑی زندگی آگئی تھی۔

گیٹ پر پہنچنے تک کتنے شانوں سے شانے ہلکا ہلکا کر بڑھنا پڑا ہے۔ کچھ نوجوان
 تو آئے ہی گویا اس مسخرگی کے لیے تھے۔

بوٹدری کے باہر پھولوں، مٹھائیوں، کھلونوں کی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔
 ٹھیلوں پر کھاری چیزوں سے پتیلی ستالیاں سجائے ٹھیلے والے گھنٹیاں بجا رہے تھے
 احاطے کے اندر کا سماں اور سبھی دیدنی تھا۔ ساری فضا جگمگا رہی تھی۔ سارا
 ماحول سلگ اٹھا تھا۔ ہر قبر پر سر ہانے سے پانچ تک تین تین چار چار پنچ کے
 فاصلے پر موم بتیاں جما کر جلا دی گئی تھیں۔ موم بتیوں سے جو جگمگ رہی
 تھی اس کو سرخ اور پیلے پھولوں سے ڈھنک دیا گیا تھا۔ اس طرح ساری کی

اُجلی پر چھائیاں گریو یارڈ
ساری قبریں پھولوں اور ننھے ننھے شعلوں سے ڈھنکی جھپی دہنیں بن گئی تھیں جیسے
سرخ اور زرد زرین ڈوپٹوں پر سونے کی چمکیاں ٹانگ دی گئی ہوں۔

موم بتیاں آہستہ آہستہ پگھل رہی تھیں، ان کی ٹانگ آنکھوں سے دھلکتے ہوئے
آنسو ان کے قدموں میں پڑے ہوئے پھولوں کے کھلے ہوئے سینوں میں حدت اور
حرارت پیدا کر رہے تھے۔ پھر یہ آنسو خود سرد ہو کر منجمد ہو جاتے۔ جیسے
سرخ اور زرد سیپوں کے کھلے ہوئے سینوں میں موتی دمک رہے ہوں۔

زندگی میں موم کی طرح جلنے کا انداز۔ پتہ نہیں ان قبروں میں ابدی نیند
سونے والوں میں کن کن کے حصے میں آیا تھا۔

گریو یارڈ کے احاطے میں داخل ہو کر قبروں کے قریب پہنچنے پہنچنے تک میسر
ذہن اور دل میں پھر اداسیاں اور محرومیاں اپنے لیے جگہ بنا رہی تھیں۔ دل کا
کچھ عجیب سا عالم تھا جیسے موم تہی ہی کے مانند بغیر کسی شعلے ہی کے پگھل رہا ہو۔
قبروں کے درمیان چھٹے ہوئے گز گز سب کے فاصلے جیسے پھولوں اور شعلوں
کی اسی کھیتی میں پگھلنے والوں کا کام دے رہے تھے۔

زندگی جیسے ان پگھلنے والوں پر اس قدر نرمی سے پاؤں دھر رہی تھی کہ مبادہ
سوئی ہوئی موت بیدار نہ ہو جائے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جاگنے والے
سونے والوں کی نیند کی حفاظت کر رہے ہیں۔ کچی نیند کی جوا بھی ابھی لگی ہے
جوا بھی ابھی ٹوٹ جائے گی۔

اداس چہرے بھیگی ہوئی آنکھیں غمزدہ دل۔ موم بتیاں قبروں پر چل رہی تھیں۔
موم بتیاں قبروں کے اطراف انسانی صورتوں میں چل پھر رہی تھیں۔

کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ دبا دیا۔

وہی مسکراتا ہوا چہرہ۔

”میں نے آدھ گھنٹے تک تمہارا انتظار کیا۔“

”مجھے تمہاری آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔“

دور پر زور دیتے ہوئے ہارڈنگ نے بات ہی بدل دی۔

میں سپر بھی مسکرا نہ سکا۔

ادھر ادھر نظر میں اٹھا کروہ اطمینان سے ”بل گم“ چبانے لگا۔

”کہاں رہے تم“ میں نے پوچھا۔

”بروج کے گھر گیا تھا۔ وہ نہیں ملا۔ پھر اپنی کے گھر گیا۔ وہ بھی

نہیں ملی۔ پھر ویکا چیز مینیا۔ تم بھی نہیں ملے۔“

”پورے ستیس منٹ ”ویکا چیز“ میں انتظار کر کے میں تمہارے گھر گیا تھا

— تم نہیں ملے۔“

”کوئی کسی کو نہیں ملا۔“ وہ سپر مسکرانے لگا۔

”کچھ پی بھی؟ بہت سو بر معلوم ہوتے ہو؟“

”ہاں صفر دو پک“ میں نے جواب دیا۔

”چلو کچھ گھومیں پھریں۔“

”نہیں یارب چلیں یہاں سے۔“

”کیوں۔“ اس نے میرے شانے پر ایک ہلکی سی چپت لگا دی۔

”تم بھاگ جانا چاہتے ہو اس ماحول سے۔ کیوں ہے ناپسی بات؟“

اُعلیٰ پر چھائیاں
 میں جلتی ہوئی موم بتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جواب نہ پا کر اس نے میری باہنہ
 پکڑ لی اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ دبے پاؤں آہستہ آہستہ، قبروں کے
 درمیان۔ کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔

”وہ دیکھو“۔ دائیں جانب انگلی اٹھا کر اس نے بتایا۔

اپنی اور بروج ایک قبر کے پائنتی سر جھکائے کھڑے تھے۔

”یہ بروج بھی عجب نان سنس ہے یار۔“

”کس کی قبر ہے وہ۔“ میں نے ہارڈنگ کی بات کو سُنی ان سنی کرتے

پہلے پوچھا۔

”اپنی کے بڑے بھائی کی۔ میرا بہت پیارا دوست تھا۔ دوست

بھی اور دشمن بھی۔ بات بات پر چمٹ جاتا۔ اسی طرح بات بات پر جھگڑ بھی پڑتا۔

شدید محبت کرتا تھا۔ پگلا کہیں کا۔ میں نے کتنی بار سمجھایا۔ یار عورت سے خود

عشق نہ کرو۔ دھیمی سی آہ اس کے دل میں لگا کر بس ہوا دیتے رہو۔ یہاں تک کہ

وہ دیوانگی کی حد تک تھیں چاہنے لگے۔ جب قدموں میں آگرے تو اٹھا کر سینے سے

لگا لو۔ تم خود اپنی آنکھیں اس کے تلوں پر ملتے رہو گے تو وہ تمہاری ہنستی اور

جاگتی ہوئی آنکھوں کو پاؤں تلے روند کر گزر جائے گی۔“

”کیا زیادہ پی لی ہے۔“ میں نے ٹوکا۔

”کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ لیکن تم سے زیادہ۔“ وہ پھر کہنے لگا۔

”لیکن اس نے میری بات کا ہمیشہ مذاق اڑایا۔ اس نے محبت میں بڑے

کڑے امتحان دیئے یار۔ لیکن اس کی محبوبہ اسے نہ سمجھ سکی۔ اور جب وہ سمجھ

میلی پرچھائیاں
 تھی — وہ انتظار نہ کر سکا۔ اس نے بغیر کسی سے کچھ کہے سنے، دنیا ہی چھوڑ دی —
 اس قدر اسمارٹ تھا وہ — بالکل اپنی کی طرح — میں اگر اس کی طرح حسیں ہوتا اور
 بیرونیا میں سب کچھ لٹ جاتا تو سبھی صفت اپنے ہی حسن کی خاطر میں کسی قیمت پر سبھی زندگی
 و نہ چھوڑتا — لیکن اس ظالم نے کھو و فام اپنی رگ میں انجکٹ کر لیا —
 پکلا کہیں کا —

اس نے بات ختم کر دی اور کہیں دور دور دیکھنے لگا۔
 موم بتیاں جل رہی تھیں — گچھل رہی تھیں — میں چاہتا تھا کچھ اور پی سکوں۔
 ”وتم اپنی کو میرا چھوڑ کر چل دینا تو پسند نہیں کرو گے — وہ تمھاری بھی
 اتنی ہی دوست ہے جتنی میری۔“

مجھے محسوس ہوا جیسے ہارڈنگ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ لیکن میں نے صرف
 ”ہوں“ کہنے پر اکتفا کیا۔

دوریوں سے اس نے نظریں ہٹالیں — مجھ سے آنکھیں چاکیں۔ لبوں پر
 وہی نرم نرم سی مسکراہٹ تھی۔ لیکن آنکھیں جیسے اس مسکراہٹ کو جھٹلا رہی تھیں۔
 اس نے کہا ”حلو ہیں جلیں — اور ہم دونوں بڑھ گئے۔“

ایک بڑھیا ایک قبر کے سر پرانے سنگ مرمر کی صلیب سے چٹبی ہوئی سسک رہی
 تھی۔ جبکہ سفید بال تھے جو کالی ربن سے کس لیے گئے تھے۔ آسنوؤں کو چہرے
 کی جھریوں سے گذر کر قبر کے پھولوں پر گرنے میں شاید دشواری ہو رہی تھی — مجھ
 جیسا معلوم ہوا جیسے یہ ایک ایسی موم تھی جس کا گھٹلا ہوا موم شعلے سے کچھ ہی نیچے
 تک جا کر سرد اور منجمد ہو جاتا ہے — گھٹلے ہوئے موم کی تہہ پر تہہ چڑھنے لگتی ہے

گریو یارڈ

اُجلی پر چھائیاں

اور موم تہی کو زیادہ دیر تک جلنے میں مدد دیتی ہے۔

پتہ نہیں یہ سرتا پاسفید بڑھیا کب تک جلتی اور گھلتی رہے گی۔ ویسے
قبر کے سہا نے جاگتی ہوئی اس زندگی میں اور قبے کے اندر سوئی ہوئی موت میں
قدم دو قدم ہی کا تو فاصلہ رہ گیا تھا۔

میں نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ صلیب کے نیچے لگے ہوئے کتبے نے میرا داس بکڑ لیا۔

IN LOVING MEMORY

MY DARLING OF DAUGHTER

AGE 18 YEARS

I MISS YOU IN THE MORNING .

I MISS YOU IN THE DAY .

I MISS YOU DAUGHTER DARLING .

IN A THOUSAND DIFFERENT WAY .

ALL THE WORLD SEEMS DARK WITHOUT THEE

MEMORY TURNS EACH THOUGHT TO PAIN

LOVE IS VACANT LIFE IS WEARY

TILL IN HEAVEN WE MEET AGAIN.

میراجی چاہا کہ پھونک مار کہ اس قبر کی ساری موم بتیاں بجھا دوں۔

آپنی کے پاس پہنچتے پہنچتے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں تھک گیا ہوں۔

غم کچھ اس طرح دبے پاؤں دل میں داخل ہو رہا تھا جس طرح جنازہ قبرستان
میں داخل ہو رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر پھر بڑھیا کو دیکھا۔ وہ مجھے نظر نہ آئی۔

کتنے ہی غمزدہ دل، کتنی ہی بھگی ہوئی آنکھیں رکتے ہی اداس چہرے۔

موم کی طرح قبروں کے اطراف جل رہے تھے۔

بڑھیا کہیں نہیں جاسکتی۔ میں نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ وہ قبر پر دوہری

ہو کر قریب قریب لیٹ چکی تھی جیسے اپنی اٹھارہ سالہ ٹیٹی کو سینے سے لگا رہی ہو۔

لیکن ننھے ننھے آگ کے شعلے جیسے دودلوں کے بیچ میں حائل تھے — میرا پھر جی چاہا کہ پھونک مار کر اس قبر کی ساری موم بتیاں بجھا دوں۔

انہی — ہارڈنگ اینی کو پکار رہا تھا — مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہارڈنگ کی آواز خود اس قبر سے آرہی تھی جس پر انہی جھکی ہوئی تھی اور اس کی بے پناہ خوبصورت آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے — گنگلے ہوئے موم کے قطروں کی طرح۔

انہی — میں نے ہارڈنگ کو اس قدر گر محوشی سے اینی کا ہاتھ دباتے ہوئے آج تک نہیں دیکھا — یہاں تک کہ کسی بار میں بھی نہیں — وہ تو انہی کو صرف دق کرنا جانتا تھا۔ اس کو چھیڑتا — اس کو ستاتا — بڑی بدتمیزی سے ہماری موجودگی میں اسے آنکھ مار دیتا — وہ اس کے رویے کی بروج سے شکایت کرتی — میرے آگے دگڑا روتی۔

کبھی کبھی تو وہ فٹے لٹا ستا تاکہ انہی کی آنکھیں ٹپل ہی پرچھلک جائیں — اس کے بعد اپنا جام ہاتھ میں لے کر فوری اٹھ کھڑا ہوتا — ایک ہی سانس میں ساری کی ساری شراب چڑھا لیتا اور سگریٹ کا لمبا کش لگا کر ایک ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں ڈالے بیٹھ جاتا۔ پھر ہم سب کو دُش "کر کے ہمارے روکتے کے روکتے کچھ نہ کچھ بہانا تراش کر نکل جاتا۔ اس طرح ہمارا موڈ اس کی وجہ سے تباہ ہو جاتا۔

انہی کے ساتھ اس کا برتاؤ مجھے بھی اچھا نہ لگتا — لیکن اس کو کسی کے احساسات کا جیسے کچھ خیال ہی نہ تھا۔

اس نے ایسے کسی واقعے کو "چونگیم" یا "بیل گم" چبانے سے زیادہ اہمیت نہ دی

اہلی پرچھائیاں
 اپنی اور بروج نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔ اپنی کی آنکھیں سرخ ہو کر اور زیادہ
 خوبصورت ہو گئی تھیں۔ بروج گرے رنگ کے فلی سوٹ میں بڑا اسمارٹ
 لگ رہا تھا۔

ہارڈنگ نے اپنی کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ کہنے لگا چلو اب چلیں یہاں سے
 — تم اس طرح اور روؤ گی تو میں تمہیں یہیں گدگدا دل گا۔ تم مجھ پر بگڑو گی تو یہ
 تمہارا بھائی جو چپ سا دمے قبر میں پڑا ہے نا۔ وہ جھپٹ کر تمہاری حمایت میں میری
 ٹائی پکڑ لے گا اور دم میں گتہ گتہ ہوا بیٹے گے۔ اس سے پہلے کہ ہم جھگڑیں چلے چلو یہاں سے
 مجھے ہارڈنگ کی باتیں کچھ اونٹ پٹانگ سی لگیں۔

لیکن وہ پھر کہیں دور دور دیکھ رہا تھا۔ اپنی بھی کچھ وہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید
 دونوں ہی پالم کو یاد کر رہے ہوں۔

بروج بڑے پیار سے اپنی کو تک رہا تھا۔ اپنی کی نظریں دور یوں سے
 واپس ہوئیں تو بروج کی نظریں جیسے ان کی منتظر تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے
 کو دیکھا اور اپنی نے اپنا ہاتھ بروج کے ہاتھ میں دے دیا۔
 ہارڈنگ اب بھی کہیں دور دور دیکھ رہا تھا۔
 میری نظریں قبعر کتبے پر جم کر رہ گئیں۔

IN LOVING MEMORY
 of

HEARTY BROTHER
 ROBERT PALMER

AGE 21 YEARS

BORN 1935

DIED 1956

ALL THAT YOU HAVE MEANT TO ME
WORDS CAN NEVER TELL
COMRADESHIP AND SYMPATHY
CHEERINESS AS WELL
EVERY DAY SHOWN DOUBLY BRIGHT
JUST BECAUSE YOU SHARED IT
EVERY TROUBLE WAS BORN LIGHT
WITH YOU TO HELP ME BEAR IT
LOVING THOUGHTS SHALL EVER LINGER
AROUND THE SPOT WHERE THOU ART LAID

”کب سے یہاں ہو چکے ہو؟“ ہارڈنگ نے بروج کو مخاطب کیا۔

”بہت دیر سے“ بروج نے جواب دیا۔

”و آئسو بہانے میں تم نے اپنی کوجھی مات کر دیا ہوگا۔“

”و کیوں“

”تم نرے بدھو جو ہو۔“

”و بروج زیر لب مسکرایا۔“

”لو کلا خشک ہو گیا ہوگا۔“ ہارڈنگ نے بیل گم اپنی اور بروج کی طرف

پڑھاتے ہوئے کہا۔

— اپنی نے انکار کر دیا۔

بروج نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ ہٹا لیا تو ہارڈنگ بے اختیار ہنس پڑا۔

”لے لو — لے سہی لو۔ اپنی خفا نہیں ہوگی۔ تم اپنی کے سب سے وفادار

اُجلی پرچھائیاں
دوست ہو۔۔۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ تمہاری وفاداری تمہاری بیوقوفی
پر پردہ ڈال دے گی۔۔۔

بروج نے بڑے پیار سے ہارڈنگ کا کال چھو تے ہوئے کہا۔۔۔ ”تم
پھر شرارت پراتر آئے ہو۔۔۔“

”شرارت تو میں اب کرنے والا ہوں۔۔۔ سوچ رہا ہوں کہ کیا شرارت کروں۔“
اپنی اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔

میں ہارڈنگ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ میرے پلے نہ پڑا۔
اس وقت میں قطعاً اس موڈ میں نہ تھا کہ اس کی شرارتوں کو پسند کرتا۔

میں پھر اپنے بائیں جانب کی ایک قبر کا کتبہ پڑھنے لگا جس پر ایک جوان
عورت اپنے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ بہت ادا اس بیٹی تھی۔ سب سے چھوٹا بچہ
پیرز کے پکیٹ میں سے پُدمینے کی ہنکیاں نکال کر جبار ہاتھا۔

ONLY THOSE WHO HAVE LOST CAN TELL
THE LOSS OF A LOVED ONE WITHOUT A FAREWELL
ONLY THOSE - - - - -

اور اس نے پیچھے سے میری آنکھیں موچ لیں۔۔۔ تم اپنا رخ بالکل میری
طرف کر دو اس وقت تک تمہاری آنکھیں روشنیوں سے محروم رہیں گی۔

میں پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ہارڈنگ نے اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے
میری آنکھوں کو آزاد کیا تو مجھے لمحے بھر تک جگمگاتی ہوئی قبریں کچھ ایک دوسرے
سے گڈمڈ ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اپنی کی سہیلی بہت احتیاط سے ریشمی دستی سے اپنی آنکھیں خشک کر رہی

اُجلی پر چھائیاں گریو یارڈ

تھی۔ اپنی کچھ اس طرح اس کو تسلی دے رہی تھی جیسے خود اپنے آپ کو دے رہی ہو۔
ہارڈنگ نے میرے شانے میں چٹکی بھر کر ایک کالی اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کی طرف اشارہ کیا جو بہت ہنس ہنس کر قریب ہی دوادھیڑ عمر کی عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔
دونوں عورتیں منہ کھولے بڑی حیرت اور استعجاب سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

بھری ہوئی چٹکی کی سوزش سے میں تلملا کر ابھی ٹھیک بھی نہ ہو پایا تھا کہ چبایا
ہوا بیل گم منہ سے نکال کر ہارڈنگ نے بڑی صفائی سے اس لڑکی پر دے مارا جو
اس کے کٹے ہوئے خوبصورت بالوں میں جا پھنسا۔ وہ بہت تیزی سے ہماری جانب
گھوم گئی۔ لیکن ہارڈنگ اس طرح انجان ہو گیا جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔
میں نے اس کو ٹوکا۔ ”تم کہیں بھی اپنی شرتوں سے نہیں چوکتے ہو۔“

”اب چلو بھی یہاں سے، مجھے شدید الجھن ہو رہی ہے۔“ میں نے پھر امر کیا۔
”کہاں چلو گے؟“

”فی الوقت تو اس احاطے سے باہر۔“ میں نے جواب دیا۔

اپنی کی نو جوان دوست اپنے ادھیڑ عمر کے شوہر کا ہاتھ تھامے۔ آگے بڑھ گئی تھی۔
اپنی اس قبر کو تک رہی تھی جس کے سر ہانے مر مر میں مریم کی مورقی سفید سفید
پھول گر رہی تھی۔

ہارڈنگ نے اس کا ہاتھ بڑے پیار سے اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔
”اگر تم آج میری بات مان لو تو میں تمہیں زندگی بھر تنگ نہیں کروں گا۔“
اپنی کا چہرہ جیسے شکستہ پھول کی طرح دم بھر کو کھل اٹھا تھا۔
اپنی کی آنکھوں میں جیسے جگنو جھٹک آئے تھے۔

گریو یارڈ

احلی پر چھائیاں

اپنی کی آنکھوں میں جو کچھ ہی دیر پہلے آنسوؤں سے سبکی ہوئی تھیں۔

اپنی کی آنکھوں میں جن میں رونے کے بعد سرخیاں گھل مل گئی تھیں۔

ہارڈنگ نے ان آنکھوں میں دیکھتے کے دیکھتے جگنو چھوڑ دیے۔

میں چپ چاپ اپنی کی آنکھوں کو نکھتا رہا۔

اپنی کی آنکھوں کو جو اس قدر حسین تھیں کہ ہارڈنگ کہتا تھا، موت ان آنکھوں

تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکتی۔

اپنی جیسے ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

پھر اس نے اپنا ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا اور سر جھکا کر سسکنے لگی۔

ہارڈنگ نے اپنی کو آگے بڑھ کر تھام لیا — وہ دونوں آگے لگے تھے —

میں اور بروج پیچھے چل رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے تابوت کے پیچھے چل رہے ہوں۔

موم بنیاں قبروں پر چل رہی تھیں — موم بنیاں قبروں کے اطراف انسانی

صورتوں میں چل پھر رہی تھیں۔

گیٹ پر پہنچتے پہنچتے میں نے پھر اس بڑھیا کو دیکھنے کی کوشش کی جو اپنی اٹھارہ

سالہ بیٹی سے باتیں کرنے کے لیے اس طرح آئی تھی جیسے زندگی موت سے نہیں

موت زندگی سے ملنے کے لیے چلی آئی ہو۔

لیکن میں اس بڑھیا کو نہیں دیکھ سکا۔

مجھے وہ عورت بھی دکھائی نہیں دی جو اپنے تینوں بچوں کے ساتھ اپنے

شوہر کی قبر کے پائنتی بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم گیٹ سے باہر آ گئے تو۔

بروج نے انہی سے پوچھا — کہاں چلو گی انہی۔

ہارڈنگ نے چھوٹے ہی کہا ”SHE IS AT MY DISPOSAL“

میں نے علانیہ اس کے لمبے کی تلخی کو محسوس کیا۔

بروج نے مسکرا کر اپنی باہیں ہارڈنگ کے گلے میں ڈال دیں۔

چلو میسز بل گم ”تم جہاں چاہو سب وہیں چلیں گے۔

میں اس طرح خاموش تھا جیسے ابھی گریویارڈ کے احاطے ہی میں ہوں۔

بروج نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھنجھوڑا۔

کہاں ہو تم ۹۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ہارڈنگ کہنے لگا — اپنی کو جو سب سے زیادہ ہنسائے گا اس کے حق میں

سب سے زیادہ شراب آئے گی۔

میں نے پیچ مسکرانے کی کوشش کی۔ دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ جیسے سارے کاسا

گریویارڈ میسرینے میں آچھپا ہو — بظاہر اس قدر اس ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی۔

مجھے کبھی انہی کے بھائی کا خیال آتا۔

کبھی اس بڑھیا کا، کبھی تین سچوں والی جوان عورت کا، کبھی کتوں پر کند

کیے ہوئے ان الفاظ کا جن کو میں بغور پڑھتا رہا تھا۔

ہم ”کو الٹی“ کے لیے روانہ ہو گئے۔

میں نے اسکوٹسٹارٹ کی تو بروج میری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اینی ہارڈنگ کے ساتھ اس کی موٹر سیکل پر تھی۔

ٹینک بند پر پہنچے پہنچے ہمارا موڈ کافی حد تک بدل چکا تھا۔

اینی مسکراتی مسکراتی اب بھی کہیں کھوسی جاتی لیکن ہارڈنگ دنیا بھر کی مسکراہٹیں آج جیسے اینی ہی کے لبوں پر دیکھنے کی ٹھان بیٹھا تھا۔

وہ پتہ نہیں اس سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ اینی آہستہ آہستہ مسکراہٹوں کے آگے جیسے سپردال رہی تھی۔

بروج نے مجھ سے کہا ”اینی سے اجازت لے لوں تو تمہیں آج ایک بہت اچھی سی بات بتاؤں۔“

”میں نے کہا لے لوں اجازت۔“ اور اسکو ٹرکی رفتار بڑھا کر اینی کے برابر لے آیا۔

بروج کہنے لگا ”ابھی نہیں“
میں ہارڈنگ سے مخاطب ہوا تو بروج نے پیچھے سے میسرمنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے پہلے اینی سے اجازت لینا ہے، اس وقت تک تمہارے صبر کو آزمانے دو۔“

اسکو ٹر ہارڈنگ کے برابر آگئی تو اس نے موٹر سیکل کی رفتار اس طرح تیز کی جیسے مجھے چیلنج کر رہا ہو۔

میں نے اس کو روکتے ہوئے کہا کہ میں کبھی بھی اس کے اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتا۔ میری زندگی کا ایک رخ یہ بھی تو ہے کہ میری بیوی ہے، بچے ہیں۔

گریو یارڈ

اُعلیٰ پر چھائیاں

اپنی نے ملکی سی چیخ کے ساتھ ہارڈنگ کو تیز چلانے سے روکا تو اس نے قہقہہ لگا کر اپنی ”سن ہم“ کو آہستہ کر لیا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ اپنی سے کہہ رہا تھا۔

”تمہیں کس بات کا ڈر ہے جب کہ تمہیں شوہر ہے نہ بچہ“۔

اپنی نے ٹرے انداز سے اپنی زلفیں سنوارتے ہوئے جواب دیا۔

”زندگی صرف اسی لیے ہی تو خوبصورت نہیں ہو جاتی۔۔۔ وہ بہر حال

قیمتی اور حسین ہے۔“

ہارڈنگ کہنے لگا۔ ”اتنا پیار ہے تمہیں زندگی سے۔“

۔۔۔ اور اس نے اپنی کو چھڑنے کے لیے رفتار بڑھا دی۔

یہ سلسلہ ٹینک بند کے پار ہونے تک جاری رہا۔۔۔ وہ ہنستا، رفتار تیز کر دیتا۔ اپنی اس سے چٹ جاتی تو وہ رفتار کچھ اور تیز کر دیتا۔ اپنی ڈرنے لگتی تو رفتار پھر دھیمی ہو جاتی۔

کو الٹی پیر کے تو اپنی نے اطمینان کا سانس لیا۔

کو الٹی اپنی نیم خوابیدہ اور نیم بیدار فضاؤں کے لیے مشہور ہے۔ وہاں سنبھل کر کچھ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے زندگی ایک ننھی مٹی سی خوشی ہے لیکن کہیں نہ کہیں کوئی غم گھات لگائے بیٹھا ہے۔

دھیمی دھیمی ریڈیو گرام کے لیے، مدھم مدھم روشنیاں، بوہل بوہل ماحول دے دے قہقہے، سرگوشیوں کے انداز میں باتیں، جیسے ہر ایک سو سو جتن سے کوئی چیز چھپا رہا ہو، ایسی چیز جو بہت زیادہ قیمتی ہو۔

اُجلی پر چھائیاں
 گریو یارڈ
 مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے لوگ بڑے چاؤ سے ساری دنیا کی آنکھوں
 سے بچا کر اپنی زندگی کے غم یہاں لے آتے ہیں اور ایک دوسرے کی نظر سے بچ کر
 بڑے جتن سے کونے کونے میں چھپاتے پھرتے ہیں۔ جب لوٹتے ہیں تو پتہ نہیں
 ساتھ لے جاتے ہیں یا یہیں بھول جاتے ہیں۔

کوالٹی میں داخل ہونے کے دو تین منٹ بعد ہی ہمیں ہمارا مخصوص ”کارنر“
 مل گیا جہاں بیٹھ کر ہم نے محسوس کیا جیسے ہم نے بھی یہاں کسی وقت اپنا کچھ رکھ چھوڑا تھا
 دیواروں میں لگے ہوئے گہرے نیلے جالی دار ادھر کھلے کنول روشنیاں اس طرح
 پھینک رہے تھے جیسے روشنیاں بھی بڑے جتن سے رکھنے کی کوئی قیمتی شے ہوں۔
 روشنیاں درود دیوار سے جیسے کچھ دور دور تھیں۔ کچھ قریب قریب تھیں۔
 سامنے دیوار پر بہت ہی حسین سے گول حلقے میں دوسرے ٹپکوں کو دوکانے
 اس طرح چھو رہے تھے جیسے چھوتے ہوئے ڈر رہے ہوں۔

”اب یہاں کیا پڑھ رہے ہو“ ہارڈنگ نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں“ میں نے حسین حلقے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ اٹھ
 بچ رہے ہیں۔

اپنی کے لیے شیریں اور سب کے لیے سولن کے ساتھ ہی ہارڈنگ نے برے
 کو ایک لمبی چوڑی لسٹ سنا دی۔ پرائس، فشن، ہیلم۔

میں نے ہیلم فہرست سے نکلوا دیا۔ ہیلم یہاں اتنا لذیذ تیار نہ ہوتا تھا جتنا
 چینیز میں۔

— اپنی نے میری تائید کی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم زندگی سے قریب تر ہوتے گئے۔
 کچھ ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے زندگی ہمیں کپڑا رہی ہے، ہمیں چوم رہی
 ہے، ہمیں سینے سے لگا رہی ہے۔
 اپنی خوش تھی — ہم سب خوش تھے — اس کی آنکھیں بے پناہ حسین
 ہو گئی تھیں۔

مجھے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اب بھی ڈر ہو رہا تھا۔
 کتنی وسعت ہے ان میں، کتنی گہرائی —
 کون ہو گا جو ان آنکھوں میں رہ بس کر ان کا مقدر ہو گیا ہو گا۔
 کون ہو گا وہ —

جانے کیوں بروج کا چہرہ اس سوال کا جواب بن کر میرے ذہن میں بار بار
 ابھر رہا تھا —

آہستہ آہستہ ہماری مسکراہٹیں دھیمے دھیمے تمہقوں تک پہنچ رہی تھیں۔
 ہارڈنگ پرانی یادوں کے خزانے سے کریڈ کریڈ کر ایسے جواہر ریزے نکال
 رہا تھا جن کے انمول ہونے کا اندازہ غالباً اپنی کو ہو سکتا تھا — لیکن میں بھی ان
 کے پرکھنے میں دلچسپی محسوس کرتا رہا۔

بروج کچھ اس عالم میں تھا جیسے وہ کو دنیا کی بہ نعت حاصل ہے۔
 بالکل مطمئن — اتنا مطمئن کہ اس قدر اطمینان سے آدمی چھوٹا معلوم ہونے

لگتا ہے۔

بھری ہوئی پلیٹوں سے ہارڈنگ نے پرنس اورش کے قتلے اس احتیاط سے

گر یو یار^ط

اٹلی پر چھائیاں

اپنی کی پلیٹ میں اتار دیئے، جیسے کوئی کسی کے دل میں چپکے سے جگہ بنا رہا ہو۔

اپنی نے ہارڈنگ کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔

”تم کتنا کھلا دینا چاہتے ہو مجھے۔“

”اتنا۔“ اس نے بڑے پیار سے اپنی کی ناک اپنی چٹکی میں لے کر مڑوری۔

اپنی کہنے لگی۔ ”بچپن میں تمہاری اس حرکت پر میں کس قدر خفا ہوتی تھی۔“

”تو کیا اب خوش ہوتی ہو۔“ ہارڈنگ نے غیر متوقع طور پر پوچھا۔

”کچھ ایسا خاص تو نہیں۔“

”پھر بھی ذرا سا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“

بروج نے اپنی کی باجھوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو جلانے کے لیے لائٹر جلایا۔

اپنی سگریٹ جلا چکی تو اس نے ایک لمبا کش لے کر بروج کو بغور دیکھا۔

پھر ایک اور کش لے کر کہنے لگی۔

”آج تم دونوں سے میں بڑی شرمندگی سے معافی چاہتی ہوں۔“

”کیوں میں نے پوچھا۔“

”میں نے اپنی شادی کی تم دونوں کو اطلاع نہیں دی۔“

”کیا معنی؟“ ہارڈنگ نے ہونٹوں سے لگا ہوا جام میز پر رکھ دیا۔

ایک ہفتہ ہوتا ہے میری شادی ہو کر۔۔۔ اپنی بڑے اطمینان سے یہ

بات کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

تو پھر میں تیسرے آدمی کو جن سے تم معافی نہیں مانگ رہی ہو مبارک باد

ہاں۔ اپنی نے بڑی نرمی سے کہا۔

میں نے بڑی گرجو شہی سے بروج سے ہاتھ تلایا۔ اس کے خوبصورت مستقبل کے لیے نیک تمنائیں پیش کیں۔

ہارڈنگ نے اٹھ کر بروج کو گلے سے لگالیا۔ اور پھر اپنی سیٹ سنبھالتے سنبھالتے اس نے اپنی کی ناک اپنی چٹکی میں لے کر مروڑ دی۔

شریر کہیں کی۔ مجھ سے چھپایا کیوں تم نے۔ ہارڈنگ نے بڑی محبت سے شکوہ کیا۔ اپنی نے ہارڈنگ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پھر ایک بار معافی مانگی۔ میں نے کہا ”چلو سستے چھوٹے۔ ورنہ کوئی اچھا سا تحفہ تو دینا ہی ہوتا۔“

”و تحفہ تو اب سخی دینا ہی ہو گا۔“ ہارڈنگ نے کہا۔

”کیوں دیں۔ اُلٹے جبر مانہ بھی تو لیا جاسکتا ہے۔“

ہارڈنگ لہک لہک کر باتیں کر رہا تھا۔ غم کی کوئی پرچھائیں دور دور تک اس کے چہرے پر نہ تھی۔

میرے دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بے نام سا غم ٹپکے سے دل میں بس رہا ہے۔

ہارڈنگ کہہ رہا تھا میں تمہیں بالکل نیا تحفہ دوں گا۔ ایسا تحفہ جو فخر میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ شریر کہیں کی۔ اس نے اپنی کی ناک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اپنی نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں چھپاتے ہوئے کہا۔

تم میسرے میری ناک ہی سلامت رہنے دو تو بس کافی ہے۔

بروج نے جا ہی لی تو ہارڈنگ نے اس کا گلاس بھر دیا۔

وہ خود بہت تیز تیزی رہا تھا۔ میں نے اس کو ٹوکا بھی۔

اس نے اپنی باہیں میسرے گلے میں ڈال کر کہا۔ — یار آج پی لینے

دے نا۔

یہ بات اس نے کچھ اس انداز سے کی تھی جیسے میرا دل پکڑ کر سارا خون پخوڑ

رہا ہو۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سب سے بے نیاز ہو کر کو الٹی کے خوابیدہ گوشوں

میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ — اپنے غم اور دل کے غم۔ جیسے وہ سب کو اپنا

لینا چاہتا ہو۔

میں نے کہا ”اب چلنا چاہیے۔ بہت ہو گئی ہے۔“

ہارڈنگ نے پوچھا۔ رات یارم۔

اینی نے کہا۔ — دونوں ہی۔

ہارڈنگ باہر نکلتے نکلتے لڑکھڑکیا تو بروج نے اس کو سنبھال لیا۔

ہارڈنگ نے اس کو بغور دیکھا۔ مسکرایا اور چپ چاپ آگے بڑھ کر اپنی

”سنہیم“ اسٹارٹ کر لی۔

اینی کہنے لگی۔ ”میں تمہارے ہی ساتھ چل رہی ہوں۔ آہستہ چلاؤ گے نا۔“

ہارڈنگ نے انی کی ناک مروڑی۔ پھر کال تھپتھا کر کہنے لگا ”تم میرے ساتھ آ سکتی ہو انی“

تو میں ساری زندگی ہی کو آہستہ آہستہ چلا تا رہتا۔ بالکل اس گٹاری کی طرح جس کے

گریو بارڈ

اجلی پرچھائیاں

پہیوں میں پھول بندھے ہوں۔ لیکن اپنی میں تمہیں راستے میں پھر ایک بار
ملوں گا۔ تمہارے لیے تحفہ لے کر۔ تمہارا منتظر۔ اور پھر تم اس قدر آسانی
سے مجھے راستے پر چھوڑ کر آگے نہیں جاسکو گی۔ فی الوقت تو بروج میرے ساتھ ہے
مجھے اس کی زندگی بھی پیاری ہے اور خود اپنی بھی۔

اس نے بالکل غیر متوقع طور پر اپنی موٹر سیکل بڑھالی۔ پلٹ کر ہم لوگوں
پر ایک نگاہ ڈالی۔ ہاتھ ہلایا اور دیکھتے کے دیکھتے اس قدر تیزی سے طوفان کی طرح
روانہ ہوا کہ مجھے وحشت ہونے لگی۔

میرے ذہن میں کوئی خیال بجلی کی رو کی طرح آیا۔

میں نے فوری اپنی اسکوٹر سنبھال لی۔

اپنی بڑی خوف زدہ سی نظر آرہی تھی۔

میں نے کہا۔ یہ بہت بُرا ہوا اپنی۔ میں کچھ اور کہہ نہ سکا۔

اپنی میری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔

میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ تم چلو ان کے پیچھے۔

وہ بہت فاصلے پر ہواؤں سے باتیں کر رہے تھے۔ ہم ٹینک بینڈ پر

پہنچ چکے تھے۔ میں نے اپنی اسکوٹر اس قدر تیز کر دی تھی کہ مزید رفت ر بڑھانے
پر عارثہ یقینی تھا۔

اپنی بے تحاشہ پکار رہی تھی۔ ہارڈنگ، ہارڈنگ۔

ہارڈنگ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ ہارڈنگ آندھیوں کا مذاق اڑا رہا

تھا۔ ہارڈنگ زندگی سے بھاگ رہا تھا۔ ہارڈنگ موت کا پیچھا کر رہا تھا۔

اپنی چنج رہی تھی، میں چنج رہا تھا۔

رک جاؤ ہارڈنگ، خدا کے لیے رک جاؤ۔

اپنی میری پشت پر اپنا چہرہ رکھ کر سسکنے لگی۔ جیسے وہ غنودگی کے عالم

میں ہاتھ بڑھا کر کسی کو پکڑ رہی تھی۔ رک جاؤ، رک جاؤ۔ بروج ٹھہرو!

مجھے بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے بالکل صاف سنائی دے رہا تھا۔

ہارڈنگ ڈبل ڈک کے بالکل مقابل تھا۔ ڈبل ڈک کا ہارن

سلسل بچ رہا تھا۔

پھر میں نے ایک آواز سنی۔ میری آنکھوں میں روشنیاں بھجنے لگیں۔

مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی ختم ہو چکے ہیں۔ مجھ میں اپنی آنکھوں

سے وہ منظر دیکھنے کی تاب نہ تھی۔

انجی میکر پاس نہیں تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ اس کو ہاسٹل پہنچا دیا گیا ہے۔

وہ بالکل بے ہوش تھی۔

میں بے حس و حرکت چپ چاپ کھڑا رہا۔ کوئی پولیس انسپکٹر مجھے تسلی دے رہا

تھا۔ مجھے پھر چکر سا محسوس ہوا۔ اسکوٹر کا سہارا لے کر میں وہیں بیٹھ گیا۔ آنکھوں

پر جیسے کوئی چپکے سے ہاتھ رکھ رہا تھا۔ پھر کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔

دوسرے دن شام ہوتے ہوتے ہارڈنگ اور بروج کو ایک دوسرے کے برابر

دفن دیا گیا تھا۔ اپنی غالباً اب تک ہاسٹل ہی میں تھی۔ میرا ذہن بالکل ماؤنٹ

ہو کر رہ گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ خوب خوب ہنسوں، پھر چلا چلا کر رو پڑوں۔

اُجلی پرچھائیاں
 اتنا روؤں کہ ہارڈنگ اپنی سن ہم کا رخ میری طرف پھیر لے۔ میرا ذہن جاگتا تو
 آنکھیں صرف سی دگھتیں کہ ہارڈنگ ہواؤں میں موت کا چچا کر رہا ہے۔ بروج اس
 کو روک رہا۔ چلا رہا ہے۔
 مجھے بروج اور اپنی کی چنیں صاف سنائی دیتیں۔

گریویارڈ سے نکل کر میں سیدھے بارہنچا۔ لیکن گریویارڈ میرے ساتھ ساتھ ٹکڑے
 پر چل رہا تھا۔ وہ ہر موڑ پر میرا چچا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بار میں بھی میرے
 ساتھ تھا۔

مجھے کبھی ہارڈنگ زیادہ یاد آتا، کبھی بروج کبھی میرے ذہن نے ہارڈنگ کے
 خلاف بھی سوچا۔ کبھی میں نے بڑی مشکل سے آنسو روکے جن میں سے شاید دو ایک تو
 شراب میں مل گئے ہوں۔

میں اسی طرح دیر تک پتیارہا۔ پھر یکایک اٹھا۔ پتہ نہیں کون مجھے
 گریویارڈ لے جا رہا تھا۔ گیٹ میں داخل ہوا تو کسی کی سسکیاں صاف سنائی دے
 رہی تھیں۔

اپنی ہی ہو سکتی ہے۔ اپنی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔
 میں قریب پہنچا تو اپنی نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

وہ بالکل گھائل ہرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ مٹی میں اٹا
 ہوا تھا جو آنسوؤں سے نم ہو کر اس کے گالوں، پیشانی اور ناک پر لگ گئی تھی۔
 میں نے دھیکر سے کہا۔ ”اپنی تم غلط سمجھ رہی ہو۔۔۔ یہ

بروج کی نہیں ہارڈنگ کی قبر ہے۔“
 اپنی نے مجھے ٹپ کر دیکھا اور پھر اسی قبر سے چمٹ کر سمکنے لگی۔



فرانڈ فنس کی پلیٹ سے اس نے آخری قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا، پھر قتلہ سے آخری کا ٹکڑا نکال کر فنس پر چھینک دیا۔

زبیدہ نے تنک کر کہا ”دوسروں کی راہ میں کانٹے بچانے سے اپنے تلوے محفوظ نہیں ہو جاتے۔“ شیکھر نے بات سنی ان سنی کر دی اور زبیدہ سے مخاطب ہو کر بغیر دم کا آخری قطرہ نکلا اس سے حلق میں اندیل لیا۔ زبیدہ نے اصرار کیا ”بات سن چکے ہو تو چاہے کانوں میں انگلیاں رکھ لو چاہے اس طرح پوز کرو کہ کچھ سنا ہی نہیں۔ فرق کچھ نہیں پڑتا۔ بات جو پلیٹ کی طرح دل میں کعب گئی ہے اپنی جگہ اہم ہے۔ گھاؤ کر کے ہی رہے گی۔“

شیکھر نے اب کی بار بھی کچھ نہیں کہا۔ اس کی نشیلی آنکھوں نے صرف ڈاکٹر کو دیکھنے ہی پر اکتفا کیا لیکن ڈاکٹر چوں کہ چھپتی نکا ہوں سے اپنی بیوی زبیدہ کو منفردے بازی سے باز رکھنے کے لیے کہہ رہا تھا اس لیے اس نے شیکھر کی آنکھوں کی زبان نہیں سمجھی جس میں ڈاکٹر کے لیے رحم بھی تھا ہمدردی بھی۔

اُجلی پر چھائیاں

ہیں کو اکسب کچھ۔۔

ابو البشر نے کاگ اڑایا تو ڈاکٹر نے اپنا گلاس بٹر جاتے ہوئے کہا کہ ایک آخری گھونٹ شیکھر کے اس شکار کی خوشی میں جس کے سینے کو چھیدنے کے لیے اس کی بندوں کی نالی میں پہلی بلیٹ بے چین ہے۔ ابو البشر نے ڈاکٹر کے گلاس پر دم کے تازہ کھلے ہوئے شیشے کو جھکایا تو زبیدہ برہم ہو گئی۔ اس نے غصے میں شیشے کے منہ کو اپنی نازک انگلیوں سے ڈاکٹر کے گلاس میں جھکادیا۔ ابو البشر کے شیشہ ہٹانے تک ڈاکٹر کے حصے میں کافی شراب اچھلی تھی۔ اس نے ہسی ہوئی نظروں سے زبیدہ کو دیکھا لیکن بیزید کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہٹاتے اس کی نظروں کی ہر اسانی پیار سے بدل گئی۔ بیزید نے بھی جواباً مسکرا کر اس کو پیار سے پچکارا۔ بس بھی کڑو دار لنگ بس ہو چکا شکار اس طرح تو۔۔ ابو البشر نے کہا آج کچھ نہ کچھ تو مار کر ہی رہے گا شیکھر۔ نہ نہ ہسی ناری ہی ہسی۔ ابو البشر سب میں زیادہ پیے ہوئے تھا۔ جملہ ادا ہوتے ہوتے جیسے الفاظ خود نشے سے بوجھل ہو کر لڑکھڑا رہے تھے۔

شیکھر نے کہا، میری بندوق میں کوئی بلیٹ کسی ناری کے لیے نہیں ہے میری بندوق کو آج تک یہ تو بچن گوارہ نہ ہوئی۔ جانے کتنے کالے آج ہرنیوں کے غول سے کم ہو جائیں گے۔ جانے کتنی ہرنیاں اپنے پیاروں کے لیے جنگل جنگل تڑپتی پھریں گی۔ ہرنیوں کو اس طرح تڑپانے سے نروں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میری بلیٹ اسی سینے کو چھیدتی ہے جس سینے میں اتنے جانے سے ہرنیوں کے کچھ دہل اٹھتے ہیں۔ زبیدہ نے جھٹ سے لن ترافی شروع کی۔ ہرنیوں پر گولی چلا نا کوئی بہادری نہیں ہے۔ ان کو اس طرح تڑپا کر بھی تو تم ایک خوشی کا خون کرتے ہو۔ ایک امید کا خون کرتے ہو، ایک اُجالے کا خون کرتے ہو۔ تم کسی ”کالے“ کی آنکھوں کو بے نور

اُجلی پرچھائیاں
 کر کے سمجھتے ہو کہ بے شمار ہرنیوں کی آنکھوں کا نور نہیں چھینا ہے اور اس خود ساختہ
 اصول پر اترتے ہو۔ میں کہتی ہوں چُن چُن کر ایک ایک ہرنی کو مار دو۔ جب تم اپنے فنی
 کھیل سے اکتا جاؤ تو آخری گولی کالے کے سینے میں اتار دو اور اپنی نشانہ بازی پر ناز
 کرتے پھرو۔ کیا کبھی تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ جنگل میں چو کڑی بھرتی ہوئی
 یہ خوبصورت ہرنیاں بالکل ہندوستانی عورت کی طرح بے زبان ہیں۔ تم کالے کو مار کر
 ہو تو میں سوچتی ہوں جیسے تم نے کسی عورت کا سہاگ چھین لیا۔ میں دل مسوس کر رہ
 جاتی ہوں۔ کاش تم مسکرانے کی بجائے اس وقت شرم محسوس کر سکتے۔

شیکھر نے بالکل غیر متوقع طور پر اپنی بندوق اٹھائی اور ہوا میں فیر کر دیا لمحے
 بھر کے لیے سب سہم گئے اور اس نے اپنا خالی گلاس میز سے اٹھا کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا
 دیا اور اطمینان سے مسکرانے لگا۔ ڈاکٹر نے شراب گلاس میں اٹی پلے ہوئے نہایت
 لجاجت سے کہا ”شیکھر جی تم زبیدہ کی باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ وہ بُری جذبہ باقی ہے
 اور ہمیشہ تم سے بات یہاں تک الجھتی ہے۔ میں اس کو بہتر سمجھاتا ہوں کہ اس نے
 تمہیں غلط سمجھا ہے لیکن وہ تم سے انصاف نہیں کر پاتی۔“ دیکھو کس طرح
 سہمی ہوئی ہے!

شیکھر نے بات کاٹ دی۔ شراب میں سوڈا ملا کر تھرموس سے برون
 نکالتے ہوئے اس نے ڈاکٹر سے کہا کہ تم اپنی مسنر کو ذرا اچھی طرح سمجھا دو ورنہ کیا عجیب
 ہے یہ گولی تمہارے سینے میں اتر جائے۔ اس لیے کہ میرے ایمان میں ہرنیوں کو مارنا
 حرام ہے ہی۔ دونوں نے قہقہہ لگایا۔ ابوالبشر نے زبیدہ کو کُن انکھیلوں سے
 دیکھا تو وہ شیکھر کو کُن انکھیلوں سے دیکھ رہی تھی۔

اجلی پر چھائیاں
ڈاکٹر نے شیکھر کی گود سے بندوق لیتے ہوئے کہا کہ پیارے تمہیں قسم ہے تمہاری
بندوق اور تمہاری جیب کا رکی، ظلم کبھی نہ کرنا تمہاری اس حرکت سے مجھے تو
شہادت کا درجہ مل جائے گا، اور شہیدوں کی جگہ صرف جنت میں ہے اور جنت مجھے
کسی قیمت پر بھی گوارہ نہیں ہے۔ میں دوزخ کا شیرانی ہوں مجھ سے دوزخ چھین
لو گے تو جنت میں میری روح دوزخ کے لیے تڑپتی رہے گی۔

زبیدہ نے منہ بنا کر کہا کہ تمہیں تو ہمیشہ مذاق ہی سو جھٹاپے ڈاکٹر۔
ڈاکٹر نے بڑی محبت سے زبیدہ کو دیکھا اور کہنے لگا کہ سچ کہتا ہوں ربی
جسٹایہ ابوالبشر صاحب کی جنت کوئی رہنے کی جگہ ہے۔

سنوین نے کل رات کو ایک خواب دیکھا۔ شیکھر ہی کے ساتھ شکار کی تلاش
کرتے رات کے گھٹا ٹوپ اندھروں میں ہم بھٹکتے رہے شیکھر کی جیب کا رکا بھی روشنیوں
نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ نہ جیب کا ر کے بیڈ لمپس کام دے رہے تھے نہ سرج لائٹ میں
اُجالے کی ایک کرن ہی تھی اور اندھیرا تھا کہ بڑھ کر ہر چیز کو گل رہا تھا۔ ایسا اندھیرا جو میں
نے کبھی نہیں دیکھا۔ شیکھر جو میسر برابر بیٹھا تھا گھور گھور کر دیکھنے پر بھی نظر نہیں
آ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم کسی ایسی دنیا میں ہیں جو ہماری دنیا سے کچھ
مختلف ہے۔ میں نے حنج کر شیکھر کو پکارا۔ آواز جیسے میسر حلق میں اٹک رہی تھی۔
بدقت تمام میں اسے پکار سکا۔ لیکن شیکھر نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اسیرنگ پر شیکھر نہیں
تھا۔ پھر یہ جیب کس طرح چل رہی ہے؟ میسر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے
ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ اُجالے میں چمک رہا تھا۔ میری عقل ماؤف تھی۔ ہاتھ کو جگہ کی
ہوئی روشنی سے مشکل ایک انچ ہٹ کر بی پناہ تاریکی تھی میں نے ہاتھ ہٹالیا۔ روشنی

اُجلی پر چھائیاں
ہیں کو اکب کچھ...

وہ دائرہ جو میسرہ ہاتھ کو محیط کیے ہوئے تھا۔ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اب
میں سترہ قدم کانپ رہا تھا۔ جیب بالکل اس طرح چل رہی تھی جیسے اب الٹ جائے گی
میں نے محسوس کیا کہ جیب کوئی اور چلا رہا ہے جو اندری ہے۔ شیکھر تو کبھی نہیں ہو سکتا۔
پھینچنے والی کی پوری قوت سے میں نے پھر پکارا شیکھر تم کہاں ہو؟ چار الفاظ کے اس چھوٹے
سے جملے کو ادا کرنے میں میری ساری چرب زبانی جیسے گنگا ہو گئی تھی ایک مہیب سی
چیخ ساری فضا کو جھنجھوڑ کر میرے کان کے پردوں کو چھیدتی ہوئی میرے دل و دماغ پر
بجلی بن کر گری۔ میں نے مارے خوف کے آنکھیں میچ لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے
صاف دکھائی دینے لگا۔ کاش یہ سب کچھ مجھے دکھائی نہ دیتا۔ دوڑتی ہوئی جیب کار
کے سامنے شیکھر بھاگ رہا تھا۔ اس کا جسم کالے کا تھا۔ اس کے پیٹ میں دایں
بائیں دو تیرہ پیوست تھے اور خون رس رہا تھا۔ اس نے اپنی بندوق دانتوں میں پکڑ
رکھی تھی۔ جیب کا ریتھی تھی اور وہ آگے تھا۔ لیکن اس کا چہرہ مجھے صاف دکھائی دے رہا
تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں تو ہم ایک بہت بڑے آہنی دروازے میں داخل ہوئے
تھے۔ جیب کے چاروں پیٹھے پکڑ ہو چکے تھے۔ آہنی دروازے سے اس قدر لوکل
رہی تھی کہ میں دین پانی بن کر اور پھر بھاپ میں تبدیل ہو کر کہیں اڑ جانا اگر جیب
آہنی دروازوں کے درمیان ٹھہر جاتی۔ ہم جب دروازے کو پیچھے چھوڑ کر آگے
بڑھے تو ایک لق و دوق صحرادر در در تک نظروں کو محیط کیے ہوئے تھا۔ ایک
عجب فضا تھی جو سناٹوں، کیسیوں اور ادھیوں سے مل جل کر جنم لیتی ہے اور
جسے صرف دل محسوس کر سکتا ہے اور یہ احساسات آنسو بھی نہیں بن سکتے جیب
رک گئی۔ گرمی بے پناہ تھی۔ شیکھر سہا ہوا میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ میری نظریا ایک

اُجلی پر چھائیاں
 ہن کو اکب کچھ....
 شیکھر پر پڑی تو میں نے جیپ سے چھلانگ لگا کر اس کو چٹالیا۔ ہاتھ پھیر چھیر کر
 اس کے بدن کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر برابر تھی۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ شیکھر تم
 دو کالے کس طرح بن گئے تھے۔ یہ ہم کہاں آگئے ہیں لیکن میرا گلہ رندھا ہوا تھا۔ میں
 چاہتا تھا کہ شیکھر سے لپٹ کر خوب خوب رولوں سودہ بھی ممکن نہ تھا اس لیے کروٹوں
 کے لیے آنسو ہی نہ تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ جب آنکھیں بہت جلنے لگیں تو
 شیکھر چیخ مار کر مجھ سے جدا ہو گیا۔ ڈاکٹر تمھاری آنکھیں کہاں ہیں؟ آنکھوں کی جگہ
 دو دھکے ہوئے انگارے ہیں ڈاکٹر۔ اور ان انگاروں سے میرے کالے جل گئے
 ہیں۔ مجھے کچھ سچی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیکھر کے کالوں پر واقعی دو انگارے
 دھک رہے تھے اور بس۔ کچھ عجیب سی غنودگی ہم پر طاری رہی۔ پھر یہ غنودگی
 مکمل بے ہوشی سے بدل گئی۔ اور جب مجھے ہوش آیا ہے تو دوڑ تک دھندھی دھند
 پھیلی ہوئی تھی۔ انتہائی گرمی بھی اور کبر بھی۔ اب یہ احساس ہی مٹ چکا تھا کہ
 یہاں کی ہر چیز اپنے فواس سے عاری کیوں ہے دن رہے گا تو اجالا نہیں رہے گا۔
 روشنی رہے گی تو اندھیروں کا غلاف اوڑھے ہوئے رہے گی۔ تارے نظر آئیں گے
 تو ٹھنک کا نہیں حدت کا احساس ہوگا۔ میں کچھ اسی قسم کی باتیں ابھی سوچ ہی
 رہا تھا کہ میرے پاس ہی ایک قہقہہ بلند ہوا۔ حالانکہ قہقہے کی آواز کچھ مانوس سی تھی۔
 لیکن میں غیر شعوری طور پر اس قہقہے سے بھی سہم گیا کیوں کہ کسی قبرستان کی فضا
 میں قہقہہ کیا معنی رکھتا ہے، اور پھر وہ شخصیت کون ہوگی جو اس فضا میں بھی قہقہہ
 لگا سکتی ہے۔ وہ آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن میری حیرت کی انتہاء رہی جب میں
 نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے سوکھے درخت کے نیچے جس کی بے برگ و بار شاخ

اُجلی پر چھائیائیں
 ٹہنیوں پر قطار اندر قطار آلو میٹھے ہیں، دو آدمی ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہے
 ہیں لیکن بات کرتے ہوئے جب وہ ہنستے ہیں تو ان کا چہرہ مسورتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہماری
 طرف ان میں سے ایک نے دیکھا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر اتنا کہا کہ بے چارے
 نو وارد ہیں۔ جہنم کی ہوا ابھی انھیں لگی نہیں۔ دو ایک روز میں پر پرزے
 لگالیں گے۔ میں اور شکیر غور سے ان کی باتیں سن ہی رہے تھے کہ منہ میں پائپ لگا
 ہوئے ایک شخص گرم سوٹ پہنے ہوئے ادھر آ نکلا۔ سوکھے پیر سے پیٹھ لگائے ہوئے
 جو شخص کھڑا تھا وہ فوراً آگے بڑھا اور سوٹ پہنے ہوئے صاحب بہادر کے قریب پہنچ
 کر انھیں بغور دیکھنے لگا پھر فوراً بڑھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نہایت
 مسرت سے پوچھنے لگا کہ حضور آپ ادھر کدھر آ گئے۔ سوٹ پہنے ہوئے حضور نے پائپ کا
 لمبا سا کش لے کر بڑے شانِ استغناء سے کہا کہ بھی تم نے ہاسٹل کی بلڈنگ والے
 معاملے میں جو مجھے پانچ فی صد دلایا تھا اب اس اسی ایک قصور کا خمیازہ بھگت رہا ہو۔
 منتھاری عنایات شامل حال نہ ہوتیں تو میں تم سے یہاں کسی طرح نہ ملتا۔ وارڈ نمبر
 (۳) کی چھت بیٹھ جانے سے جتنے مریض دوا خانے میں مرے تھے سالے سمجھوں نے میرے
 خلاف گواہی دی۔ میں کہتا نہیں تھا کہ یہ (۳) کا ہندسہ ہی بُرا ہوتا ہے۔ میں نے
 بہتر سمجھا یا کہ میٹرل جو سپلائی کیا گیا تھا وہ خود بہت ناقص تھا لیکن یہاں مالکان جزا و
 سزا بالکل جاہل قسم کے لوگ ہیں۔ پہلے تو ان کی مخلوق ہی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ہیں
 کیا۔ وہ نظر ہی نہیں آتے، صفر الٹی سیدھی آوازیں نکالتے ہیں۔ جواب دیتا ہوں تو
 جواب اب جواب نہیں ملتا۔ جواب کیا دیں گے بے چارے۔ انجینری کا فن ہے کوئی مذاق
 نہیں۔ یہ لوگ فن سے بالکل نا بلد ہیں۔ مجھے دکھ ہے تو اسی بات کہ کن جو بہرہ نشناس

اجلی پرچھائیاں

ہیں کو اکب کچھ دار
لوگوں سے سابقہ پڑ گیا ہے۔ رشوت و شہوت تو چلتی ہی تھی لیکن تم ہی بتاؤ گئے
صاحب کیا میں ملک کے چوٹی کے فنکاروں میں نہیں تھا۔ لیکن یہ اہل دوزخ فن کی
قدر ہی نہیں کرتے۔ میری خدمات انھیں حاصل ہوں تو قسم ہے اس دوزخ ہی کو
جنت بنا کر نہ رکھ دوں تو نام نثار اللہ ولد وفالہ نہیں لیکن انجینئر صاحب کی زبان
سے اپنے اور اپنے والد محترم کے نام کی ادائیگی اس طرح ہو کر رہ گئی ”شال ولد وفالہ“
گئے دار نے بہت ادب سے پوچھا کہ سرکار کیا کسی مصلحت سے نام اور ولدیت میں
تھوڑی سی تبدیلی کر لی ہے ؟ انجینئر نے مالکانہ انداز میں کہا کہ گئے دار صاحب دوزخ
کی اس ناپاک فضا میں باری تعالیٰ کا نام ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص ادا
کرنے کی کوشش کرے تو اس پر ناری دے دے برساے جاتے ہیں۔ تمہاری بیٹی شاید
آگ کے ان ہتھروں کی شڑاپ شڑاپ سے واقف نہیں ہے۔ ہم دنیا میں سنتے تھے
کہ۔ خو۔ (وہ پورا لفظ ادا نہ کر سکا) کی لالٹھی بے آواز ہوتی ہے لیکن یہاں معلوم ہوا
کہ ہماری بیٹی پر جو دے برستے ہیں اور جس کی تکلیف سے ہم پسینہ پسینہ ہو جاتے
ہیں دنیا والوں نے اسی کا نام برق و باراں رکھا ہے۔ آس پاس دیکھ کر
گئے دار نے آہستہ سے انجینئر سے پوچھا۔ سرکار تمباکو نوشی منغ ہے، پھر آپ یہ پائپ
کس طرح۔۔۔ انجینئر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہش کہا۔ گویا یہ گئے دار کو
خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو اس نے سرگوشی کے انداز
میں آہستہ سے کہا۔ دیکھو فشرتوں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ اور فرشتوں کے
مراتب کا لحاظ کرنا چاہیے۔ جتنا عظیم المرتبت فشر ہوگا اتنا ہی وہ دوسرے فرشتوں
کی نسبت زیادہ دیکھ سکے گا، زیادہ سن سکے گا، اسی لیے احتیاط لازم ہے۔ رہ گیا

اجلی پرچھائیاں
ہیں کو اک کچھ...

میں پائپ کس طرح پیتا ہوں تو سنو، میری نگرانی کے لیے جو فرشتہ مجھ پر تعین ہے اس کو پائپ بہت پسند آگیا ہے۔ طے یہ پایا ہے کہ ایک دن وہ پائپ پیے گا اور میں اس کی حفاظت کروں گا۔ ایک دن میں پیوں گا اور وہ میری رکھوالی کرے گا۔ آج میری باری ہے۔ اتنے میں گتے دار نے سنا ایک بہت ہی سیریلی گھنٹی کی صدا آئی اور جھٹ سے انجنیر نے پائپ اپنے تیلون کے اندر اس جیب میں رکھ لی جس میں وہ رشوت کی رقم اڑس لیا کرتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ سن کر اور دیکھ کر گتے دار بہت مسرور نظر آ رہا تھا۔

اب تو بات بالکل صاف تھی۔ میں نے اور سیکر نے محسوس کر لیا کہ ہم اپنے کرموں کو بھوک رہے ہیں۔ دنیا ہم سے چھوٹ گئی ہے اور یہ مقام جہاں ہم ہیں وہی مشہور معروف دوزخ ہے جس کے تصور ہی سے ہم کانپ جاتے تھے۔

ڈاکٹر کی زبان ہمیشہ کی طرح فیخی کی مانند چل رہی تھی۔ کبھی مسکراہٹوں کبھی قہقہوں کے درمیان وہ مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔ جب وہ سگریٹ جلانے کے لیے رکا تو ابوالبشر نے کہا کہ ڈاکٹر لگے ہاتھوں پورا خواب ہی بیان کر دو۔ سوائے زبیدہ ہیں کے یہاں کون ہے جو جنت میں جائے گا۔ دوزخ سے اب مجھے بھی کچھ دلچسپی ہونے لگی ہے۔ اس لیے کہ ایک نہ ایک دن مجھے بھی وہیں جانا ہے۔

ڈاکٹر نے بہت محبت سے زبیدہ کو دیکھا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا کہ میں اپنی زبانی کو کسی قیمت پر سچی جنت میں نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میرے بغیر سکھ سے کہاں رہ سکے گی۔ اس کے لیے ہر سائنس دوزخ ہی میں فراہم ہو جائے گی۔

زبیدہ نے جھرجھری سی لی ٹھنٹی اس قسم کا مذاق تمھیں لوگوں کو مبارک ہو۔
مجھے کیوں اپنے ساتھ گناہ میں گھسیٹتے ہو۔“

اُٹلی پر چھائیاں
ڈاکٹر میسرگوا ہوا۔ ”سچ مانو زنی، یہ انجیز اور گتے دار مجھے یقین ہے وہ سب
کچھ کر کے رہیں گے جو انھوں نے مجھ خواب میں کر دکھایا ہے۔“
شیکھر نے مداخلت کی۔ ”خیر آگے چلو بناؤ کہ پھر کیا ہوا۔“

کیا ہوا تھا۔ بات صاف تھی۔ دوسری گھنٹی پہلی گھنٹی سے زیادہ سُریلی تھی۔
جھٹ سے صاحب نے پائپ نکالا اور منہ میں رکھ لیا۔ دھویں کے ننھے ننھے مرغولے اپنی
خوشبو سے گتے دار کو مسحور کرنے لگے۔ گتے دار نے نہایت لجاجت سے کہا۔ سرکار، ایک دم
مجھے بھی عنایت ہو تاکہ اس دم کے سہارے میں اپنی پچھلی زندگی کو کچھ دیر کے لیے یاد کر سکوں۔
صاحب نے پہلے تو کچھ پس پیش کیا پھر مسکرا کر پائپ بڑھا دیا۔ گتے دار نے پائپ کو منہ لگا کر
جھوٹا کیے بغیر اپنے ہاتھ کی دھنکنی بنائی اور بکاش مارا۔ آگ برف میں تبدیل ہو گئی تھی۔
صاحب مسکرایا۔ کہنے لگا میں جانتا تھا کہ تم پائپ کا لطف نہیں اٹھا سکتے اس لیے کہ تم
اجازت یافتہ نہیں ہو۔ گتے دار نے پائپ کو جھار کر پھر کوشش کرنی چاہی۔ پائپ
کو جھارنے سے برف کا ایک ٹکڑا نیچے گرا اور بے چارہ شیکھر جس کی زبان اور حلق
پیاس سے سوکھ رہے تھے دو ہی جھست میں برف کے ٹکڑے پر چھپنا۔ لیکن اس کے
منہ میں پہنچتے پہنچتے برف کا ٹکڑا پھر دکھتا ہوا انکارہ بن چکا تھا۔ ایک چمچ مار کر شیکھر نے دیکھا
ہوا انکارہ تنھوک دیا۔ گتے دار اور میں سہم گئے تھے۔ لیکن صاحب پائپ
منہ میں رکھے اطمینان سے دھواں اُڑا رہا تھا۔

پائپ منہ سے نکال کر صاحب ہم سے مخاطب ہوا۔ ”کب آئے ہو؟“
”آج ہی بلکہ ابھی ابھی، کچھ ہی دیر پہلے جناب۔“
”کیا کرتے تھے۔“

ہیں کو اک بچہ...

اصلی پرچھائیاں
”ڈاکٹر تھخا“

”اور یہ جو تمہارے ساتھی ہیں“

”لینڈ لارڈ تھے۔ شکار کرتے تھے“

صاحب نے پاپ منہ میں رکھ کر حقارت سے دیکھا۔ کوئی بھی ہمارے کام کا نہیں۔ دونوں ہی قریب قریب ہم پیشہ بکھے۔ ایک جان بچانے میں مہارت رکھتا تھا اور ایک جان لینے میں ماہر تھا۔ یہاں ایسے کسی پیشہ ور کی ضرورت ہی نہیں اس لیے کموت کا ادھر گنہ رہی نہیں ہے۔ یہاں نہ کوئی کسی کی جان لے سکتا ہے اور نہ بچا سکتا ہے۔ شیکھر نے اپنی بندوق چھپا لینے کی کوشش کی۔

صاحب نے بندوق پراچھتی ہوئی نظر ڈالی اور ہم سے مخاطب ہو کر کہا لینڈ لارڈ صاحبان یہ سارے کے سارے لینڈس اپنی ہی ملکیت سمجھے اور ان کے چپے چپے پر پرنٹکے پھرتے — ہم کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ صاحب نے گتے دار کو اشارہ کیا اور وہ دونوں آہستہ سے کھسک کر کہیں غائب ہو گئے۔

شیکھر نے مجھ سے کہا یار۔ سالانہ دار بن بیٹھا ہے یہاں بھی۔

لیکن میں بہت اداس تھا۔ اپنے فن کی بے مانگی کا احساس مجھے کچھ کے دے رہا تھا۔ دنیا تک جا کر کوئی پیغام پہنچانے والا ملے تو میں سب سے پہلی بات جو کہلواتا وہ یہی ہوتی کہ اب میرے خاندان میں کوئی شخص بھی یہ پیشہ اختیار نہ کرے۔

ہم دونوں پر پھر وہی رقت کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ دیر یوں ہی بے دلی کے عالم میں ہم بیٹھے رہے۔ بیکایک سامنے کی غار دار جھاری کے جھنڈ میں کچھ ستر ستر سی پیدا ہوئی۔ ایک بہت موٹا تازہ رنگ دھڑنگ آدمی اپنے دونوں ہاتھوں سے

اُجلی پر چھائیاں
اپنی شرمگاہ چھپائے ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں چھپتا پھر رہا تھا۔ تنھوڑی
تنھوڑی دیر سے وہ تھلا کر دیکھنے لگتا۔ اپنے ننگے بدن کو بار بار تڑپ تڑپ کر پہلنا
اس کی بے چینی دیکھی نہ جاتی تھی۔ شکیں نے مجھے کہنی ماری۔ میں کھسک کر اس کے
بہت قریب ہو گیا۔ کہیں ان مراحل سے ہم کو بھی تو نہیں گزرنا ہے شیکھر لیکن شیکھر
اب چھٹی پھٹی آنکھوں سے ننگ دھڑنگ آدمی کے اطراف ہوا میں اڑتے ہوئے
بے حساب کفن دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ہراساں
بڑھ رہی تھی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب سانس رک جائے گی۔
لیکن پھر خیال آیا کہ صاحب نے کہا تھا کہ یہاں سانس رک جلنے کا کوئی سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ یہ سوچ کر اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس لیے کہ مر جانا بھی یہاں بس میں
نہ تھا۔ ننگ دھڑنگ آدمی اچھل اچھل کر کسی نہ کسی کفن کو پکڑ لیتا چاہتا
تھا لیکن کفن تھے کہ اس کی گرفت سے صاف پڑ نکلتے۔ شرٹ پ شرٹ پ آوازیں آتی
اور وہ تڑپ تڑپ کر کھینچ لوٹے لگتا، کبھی بے ستاشہ بھاگے لگتا۔

ہمیں کو اکب کچھ....

اپنی شرمگاہ چھپائے ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں چھپتا پھر رہا تھا۔ تنہوری تنہوری دیر سے وہ تلملا کر بیچنے لگا۔ اپنے ننگے بدن کو بار بار ترپ ترپ کر سہلاتا اس کی بے چینی دیکھی نہ جاتی تھی — شکیر نے مجھے کہنی ماری۔ میں کھسک کر اس کے بہت قریب ہو گیا۔ کہیں ان مراحل سے ہم کو بھی تو نہیں گزرنا ہے شکیر لیکن شکیر اب چھٹی آٹکھوں سے ننگ ڈھڑنگ آدمی کے اطراف ہوا میں اڑتے ہوئے بے حساب کفن دیکھ رہا تھا — سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ہراسانی بڑھ رہی تھی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ایسا معلوم ہونا تھا کہ اب سانس رک جائے گی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ صاحب نے کہا تھا کہ یہاں سانس رک جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوچ کر اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس لیے کہ مرجانا بھی یہاں بس میں نہ تھا — ننگ ڈھڑنگ آدمی اچیل اچیل کر کسی نہ کسی کفن کو کمپرٹ لینا چاہتا تھا لیکن کفن تھے کہ اس کی گرفت سے صاف پرچ نکلتے۔ شرپا شرپا آوازیاں آتی اور وہ ترپ ترپ کر کعبی لوٹنے لگتا، کبھی بے تحاشہ بھاگنے لگتا۔

صاحبِ اطمینان سے باتیں کرتا ہوا اپنے گتے دار کے ساتھ ادھر آ رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی ہمارے چہرے خود بخود دمک اٹھے۔ ہم لپک کر صاحب کے قریب ہو گئے۔ اب کے صاحب کے ساتھ ساتھ اس کے گتے دار نے بھی یہیں حقارت سے دیکھا۔ میں نے بہت خوشامد سے ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حنا سے سوال کر ہی لیا کہ یہ کون مظلوم ہے؟ صاحب بھڑ گیا۔ تو تم نے یہاں ڈاکٹری کا پیشہ ترک کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ظالم معین مظلوم دکھائی دیتا ہے! یہ کپڑوں کا بیوپاری ہے، جنگ کے زمانے میں جب کپڑا بہت

اُجلی پر چھائیاں
 منہ کا ہو گیا تو اس نے کفن بیچنا شروع کیا اور اسی بہانے اس نے بڑے بڑے پرتے
 حاصل کیے۔ مردوں کو کفن کے لیے ترسا ترسا کر اس نے زندوں کا حق ڈھانکا اور
 بے حساب پیسہ ان سے بٹور لیا۔ نہ صرف اسی پر کٹفایا بلکہ باضابطہ نصف درجن پلنے
 کا رندے مقرر کیے جن کا کام صدفیری تھا کہ شہر بھر کی ہر تازہ قبر سے راتوں کو پھیر کر
 لگا کر کفن نکال لاتے۔

یا۔۔ اور میری زبان سے ”اللہ“ نہ نکل سکا۔ اس لیے کہ اس گنہگار فنا
 میں صدفربل سکتے تھے لیکن اس لفظ کے تلفظ کی ادائی نہ ہو سکتی تھی۔ شکیبہ نے
 بہت حقارت سے ننگ و صدفربگ آدمی کی طرف دیکھا۔ میں نے دریافت کیا، صاحب
 اس کے چھٹیوں سماعتی کہاں ہیں؟ صاحب نے بہت ہی یقین سے جواب دیا
 کہ وہ ابھی دنیا ہی میں ہیں۔ ان کے لیے بلائیں نازل کی گئی ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ چھکے
 چھ ایک ہفتے کے اندر اندر یہاں بھیج دیئے جائیں۔ اب تو صاحب سے ہم بے اندازہ
 مرعوب ہو گئے۔ صاحب نہ صرف دوزخ میں پائپ پتیا پھرتا ہے بلکہ اس کو اس کا بھی
 علم ہے کہ دنیا کو یہاں سے کیا کیا احکام صادر کیے جاتے ہیں۔ میں صاحب سے کچھ اور
 پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

کیا تم اس آدمی کو پہچانتے ہو۔

گھبراہٹ میں میں نے منہ سے جھوٹا موٹ نکل گیا کہ ہاں اچھی طرح جانتا ہوں۔
 صاحب نے پیٹھ ٹھونکی اور کان میں کہا کہ بلیک مارکٹ کیا ہوا اور قبروں سے
 چرایا ہوا بے شمار کپڑا یہاں اس کے نام سے اسٹور کیا گیا ہے جو بروز حشر اس کی
 بیویوں کے حساب کتاب کے وقت گزروں سے نہیں سیلوں سے ناپا جائے گا لیکن اس

اجلی پر چھائیائیں
 بدبخت کی روح تڑپ تڑپ کر ابھی اُسی سمت بھاگتی ہے جہاں یہ کپڑا اسٹور ہے۔ تم اس
 سے کہہ دو کہ اگر وہ تین حصے ہمیں دے سکتا ہے تو ہم نہ صرف اس پر نازل ہوئے
 عذابوں کو کم کر دیں گے بلکہ کپڑے کا جو محتاجی حصہ بچا ہوا ہے اس کے اہل و عیال کے
 لیے دنیا میں واپس کر دیں گے۔ اگر وہ سارے کا سارا کپڑا ہمارے حوالے کر دے تو
 اس کے ساتھیوں میں سے ایک نہیں دو کی جس کی بھی وہ سفارش کرے جاں بخشی کی
 جائے گی اور دنیا میں مزید دو سال، دو ماہ، دو دن، دو گھنٹے، دو منٹ، دو سکندریہ
 کی اجازت دلوادیں گے تاکہ اس طویل مدت میں وہ دونوں اس کے اور اپنے اہل و
 عیال کے لیے مستقبل کے کچھ سامان فراہم کر سکیں۔ صاحب کی یہ باتیں سن کر
 میں سسر بیر تک کانپنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے صاحب کا دماغ خراب ہو گیا ہے
 وہ یہاں بھی بالکل دنیا ہی کے انداز سے کاروبار چلا رہا ہے۔ مجھ کو خاموش
 دیکھ کر صاحب نے پھر کرنا شروع کیا۔

ڈاکٹر تم پس و پیش کیوں کر رہے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ سودا میں اپنی منفعت
 کی خاطر کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمارا
 یہ دوزخ جو جنت کے مقابلے میں پوچ اور پچ ہے اتنا ترقی کرے اتنا ترقی کرے
 کہ سارے جنتی ہم باشندگان جہنم اور اہالیان دوزخ پر رشک کرنے لگیں۔ تم پڑھے
 لکھے ہو اور دیکھنے سے بھی کافی انٹلیکچوئل معلوم ہوتے ہو۔ ابھی صاحب نے جلد پورا
 نہیں کیا تھا کہ ایک میرلی سی گھنٹی کی آواز آئی اور جھٹ سے صاحب نے اپنا پاپ
 اپنے منہ سے نکال کر ہوا میں اچھال دیا۔ ہم نے دیکھا کہ صاحب سے عجیب شکل تین چار
 قدم کے فاصلے پر پاپ ہوا میں معلق آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا اور خوشبودار

اُجلی پرچھائیاں
دھویں کے سمجھکے اس میں سے نکل رہے تھے۔ میں نے اوشیکھ نے ایک دوسرے کو
دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوئے اور ہم سمجھ گئے کہ دوسرا دن ہو گیا ہے
اور آج فشتہ کی باری ہے اور یہ فرشتہ ہی ہے جو پائپ پی رہا ہے۔

صاحب مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔ ہاں تو میں یہی کہہ رہا تھا کہ ”میں نے اندازہ
لگایا ہے کہ ہم اپنی دوزخ کو بہت ترقی دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے صرف راتخا کی ضرورت
ہے۔ راتخا جو انسانوں اور فرشتوں کے فرق کو مٹا دے اور میں نے بہت سے فرشتوں
کو اپنا لیا ہے۔“ پھر صاحب نے نہایت ہی صفائی سے آنکھ مار کر کہا۔ ”ڈاکٹر
تم ابھی نہیں جانتے۔ فرشتوں کی قوم بڑی سیدھی سادھی ہے بہت بھولی بھالی۔“
اور جھپک کر چپکے سے کان میں کہنے لگا۔ ”نہایت سادہ لوح اور۔۔۔“ بات
کاٹ کر مسکراتے ہوئے میری باہنہ پر چٹکی لے لی۔ میں خوش تھا کہ چلو یہاں کی
ایک صاحب اقتدار شخصیت سے کچھ نئے تکلفی تو بڑھ رہی ہے۔

معلق پائپ ہوا میں جلد جلد حرکت کرنے لگا اور دھویں کی چادروں کی بجائے
گول گول بے شمار دھویں کے مرغولے ہمارے اطراف پھیل گئے۔ فرشتہ اپنی
تعریف سن کر شاید کچھ ترنگ میں آ گیا تھا۔

صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”ڈاکٹر ذرا اس بات پر بھی تو غور کرو کہ قدرت نے
خود ہماری ترقی کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ یہاں کون نہیں ہے جس کی دماغی صلاحیتوں
پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ بڑے بڑے مفکر، فلسفی، شاعر، ادیب، انجینئر، سائنس دان، ایکٹر، سب
اور پھر ڈاکو، بلک مارکیٹرس، جیب کترے جب قدرت نے خود اس چھوٹے سے خطے
میں اہل ثروت، اہل ہنر اور اہل دماغ جمع کر دیے ہیں تو یہ خطہ ہوش مندان و

اُجلی پرچھائیاں
 فنِ دال، کس طرح کسی ایسی جنت سے پیچھے رہ سکتا ہے جہاں نہ اہل دل ہیں نہ اہل
 دماغ۔ میں نے سچہ جھری جھری سی لی۔ صاحب کی زبان پر کوئی بندش نہیں ہے۔ جوجی
 چاہا بکتا رہتا ہے۔ کسی کسی برگزیدہ ہستیاں جنت میں ہوں گی ان کے متعلق اس طرح
 کھلے بندوں تو یوں آمیز الفاظ زبان سے نکالتے ہوئے بھی لوپس و پیش نہیں کرتا اور
 فشتے صاحب ہیں کہ صاحب کے پاس ہی کھڑے اطمینان سے پائپ پی رہے ہیں جیسے
 کچھ موہی نہیں۔

گتے دار صاحب کی باتیں سُن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس کی باچھیلی ہمیشہ
 کھلی رہتی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ صاحب یہ سب اہل ہنر اور اہل فن کہاں ہیں
 جن کا ابھی آپ نے تذکرہ کیا۔ صاحب نے راز دارانہ طور پر کہا کہ سب قید تنہائی جگت رہے
 ہیں۔ حاکمانِ جزا و سزا نے خاص طور پر فرشتوں کو تاکید کی ہے کہ کسی پُرسے لکھے آدمی کو
 کسی پُرسے لکھے آدمی سے نہ ملنے دیا جائے لیکن تم کسی سے کہنا نہیں، خفیہ ملاقاتیں جاری
 ہیں۔ ہم ایک دوسرے مل رہے ہیں۔ پلان تیار ہو رہا ہے، ساری چیزیں فراہم
 ہو جانے کی توقع ہے۔ صرف کپڑے کی قلت ہے لیکن کیفن چور نہیں مانگا۔ ویسے جی ہمارا
 ملیں تیار ہو جائیں گی تو ایک سے ایک عمدہ کپڑا ہیں دستیاب ہو جائے گا لیکن فی الوقت
 ہیں اس کن چور کے اشاک کی ضرورت ہے جو فوراً کام میں آسکے۔

میں نے دست بستہ پوچھا کہ صاحب کپڑے کی اس قدر شدید ضرورت کیوں
 لاحق ہوئی۔ صاحب نے شکم کو ذرا ہٹ جانے کے لیے انگلی سے اشارہ کیا۔ جب وہ
 پار قدم پیچھے ہٹا تو صاحب نے دو قدم مجھے قریب کیا اور ایک قدم خود قریب ہو کر کہا
 کہ جب جسمانی اذیت پہنچا کر ہر ایک کو قید تنہائی کی سزا دے دی جاتی ہے تو اس کے

اجلی پرچھائیاں
 بدن پر جو بھی کپڑے رہتے ہیں وہ اتار لیے جاتے ہیں۔ کپڑے اترتے ہی ایک آدمی کو
 آدمی کو نظر ہی نہیں آتا، اور اس طرح ہمیں ایک دوسرے سے ملنے میں بڑی دشواری
 ہوتی ہے۔ ایک انگریز ٹیلی کمیونیکیشنز کے خدما حاصل کر لی ہیں۔ کپڑے فراہم ہو جائے تو
 ہمیں ایک دوسرے سے ملنے میں سہولت ہوگی۔

میں نے پوچھا کہ صاحب سچر آپ جو اس طرح اطمینان سے سوٹ پہنہ پھر رہے
 ہیں؟ یہ کہاں سے آگئے۔ صاحب نے جواب دیا کہ ڈاکٹر، میں اور یہ گئے دار صاحب
 مختلف حادثوں میں دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ میں ہوائی جہاز کے حادثے
 میں ہلاک ہوا تھا جب کہ امریکی مزید علمی ٹریننگ کے لیے دوسری بار جارہا تھا۔ اس
 وقت بھی سوٹ میں نے زیب تن کیا تھا۔ میری لاش میسر اہل و عیال کو نہ مل سکی
 اگر مل جاتی تو دو گڑ گڑن کا کپڑا ہی وہ لوگ میسر ساختہ کر دیتے۔ یہی حال ان گتے دار
 صاحب کا ہے۔ یہ قوم کے ہندو ہیں۔ ملک و قوم کے بھی خواہوں میں ان کا نام سرفہرست
 رہا ہے۔ مجبوری انسان سے کیا نہیں کرواتی۔ ایک ریلوے برج تعمیر کرواتے وقت
 انھوں نے کافی کمایا لیکن جب ٹرین پل کے نیچے گری ہے تو اپنے اہل وطن کو انکھوں
 کے سامنے دم توڑتا ہوا وہ کس طرح دیکھ سکتے تھے۔ وہ خود بھی مرنے والوں میں
 چپکے سے شامل ہو گئے۔ اس وقت اسی پینٹ شرٹ میں وہ ملبوس تھے۔ دو ریکیوں
 جاؤ بھی تم لوگ خود اپنے ہی کو دیکھ لو نا۔ کون کہتا ہے کہ تم دونوں کی طبعی موت
 واقع ہوئی ہے۔ شکار کے وقت جیب ایک کنویں میں گر گئی اور تم لوگ یہاں پہنچ گئے۔
 ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی غیبی قوت نے شیکر کی گردن پکڑ لی اور
 اس کو ایک شیشے میں توڑ مڑ کر اتارنے لگا۔ شیکر کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں۔ اور وہ بے تحاشہ

اُٹلی پرچھائیاں
 ہیں کو اکب کچھ...
 چنچ رہا تھا۔ صاحب نے پوچھا کیا تم دونوں شرابی ہو۔ یہاں شرابیوں کی سی
 سزا ہے۔ ہیں نے کہا کہ صاحب صفت شوق کرتے تھے اور وہ بھی صرف ”بیر“ اور ”جن“
 سے۔ اس کے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے اپنی گردن پر کسی آہنی پنچے کی گرفت محسوس
 ہوئی۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور اس کے بعد مجھے ایک شیشے میں ٹھونسنا جانے
 لگا۔ میری ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اس کے بعد
 مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

جب مجھے ہوش آیا تو مجھے صفت سنا دیا ہے کہ ایک طویل مدت تک میں بے اندازہ
 تکلیف اور درد میں بسر کرتا رہا اور اس پوری مدت میں دل و دماغ پر غم و اندوہ کا
 اس طرح بوجھ رہا کہ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا دل پھیل کر اپنی
 ہیئت ترک کبی بدل چکا تھا۔ جب فرشتے نے مجھے غار سے اوپر پھینکا تو میں بالکل اس
 طرح ایک جیل میدان میں آگرا جیسے ایک لڑکے کی گیند جس کو ہوا میں اچھال کر زمین پر
 ٹپ کھانے سے پہلے ہی لڑکے نے مچلا دیا ہو کہ اس نے گیند اچھالی تھی ہوش و حواس
 بجا ہوئے تو مجھے پتھر کے تراشے جانے کی سُرلی آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ
 آواز میں نے دنیا میں بارہا سنی تھی۔ یقیناً کہیں کوئی شاندار عمارت تعمیر ہو رہی تھی
 میں آہستہ آہستہ آواز کے رخ پر بڑھتا گیا۔ جوں جوں میں اس آواز کے قریب ہوتا
 گیا یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں دنیا میں واپس سجوا دیا گیا ہوں۔ جب ذریعہ تعمیر بلندنگ کے قریب
 پہنچ گیا تو بے شمار لوگ کام کر رہے تھے۔ طبل یا رغاں جو ٹینس کا بہترین کھلاڑی تھا
 اور جو میضے سے مراد تھا وہ ٹینس کورٹ تیار کر رہا تھا اور اس کا منہ کچھ روں سے
 بھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو بے تحاشہ لپٹ گیا۔ کہنے لگا کہ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے طویل

اُجلی پرچھائیاں
 قید تنہائی نے میرے دل و دماغ کو شل کر دیا تھا۔ میں سہما ہوا تھا۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔
 خاموشی ہی میں مجھے خیریت نظر آئی۔ میں نے صبر اتنا پوچھا۔ یہ سب کیا ہے اور تم یہاں
 بھی کھاتے رہنے کی عادت سے باز نہیں آتے۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ ڈاکٹر وہاں تو
 تمہارے پیٹے "ٹولیفی" کا ڈر تھا جس کے آگے تمہاری ساری علینت گھٹنے ٹیک چکی تھی
 اور میں چپکے سے ادھر آ نکلا تھا۔ یہاں خواہ کچھ ہو چڑیل موت تو ہے نہیں جو میں اپنا
 منہ بند رکھوں۔ بس جو سامنے آجائے کھاتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے جنت میں آم
 نہیں۔ ایک ٹن کھجور دے کر جنت والے صاف دس پونڈ آم قبول کرنے کے لیے تیار
 ہیں لیکن ہماری ہمر کا لہجی سوچ رہی ہے۔ میں ششدر تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا
 ہے؟ کیا یہ وہی دوزخ ہے۔ لیکن ہر سانی نے مجھے کھل کر بات کرنے نہ دیا۔ بس ٹکڑ ٹکڑ
 دیکھے جا رہا تھا۔ بل یا رخاں نے کہا۔ ڈاکٹر اس قدر حیران کیوں ہو۔ جاؤ کچھ گھوم پھر کر
 آؤ طبیعت سنبھل جائے گی۔ آگے بڑھا۔ بڑھتا گیا کہیں سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں کہیں
 باغات کا پلان ڈالا جا رہا تھا۔ میں چپ چاپ ساری چیزیں دیکھتا رہا۔ چلتا رہا۔
 دیکھتا رہا۔ آبادی جہاں ختم ہو گئی تھی اس سے کچھ فاصلہ پر کچھ اور کام ہو رہا تھا۔ کام
 کرنے والے سارے کے سارے بھلک سفید لوگ تھے۔ میں نے ڈرتے ہوئے ایک نوجوان
 کو روک کر پوچھا کہ کیاں یہاں کیا بن رہا ہے۔ نوجوان نے مجھے سے پرہیز کر دیکھا۔
 غالباً قید تنہائی کا ٹکڑا بھی چھوٹے ہوئے میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ کہنے لگا
 ایرودرم بن رہا ہے اور ایرودرم سے دو فرلانگ ہی پرسیس کی تجزیہ گاہ تیار
 ہو رہی ہے۔ دیکھنے کے قابل عمارت ہوگی۔ دعا کرو کہ "اموف" کو ہم جنت سے اغوا
 کر کے یہاں لانے میں کامیاب ہو سکیں۔ ان کے بغیر "دو زخیادانا" کی بہت بے چینی

اٹلی پر چھائیاں
 ہیں اور کہتے ہیں کہ ارموف آجائے تو جنت کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہے گی۔
 میں نے پوچھا یہ دونوں کون ہیں۔ نوجوان نے کہا کہ یا تم بھی کیا دو اٹل آف ڈیٹ“
 آدمی ہو۔ یہی تو وہ ہیں جنہوں نے روس میں اسپنک تیار کیا تھا۔ ارموف دراصل ایک
 کوئی ایسے نیک آدمی نہیں اور نہ ان کو ان کی نیکیوں کی بناء پر جنت میں رکھا گیا
 ہے۔ حاکمان سزا و جزا کو ڈرتے تھے کہ وہ بھی ————— ”دور خیاں انا و سکی“ کے ساتھ یہاں
 جہنم میں رہیں گے تو دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا کر دیں گے۔ اسی لیے ان دونوں کو الگ
 الگ رکھنا مقصود تھا۔ ”ارموف“ کو جنت مل گئی۔ بھی سیاست بھی تو کوئی چیز ہے
 اس مسئلہ پر حاکمان جبر و قدر اور حاکمان جزا و سزا میں اختلافات بھی پیدا ہو چکے
 ہیں کہ ارموف کو جنت میں نہیں رکھنا چاہیے تھا کیوں کہ وہاں کی فضا کو وہ متاثر کر دینگا
 میں نے پوچھا حاکموں میں زیادہ اختیارات کس کے ہیں۔ نوجوان نے کہا کہ کیا تم اخبار
 بھی نہیں پڑھتے۔ اخبار۔ میں بس نوجوان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے میری پٹھ
 پٹھکی اور کہا کہ دوست تمہیں نام ہی سے سمجھ لینا چاہیے کہ حاکمان جبر و قدر مقابلہ حاکمان
 جزا و سزا سے بُرے لوگ ہیں۔ اور پھر اسی طرح جھگڑا ہوا آگے نکل گیا۔

شیکھر نے پوچھا۔ ”اس قید تہائی کے بعد شیکھر بے چارہ کہاں رہ گیا ڈاکٹر۔“
 ڈاکٹر نے کہا۔ ہم سے زیادہ گنہگار ہو گا جو آج تک قید تہائی ٹھٹ رہا ہے۔“
 زبیدہ نے فرمائشی حقہ مارا۔

ابو البشر اس سلسلے کو منقطع کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ قہقہوں کی گونج کے ختم
 ہونے سے پہلے ہی اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”پھر کیا ہو ڈاکٹر۔“

ڈاکٹر نے جواب میں کہا۔ پھر کیا ہوتا تھا۔ دوزخ ترقی کر گئی اور پھر آگ نکھل گئی۔

اُجلی پر چھائیاں
ابو البشر نے پوچھا۔ ”یہ تو ہوا تھا راحال چال ہم جنتیوں کے متعلق تم نے کیا
ہیں کو اکب کچھ.....“
کیا دیکھا۔“

ڈاکٹر نے کہا ”بھئی یہ تو خواب ہے۔ اس طرح مسلسل ننھوڑی ہی دکھائی پڑتے
ہیں۔ تین روز تک پھر میں اس دنیا کی سیر ہی نہ کر سکا۔ چونکہ شبِ جنت کے حالات کا
علم ہوا جو تمہیں پھر کبھی سناؤں گا۔ لیکن تم وہاں بھی نہ تھے۔“
سب نے قہقہہ لگایا۔

زبیدہ نے کہا ”بھئی ابو البشر صاحب بہر حال مسٹر شیکھر سے تو برے نہ رہے جو
اب تک قید تہائی کاٹ رہے ہیں۔“
شیکھر نے کہا ”جی ہاں میں بُرا ہوں یا بھلا ہوں آپ کے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ
ہی رہا ہوں۔“

شیکھر کی گردن میں اپنی باہیں حائل کرتے ہوئے ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔
ابو البشر کچھ اس طرح مسکرایا جیسے مسکراتے ہوئے ڈور رہا ہو۔ اس لیے کہ
زبیدہ کھیلائی ہنسی ہنس رہی تھی۔

نیشست ختم ہوئی تو سبھوں نے جیب کا رخ کیا۔
تایا کیوں کے سینے کو چیرتی ہوئی جیب پتی شرک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ کائیڈ
نے یکایک سیدھی جانب موڑنے کے لیے شیکھر سے کہا۔ شیکھر نے اسی اسپڈ میں
جیب موڑ لی تو زبیدہ اچھل کر کائیڈ کے کندھے سے جا لگی۔ سیدھی ہوئی تو بری
خشونت سے اس نے کہا کہ شیکھر صاحب جیب چلائیے تو اس کا بھی پاس رکھیے
کہ ایک لیڈی بھی اس میں سوار ہے۔

اُجلی پر چھائیاں ہیں کو اکب کچھ...

شیکھر نے قہقہہ مار کر کہا۔ جی ہاں جنگل کی ساری ہرنیاں سبھی اس کا خیال رکھیں گی کہ جو چپ ان کے پیچھے دوڑ رہی ہے اس میں ایک شہری ہرنی بھی ہے جو ان کا شکار کرنے کے لیے ان کا تعاقب کر رہی ہے۔

چپ کھیتوں کی ناہموار زمین پر اچھلتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ گائیڈ کے ہاتھوں میں گھومتی ہوئی سرج لائٹ جنگل کی بے پناہ تاریکیوں کو ہر سمت سے جرح کر رہی تھی۔ پہیوں کے نیچے دب کر کھیتوں کی ناہموار زمین پر چٹختے ہوئے ڈھیلے جیسے فریاد کر رہے تھے اور ان کی یہ فریاد صاف سنائی دے رہی تھی۔

زبیدہ نے چپ روکنے کے لیے کہا۔ تو شیکھر نے چپ روک لی۔ ناہموار زمین پر چٹختے ہوئے ڈھیلوں نے چپ سادھ لی اور سناتوں کو گدگدانے کے لیے صرف چپ کے آئین کی آواز اکیلی رہ گئی تو زبیدہ نے کہا۔

”شیکھر صاحب، مجھے شہری ہرنی کہنے کا آپ کو کس نے حق دے دیا۔“

شیکھر نے سبھی لمبے میں تنھوڑی سی دشتی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”سُسن زبیدہ، یہ جی مجھے آپ ہی نے دیا ہے۔ کچھ ہی دیر پہلے آپ ہی نے کہا تھا کہ ہرنیاں بالکل ہندوستانی غارتوں کی مانند ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر نے مصالحت کرانے کے انداز سے قہقہہ لگایا۔

شیکھر نے پوچھا۔ ”اچھا تو یہ بتلائیے کہ آپ نے چپ کو اکیوں لی؟“

زبیدہ نے کچھ جواب نہ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے گائیڈ کو نیچے اتر جانے کے لیے کہا۔ وہ اتر گیا۔ تو زبیدہ کبھر کے برابر بیٹھ گئی اور گائیڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ یہاں کون سے میں بیٹھے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں اچھل کر نیچے نہ جا گروں۔ جب گائیڈ نے کورنر سمجھا لیا تو چپ پھر روانہ ہو گئی۔ گھٹا ٹوپ اندھیروں اور

اجلی پر چھائیاں

ہیں کوالب کچھ...

بے پناہ سناٹوں کو درہم برہم کرتی، جیب اس شان سے رواں دواں تھی جیسے سارے جنگل کی حکمران ہو۔ ایک کھیت کو پیچھے چھوڑ کر جب وہ چھوٹی سی حصار چھلانگ جاتی اور دوسرے کھیت میں دوڑنے لگتی تو سب لوگ اچھل اچھل کر پیچھے بھل جاتے۔ کٹائی چوں کہ ہو چکی تھی اس لیے سوکھے ٹٹھاپنے اپنے نیڑوں کی انی اپنے اپنے سروں پر رکھ کر جیسے اوپر سے آنے والی ہر مصیبت کے مقابلے کو تیار تھے لیکن جوں جوں جیب گزرتی جاتی وہ سرنگوں ہو جاتے اور جو جیب کی زد سے بچ جاتے وہ گویا اپنی جان کی خیر مناتے۔ فضا میں اڑتے ہوئے جگنو آسمان پر شکے ہوئے تاروں کا جواب تو نہ تھے لیکن آسمان کی جانب دیکھنے کی فرصت کس کو تھی۔ جگنوؤں نے اندھیرے کی حکمرانی میں ننھی ننھی چنگاریاں اس طرح جلا رکھی تھیں جیسے موت کے مہیب سناٹوں میں زندگی کے آثار چمک دمک رہے ہوں۔ ستاروں کو دیکھ کر یہ احساس کہاں پیدا ہوتا ہے نرم مٹی کے خشک ڈھیلے چٹخ چٹخ کر اہتے اور سنگ ریزے اڑا کر کر جیب کو محصور کی ہوئی روشنیوں میں رقص کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارا سوا گت کر رہے ہوں۔ شیکھر نے ہیڈ لمپس کے علاوہ دونوں بازوؤں اور پیچھے کی لائٹ بھی جلا رکھی تھی۔ بے پناہ اندھیروں میں گویا اجالوں کا ایک چوٹا سا قافلہ دراتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے چٹ رہے تھے، ہٹ رہے تھے، راستہ بنا رہے تھے۔ باتیں ہیں ختم ہو جاتی تو وہ جانور جو جیب سے دور تھے، دور ہی بیٹھے تماشہ کرتے لیکن گائیڈ کی سرچ لائٹ جنگل کے ہر ڈھکے چھپے ذی نفس خزانے کو اپنے حلقے میں جکڑ لیتی — بے شمار ستارے جیسے زمین پر یکایک چمک اٹھے۔ کبھی بالکل ساکت کبھی متحرک۔ ابوالبشر خوشی سے اچھل پڑا۔ یارب تو باتھ لگ گیا کچھ — سب کے سب ان ٹٹھاتے

اُجلی پرچھائیاں
دیوں کو تنکے لگے جو ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے تھے۔
ہیں کو اکب کچھ...

ڈاکٹر نے زبیدہ کو پچھلی سیٹ سے گدگدایا۔ جو ان جھلملاتے ستاروں اور چمکتے
ہوئے سناروں کی دنیا سے دو کہیں اور ہی تھی اور شاید جیب کے اچھل جانے کی وجہ
سے ابھی ابھی شیکھر سے بالکل قریب ہو گئی تھی۔

زبیدی دیکھ رہی ہو۔ ان ٹمٹماتے دیوں میں سے تانناک چراغوں کو چن چن کر
شیکھر کی بندوق چھونک دے گی اور تھاری آنکھوں کے سامنے ہی ان جھلکی کی شہزادیوں
کا سہاگ لٹ جائے گا۔

لیکن زبیدہ نے ڈاکٹر سے کچھ نہ کہا۔ راستہ شیکھر سے مخاطب ہو گئی۔
مسٹر شیکھر۔ اگر ہر فی خود آپ تک چل کر آئے اور آپ کے آگے کھڑی ہو کر استدعا
کرے کہ آپ اس کا سینہ اپنی گولہوں جھپٹنی کر دیجئے تب ہی آپ اس کو نہیں ماریں گے۔
شیکھر نے کہا میں بڑے چاؤ سے اس ہر فی کو اپنی گود میں اٹھا لوں گا۔ اور
آہستہ آہستہ اس کے نر کی طشر بڑھوں گا۔ جو حسرت سے اپنی مادہ کو میری گود میں دیکھ
رہا ہو گا۔ جب میں نر کے بہت قریب پہنچ جاؤں گا تو اس کو اپنی گود سے اتار دوں گا
جب وہ دونوں انتہائی خوشی کے عالم میں چوڑیاں بھرنے لگیں گے تو میری بندوق
اٹھے گی اور نر کے سینے کو چھید دے گی۔ اور میں آپ کی زبان میں جھلکی کی شہزادی
کی حسرتوں کو دیکھا کروں گا۔

زبیدہ نے قریب قریب چیخ کر کہا تو میر تم یہی سب کچھ کر گزرو شیکھر۔
شیکھر مسکرایا۔ گائیڈ سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔ سرچ لائٹ داہنی
جانب گھماتے رہو۔

اٹلی پر چھائیاں
پھر وہ زبیدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ یہی سب کچھ کر گزرتا لیکن اس
بڑبھبی کو کیا کروں کہ آپ جن کو ہرنیاں سمجھ رہی ہیں وہ چرواہے کا ریوڑ ہے جس میں
بکریاں اور دُنبے اٹیناں سے جگال کر رہے ہوں گے۔ ان کا رکھوالا کوئی چرواہا ضرور
ان کے قریب ہی کہیں سو رہا ہو گا۔ آپ کو شاید اتنا تو معلوم ہی ہو گا کہ میں بکریوں یا
دُنبوں کا شکاری نہیں ہوں۔

لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کسی بھری ہوئی شیرنی کے شکاری بھی نہیں ہیں۔
کوئی بھری ہوئی شیرنی یہاں ہوتی تو میری بدوق سب کچھ سمجھا دیتی لیکن
کوئی مغزور نہ فی سیکر آگے آ کر یہ سمجھ لے کہ میں اسے شیرنی سمجھ لوں گا تو یہ غلط ہے۔
اس لیے سبھی کہیں غلطی کر سبھی جاؤں تو میری بدوق مجھے ٹوک دیتی ہے۔

زبیدہ نے جل کر کہا۔ شکریہ جو آپ نے مغزور کیا نہیں کہا۔
شیکھر پھر مسکرایا۔ اس میں شکریے کی کیا بات تھی مسنر زبیدہ۔ میرا مخاطب
کوئی آپ تو نہ تھیں۔ آپ اس طرح غلط فہمیوں کا شکار کیوں ہو جاتی ہیں۔
ڈاکٹر نے چ میں مداخلت کی۔ شیکھر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کچھ کہتا
ہی چاہتا تھا کہ جیب ایک جھٹکے سے رک گئی۔

کانٹوں کی باڑھ کے متصل ایک خشک باولی تھی۔ بمشکل ڈیڑھ گز کا فاصلہ
رہ گیا تھا۔ اس بار شیکھر چوک جاتا تو جیب اپنے سارے اجالوں اور زندگی کی حرارتوں
کے ساتھ موت کی آغوش میں منہ چھپا لیتی۔ لیکن شیکھر جیب سے کھلونے کی طرح
کھینچتا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ اپنی ہر پسندیدہ شے سے کھلونے کی طرح کھیلنے کا عادی
ہو گیا تھا۔ اس کو شکار کرتا ہوا دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ وہ خود زندگی سے کھیل رہا ہے۔

اُجلی پر چھائیاں
جیب سے بچے بڑی اور بچہ تیزی سے آگے بڑھی۔ بالکل اس طرح جیسے خالی جوتے کے
ڈبے کو ڈوری باندھ کر شیکر کا ننھا بے حارہ دوڑنا چلا جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اس
کے پیچھے پیچھے جوتے کا ڈبہ جو اس کی دانست میں اس کے آگے جیب کا رہے گیند کی طرح
لڑھک رہا ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیب بھی جوتے کے ڈبے کی طرح
لڑھک لڑھک کر سیدھی ہوتی جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس لیے کرشیکر کا ننھا
نہیں خود شیکر جیب چلا رہا تھا۔

سرچ لائٹ فلموں کے سینے میں بھالان کر پیوست ہو گئی تھی۔ تاریکیاں قدم
قدم پر مجروح ہو رہی تھیں۔ گائیڈ سرچ لائٹ آف کر دیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اندھیرے
اُجالوں پر اور نا امیدیاں امیدوں پر فتح پار پی میں لیکن دوسرے ہی لمحے سرچ لائٹ سے
ہرمت اجالے چینک کر گائیڈ پورے جھگل کو اپنی گرفت میں لے لیتا کبھی کوئی خرگوش ایک
جھاڑی سے نکل کر بے تحاشہ بھاگتا اور دوسری جھاڑی میں دبا جاتا کبھی اُجالوں کی
محبت میں رک کر روشنی کے ہالے میں اطمینان سے ناچنے لگتا اور جیب اس کے پاس
ہی سے گزر جاتی۔ کبھی کہیں آنکھیں چمک اٹھتیں تو گائیڈ فوراً فوکس ملا کر ان
چمکتی ہوئی آنکھوں کو روشنی کے احاطے میں محصور کر لیتا تب پتہ چلتا کہ کوئی بیل اطمینان
سے بیٹھا ہوا جگمگا کر رہا ہے یا کوئی گولا چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہر اس
ہے۔ آس پاس دخول پر بھیجے ہوئے پسند ذرا کی ذرا پر پھر پھڑپھڑاتے اور جیب
کے گذرتے ہی پھر اسی درخت پر بیٹھ رہتے۔

ڈاکٹر نے شیکر کے کندھے پر رکھے ہوئے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط کر کے
کہا کہ ڈیر جب زنی اس قدر مصر ہے تو گراہی لو ایک آؤدھ ہرنی بھی۔ ایک ہرنی کی
جان کی جینٹ لے کر تم دونوں کی ان بن ختم ہو جاتی ہے تو کیا برا ہے

اجلی پرچھائیاں
ہیں کو اکب کچھ۔

ابوالبشر نے جو زرا دھیسے سہروں میں انگلٹنا ناشترع کر دیا تھا چپ ہو رہا۔
شیکھر نے ڈاکٹر کی بات سنی ان سنی کر دی۔ جیپ کو ڈاک بنگلے کی سمت موڑتے
ہوئے اس نے کہا کچھ رات گئے پھر آنا چاہیے ڈاکٹر۔ اس وقت تو کچھ ملنے کا امکان نہیں ہے۔
ڈاکٹر اور ابوالبشر نے حامی بھری اور سیک آواز کہا کہ انھیں شدید جھوک بھی لگ رہی۔
ڈاکٹر نے ابھی ایک نوالہ بھی نہیں اٹھایا تھا کہ شیکھر نے روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے
منہ میں رکھتے ہوئے کہا: نہ معلوم تم کب مجھے قید تنہائی سے چھڑاؤ اور میں کب وزرا
کی تہذیبوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔

ابھی بار زبید نے زیادہ دلچسپی لی۔ اجیت کا حال سنانے کا تقاضہ
کرتے ہوئے اس قدر پیار سے اس نے ڈاکٹر کو دیکھا کہ ڈاکٹر نے اٹھایا ہوا نوالہ
پلیٹ میں واپس رکھ دیا۔

ابوالبشر اب کہاں چوکنے والا تھا۔ مرغ کی ٹانگ کو جھٹاپنے دانٹوں سے
نوج کر اس نے کہا کہ ڈاکٹر تم ڈاکٹر نہ بھی ہوتے تو داستان گوئی میں مختار کوئی جواب نہ تھا
گویا یوں بھی زبیدہ تمھارے ساتھ سودا کر کے کچھ گھٹائے میں نہ رہتیں۔

شیکھر نے شہ دی۔ لیجیے مسنر زبیدہ۔ آپ کی ازدواجی زندگی کو آپ کے پسندیدہ
ابوالبشر صاحب کا روبرو باری زندگی سمجھتے ہیں۔

زبیدہ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ جی نہیں وہ تو صرف مذاق کر رہے تھے۔ اب آپ
اپنی دانت میں جو چاہیں تمھیں جو چاہیں معنی پہنائیں رنگ دیں۔

ڈاکٹر نے نوالہ منہ میں رکھ لیا اور بغیر جیسے ہی شیکھر اور زبیدہ کے بیچ میں کود پڑا۔
ہاں تو بھی ایک دن۔ لیکن ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں

اچھی پرچھائیاں
 اکر نکل گیا کہ آئندہ کسی کپٹک میں شیکھر اور زبیدہ کا ساتھ کچھ مناسب نہیں ہے۔ زبیدہ
 جانے کیوں اس قدر زیادتی کرتی ہے لیکن شیکھر بے چارہ مجھ سے دوستی کا حق ادا کرتا
 ہے اور اس کی ہر بات کو انگیز کر جاتا ہے۔

سب اسی طے ردیکھ رہے تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔

ایک دن تم۔

ہاں تو ایک دن میں فلم کمپنی کی بڑی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ جو اسی گتے دار
 کی نگرانی میں تعمیر ہو رہی تھی جس سے میں شیکھر روزخ میں داخل ہوتے ہی ملے تھے
 اور جو صاحب کا چیتنا بھٹلا بالکنی بڑی خوبصورت اور فنکاری کا نمونہ تھی۔ میں بالکنی ہی کو ٹک
 رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ دبایا میں نے پلٹ کر دیکھا تو پرشاد کھڑا تھا میں اس
 سے پلٹ گیا۔ مجھے زبئی سے اپنے عشق کی پوری داستان یاد آ گئی۔

زبئی نے بیچ میں ٹوکا۔ ڈاکٹر صاحب۔ اب یہ عشق کی داستان داستان
 رہنے دیجیے۔

شیکھر نے لقمہ دیا۔ کیوں زبیدہ صاحبہ کیا ہر جہے۔ لگے ہاتھوں ہم یہ
 بھی جو سن لیں۔

زبیدہ نے تیز لگا ہوں شیکھر کو دیکھا۔

ڈاکٹر نے پانی مانگا۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ اور پھر کہنے لگا۔

جانتے ہو شیکھر یہ پرشاد کون تھا۔ یہ وہی پوسٹ میں تھا جو ہسٹل میں زبئی کے

خطوط مجھ تک پہنچا یا کرتا تھا مجھ سے انعام و اکرام کے علاوہ بے شمار دعائیں بھی لیتا۔

ابھی پرچھائیاں
میرادل بھڑ آیا۔ میں نے اس سے رونا نہ ہو کر کہا۔۔۔ پرشا دوس
بنی کو تم نے مجھ سے ملایا (پرشا دوس بنی کو بنی ہی کہا کرتا تھا) موت کے ظالم ہاتھوں نے اس
بنی کو مجھ سے چھین لیا۔ پرشا دوس میری باتوں کا کچھ اثر ہی نہ ہوا۔ وہ بالکل اسی
طرح مسکراتا رہا جس طرح ہاسٹل میں میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اور
اس کی یہی مسکراہٹ میری ہمت بندھاتی تھی۔

مجھے کچھ گمان گذرا۔ میں نے جھٹ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سچ بتاؤ پرشا دوس۔

اور اس نے بندھتی کھول دی۔

ہائیں زبانی کا خط۔ میں نے اچھل کر اپنی باہیں پرشا دوس کی گردن میں حائل کر لیا۔
کیا تم یہاں بھی یہ خدمت انجام دیتے رہو گے۔ تم کہاں ہو، زبانی کہاں ہے۔ تم اس سے
کس طرح مل سکے۔

پرشا دوس کے لب اور آنکھیں دونوں اپنے پرانے ڈھب سے مسکراتے تھے۔ اس
نے میرے کان پر منہ رکھ کر کہا۔

بنی بنی جنت میں ہیں۔ میں بھی جنت ہی میں ہوں۔ چار بار تم سے ملنے کی کوشش
کی لیکن دوزخ میں داخل نہ ہو سکا۔ وہ جو پہلے پرفرشتہ ہے نا۔ بڑا کامیاب ہے۔ آج
کچھ تخی آم اسے بھیجٹ کر آیا ہوں۔ ادھر جنت میں آم صیغی نعمت نہیں ہے۔ نا دیدہ ہے
بے چارہ۔ بس فوراً کھانا شروع کر دیا۔ وہ تو مجھے نظر نہیں آیا۔ البتہ میں نے دیکھا کہ آم کا
رس دو دھاروں میں نیچے ٹپک رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے ہاتھوں پر سے
چھیل کر کہنی تک پہنچ رہا ہو گا۔ بہر حال عاجز ادے مصروف ہو گئے تو میں کھسک آیا ہوں

اچھی پرچھائیاں
ایسے چھوڑ پور پورہ دار بہت دیکھے ہیں۔ ریڈیٹ صاحب کی میم کو سات پہروں سے
گزر کر فوجی کرنل کے خطوط پہنچانے والا پرشاد ہار مانے والا نہیں۔
پیرشاد جانے اور کیا کیا کہتا رہا۔ لیکن میں نے زبی کا خط پڑھنا شروع کر دیا تھا۔
زبی نے لکھا تھا۔

پیارے بہت پیارے — (مقام کا نام بہشت بریں لکھا تھا اور
تاریخ کی جگہ خالی تھی)

تم نہیں تو جنت بھی مجھ کو اک جہنم ہے
جب سے یہاں آئی ہوں سب کچھ حاصل ہے لیکن اداسیاں ہیں کہ چچا جی نہیں
چھوڑتیں۔ تم تک اپنا نامہ محبت پہنچانے کے لیے کیا کیا کوششیں کی ہیں لیکن ایک نہ چلی۔
وہ تو خبر گذری جو پرشاد سے یہاں ملاقات ہو گئی — ٹھہرو دودھ کا پیالہ میرے
منہ سے آگیا ہے۔ مجھے بالکل رغبت نہیں ہے۔ میں انکار تو کر دوں۔ یہاں یہی مصیبت
ہے بس تصور کیا اور چیز آکر منہ سے لگ گئی۔ دراصل ایک میں تم کو صرف یہاں کے حالات
سنانا چاہتی ہوں۔ دودھ یہاں چونکہ بہت وافر ہے اس لیے مجھے لکھنے لکھتے اس کا
خیال آگیا تھا اور وہ منہ سے آگیا۔ ہاں تو میں لکھ رہی تھی کہ پرشاد کو جب میں نے دیکھا
تو مجھے یقین نہ آیا کہ پرشاد اور جنت میں لیکن اس کی خاص مسکراہٹ نے جو یک وقت
ہونٹوں اور آنکھوں دونوں سے پھوٹتی ہے۔ بڑھ کر مجھے گدگدایا اور میں اس سے پلٹ
گئی۔ میری پلکیں جھپک گئیں تو اس نے پچکار کر کہا کہ بیٹا یہاں بھی تو اسی طرح حیران اور
بے چین ہے — پرشاد بہت معاملہ فہم ہے وہ سب کچھ سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ ٹرانیک
لڑکا تھا صرف شراب نے اس کو تجھ سے جدا کر دیا ہو گا، ورنہ وہ بھی یہیں تیرے ساتھ

اٹلی پر چھائیاں
رہتا میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا پرشاد میری چٹھی ان تک پہنچا دو نا۔ پرشاد ایک دم بول کھلا گیا۔
کہنے لگا بیٹا دیوانی ہو گئی ہو۔ دوزخ کی آگ کو سہہ لینے کی مجھ بڈھے میں کہاں سے
قوت آجائے گی۔ میں نے ہنس کر کہا کہ پرشاد کا کاتم کس قدر بھولے ہو۔ تمہیں
یہ سچی نہیں معلوم کہ جنت کا کوئی باشندہ دوزخ میں جا سکے تو آگ اس کے لیے گلزار بن
جاتی ہے۔ راہ کے کانٹے پھول بن کر نکلتے ہیں۔ دوزخ کی آگ میں اتنی مدت ہی
نہیں ہوتی کہ کسی مبتلی کو جھسم کر سکے اور پھر تمہیں معلوم نہیں دوزخ میں تو ایک ہنگامہ
ہے۔ یہاں بڑے بڑے لوگوں میں آج کل دوزخ ہی کے متعلق باتیں ہوتی رہتی ہیں
آج یہی سب سے اہم موضوع ہے جس کی نسبت بڑے بڑے دماغ حیران و ششدر
ہیں۔ کیوں کہ اہل دوزخ نے سنا ہے کہ سخت ہو کر اس بات کا ہتھیہ کیا ہے کہ اپنی دوزخ کو
جنت سے بڑھ کر کچھ بنادیں گے۔ پرشاد نے توبہ کی اور ہاتھ بڑھا کر میرے منہ پر رکھ
دیا۔ کہنے لگا کہ میں تم یہاں سبھی اوٹ پٹا لگ بکے جاتی ہو لیکن اس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ
دوزخ کی آگ اس کا کچھ نہیں بھڑک سکتی تو وہ راضی ہو گیا۔

لیکن ڈیر و اقمی تم لوگوں نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ ہمارے یہاں بڑی بڑی برگزیدہ
ہستیاں تم لوگوں کی کاروائیوں سے متفکر ہیں۔ معلوم ہوا کہ دوزخ کو بالکل دنیا ہی کے سانچے
میں ڈھال رہے ہو۔ بعض وقت یہاں سبھی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں تو ہماری عبادتوں
میں خلل پڑتا ہے۔ خاص طور پر جب گانے کی اور آرکسٹری کی آوازیں آتی ہیں تو بس یقین مانو
میرے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ جاتی ہے اور میں خود کو سنبھال لیتی ہوں۔
پہلے تمہیں جنت سے کچھ سفارت کرالوں تو پھر تمہیں لکھوں کہ تم لوگوں کی دوزخ نے
ہم اہل ارم کو کس طرح پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن وعدہ کر دے کہ تم کسی کو نہ بتاؤ گے۔

اجلی پر چھائیاں

ہیں کو اکب کچھ...

جنت ایک بہت سہانا باغ ہے۔ دودھ کی نہریں اور کھجور کے درخت یہاں بہت
ہیں اور یہی یہاں کے باشندوں کی عام غذا ہے۔ دودھ کی نہر سے بالکل متوازی شہد کی نہر
بہتی ہے۔ چاندنی میں یہ سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سفیدی اور سرخی کی متوازی لکیریں
چاند کی ٹھنڈی روشنی میں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ پھلوں میں زیادہ تر میں توانگور ہی استعمال
کرتی ہوں۔ کھجور کو دیکھنے سے ہی میری طبیعت کدھر ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہ منقش ہو جاتی ہے۔
دودھ اور شہد کی نہروں سے بھی مجھے صرف نظارہ کر لینے کی حد تک لگاؤ ہے۔ ورنہ سچ چھو
تو شہد اور دودھ سے طبیعت اوب گئی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی پینے کی چیزیں ہیں میں تو پانی زیادہ
استعمال کرتی ہوں۔ چلتے چلتے ایک بات یاد آگئی لیکن ڈریس اپنے ہی سینے میں دفن کر لینا
ورنہ سمجھ لو کہ متحاری زنی — بے دریغ مصائب و آلام میں مبتلا کر دی جائے گی کیوں کہ
جنت کی سیاست کو یک کر نے والے کے لیے کڑی سزائیں ہیں۔ فراس کی — جون آت
آرک اور روس کی زویادوں میں ہیں۔ بڑی پیاری بچیاں ہیں۔ ایک سکندر بھی نہیں بھٹکتی
پتہ نہیں کہ ان دونوں نے پانی کی نہر کے کنارے ایک چھوٹا سا گڑھ بنا کر انگور کے کئی
خوشے اس میں ڈال دیئے۔ پرسوں انھوں نے ایک جو کو اس گڑھے کا پانی پلا دیا۔ انگور
سڑ کر شاید پانی میں اپنے خواص منتقل کر چکے تھے۔ بی حورس اس طرح ناچنے ٹھکے اور کھانے
لگیں کہ یہاں کی برگزیدہ ہستیوں کا بھی انھیں کچھ پاس و لحاظ نہ رہا۔ حور صاحبہ کی تین تالی تو
خیر حیرت سے برخاست کر دی گئی جس کا مجھے رنج نہیں لیکن اب ان دونوں لڑکیوں کو آپس
میں ملنے جلنے سے باز رکھا گیا ہے۔ یہ دونوں اداس اداس سی رہتی ہیں۔ سنا جا رہا ہے کہ یہاں
کے انگوروں سے وہ خصوصیات ہی جینی جارہی جو ان کے سڑ جانے سے ان میں پیدا ہو جاتی
ہیں (معاف کرنا نہیں اپنی اولڈ اسمگلر یاد آرہی ہوگی اور مزہ میں پانی آ رہا ہوگا) ہاں تو

اجلی بچائیاں
سنا تب کبھی یہ انگور سڑ بھی جائیں تو ہرے ہرے پھول بن کر کھلیں گے۔
ہیں کو اکب کچھ ...

یہاں ہر کھجور کے درخت کی چوٹی سے ایک یا سو اگز کے فاصلے پر ایک ہلال ہوتا ہے
اور ہر ہلال کے پیٹ میں ایک پشت پہلو جگہ کا تارا۔ پتہ نہیں اس منظر کو دیکھتی ہوں تو مجھے
عرب قوم کے (DOMINATION) کا تصور کیوں آتا ہے اور خود بین نظر بھی تو اپنی جگہ کوئی
دلکش نہیں۔ ویسے یہاں تاریکی یا اندھیرا بہر حال سیاہی کے قبیل کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ گھنے
سے گھنے درخت کے نیچے سائے نہیں ہوتے۔ اجالے ہی اجالے جنت کی خصوصیت ہے۔ یہاں
سایوں، تاریکیوں اور سیاہیوں سے گناہ کا تصور وابستہ ہے اس لیے ہم گھنے سایوں کی ٹھنڈک
سے محروم ہو گئے ہیں۔ تم کسی خوبصورت سے خوبصورت باغ کا تصور کرو اور اس باغ کے
گھنے پتروں سے اس کے ٹھنڈے سایوں کو چھین لو، باغ میں کیا رہ جائے گا، ویسے باغ اہم
مکمل طور پر اپریئل ٹرینڈ ہے۔ حوریں ایک سے ایک حسین ہیں۔ تم یہاں آ جاؤ تو بس دیوانے
ہو جاؤ لیکن یہ بڑی مٹی کے مادہ جیسی ہیں۔ بس خوبصورت سی تتلیاں۔ ہر قسم کے جذبات
سے عاری مگر اس کے باوجود تم یہاں آ جاؤ تو شاید دیوانے ہو جاؤ۔ چچا غالب نے فرمایا تھا کہ
جس جنت میں سو برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کو وہ گوارہ نہیں کریں گے لیکن یہاں
چلتے پھرتے حوروں کو چھیرتے ہیں ایک کو دوسری سے لڑاتے ہیں اور خوشنودار پان کھا کر
اپنی رنگین باجیس پھیلا کر سکر اتے ہیں۔

میں بیس ایک لکھ پائی تھی کہ ایک جنگامہ سا کھڑا ہو گیا ہے۔ لوگ دودھ کی ہنر پر
جمع ہو رہے ہیں ذرا پس دیکھ آؤں کہ کیا قصہ ہے۔

لوبی میں ابھی ابھی دودھ کی نہر سے آکر تھیں پیسہ رکھ رہی ہوں۔ ذرا اپنے
منچلے دوزخیوں کو سمجھاؤ نا۔ یہ کوئی شرافت ہے بھلا۔ کسی نے اٹلی کا پھول چپکے سے نہر میں

اُجلی پرچھائیاں
ہیں کو اکب کچھ...
چھینک دیا ہے۔ نہز منب کی جانب دوزخ سے لگی بہتی ہے۔ یہ کارگذاری غالباً اسی مقام
سے کی گئی ہے ورنہ جنت میں کسی دوزخی کے داخل ہونے کی کیا مجال۔ سارا دودھ پھٹ کر
رہی بن گیا ہے۔ لوگ پریشان ہیں کیوں کہ دودھ ان کی مرغوب غذا ہے۔ اہل ارم دودھ کی
خصوصیات میں تبدیلی کی نسبت سوچ رہے ہیں۔ صرف ایک ننھا را پر شا د خوش ہے کہ
اس کو چھپا چھ ملے گی جس کو وہ زمانے سے بھولا ہوا تھا۔

جنت کے پھلوں میں افسوس ہے کہ آم ہی نہیں ہیں۔ اہل جنت کی اکثریت آم
جیسے پھل کی کمی کو بے طرح محسوس کرتی ہے۔ اسلیم یہ ہے کہ آم کسی ایسی طرح فراہم کر کے شہد
کی نہز میں محفوظ کر دیئے جائیں۔ انہیں معلوم ہوگا کہ شہد میں آم بہتوں تک محفوظ رہتے ہیں میں
خوش ہوں کہ جلو شہد کی نہز کا یہ صرف تو غنیمت ہوگا۔ چنانچہ بمشکل قدرت نے چند آم فراہم
کیے ہیں جو شہد کی نہز میں محفوظ ہیں۔ چچا غالب تو آستین چڑھا کر جب دیکھو شہد کی نہز میں آم
ٹٹولے پستے ہیں۔ پرسوں مرزا شیفقہ کے حصے میں جو دو آم آئے تھے وہ انہوں نے چھپ کر
چٹ کر دیئے۔

لوحی میں اس بد تمیزی سے تنگ آ چکی ہوں۔ مجھے پھر چیڑ رہا ہے۔ یہ ”غلان“ بھی
عجیب الخلق حیوان ہیں۔ مجھے سخت ناپسند ہیں۔ آداب و تمیز سے جیسے واقف ہی نہیں۔
عورتوں سے برتاؤ کرنے کے ڈھنگ سے قطعی نابلد، محبت جتانے کے آداب سے بڑے ناواقف
میں انہیں خط لکھ رہی ہوں اور حضرت گدگدا رہے ہیں۔ میسے رنڈ سے منہ بھڑا رہے ہیں
میں سوچ رہی ہوں کہ مشرقی عورتوں کی ایک یونین بنا کر ان کے خلاف مشترکہ احتجاج کروں
اور اس مسئلے کو اٹھاؤں کہ جب تک ہماری رضامندی شامل نہ ہو ہمیں نہ چھڑیں۔

شیکھ نے فرمائشی تمہقہ لکایا۔ ابوالبشر یانی پی رہا تھا۔ ضبط نہ کر سکا۔ کھل کھلا کر

اصلی پرچھائیاں
ہنس پڑا تو پانی پچکاری کی طرح اس کے منہ سے نکل کر سامنے دھری ہوئی پلیٹ اور چھوٹے
پر جاگرا۔ اس نے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے معافی مانگی۔

زبیدہ بھی ہنسی نہ روک سکی لیکن بہت جلد ہنسی پر قابو پا کر اس نے ڈاکٹر کو ڈانٹا
تھیں میرے تعلق سے ایسی بے ہودہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

ڈاکٹر نے ابوالبشر کو آنکھ ماری اور زبیدہ کو چھڑنے کے لیے کہا کہ زبیدی تھیں تو
”غلطان کی یہ ناشائستہ حرکتیں ناپسند ہیں۔ تم نے کبھی اس کو منہ نہیں لگایا۔ پھر تھیں شرم
کی کیا ضرورت ہے۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا — ڈاکٹر زبیدہ سوچ رہی ہیں تھیں کہیں ان پر
شبہ تو نہیں ہے کہ انھوں نے غلمان “میں کبھی دلچسپی لی ہوگی۔

قبیلوں کے درمیان زبیدہ کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ سٹر شیکھر آپ
اپنی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔

قیقے ختم ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر نے زبیدہ کو کچھ کہنے کا موقع دیتے بغیر پھر
کہنا شروع کیا۔

لیجے میری تشریح روٹی کام آئی یہ حضرت کہیں کھسک گئے ہیں۔
اچھا دیر۔ تم مجھے اس خط کا جواب دینا تو دوزخ کے تفصیلی حالات مجھے لکھنا تھیں
شاید معلوم نہیں کہ تم دوزخیوں نے یہاں کی بڑی بڑی ہستیوں کی نیند اڑا رکھی ہے۔ تھیں
کچھ پتہ بھی ہے کہ دوزخ کے صحیح حالات دریافت کرنے کے لیے اب تک پانچ اشخاص جن
پر یہاں کی برگزیدہ ہستیوں کو بڑا اعتماد تھا، مختاری دوزخ کو بھجوائے گئے۔ لیکن آج تک
کوئی واپس نہ آیا۔ یہاں سب حیران ہیں کہ تم لوگوں نے دوزخ کو ایسا کیا بنا دیا ہے کہ

اجلی پرچھائیاں
جنت جیسی جگہ کے باشندے جلتے ہیں تو واپس نہیں آتے۔ میں کچھ ایسا محسوس کرتی ہوں
کہ اہم کا حکمران طبقہ دوزخ کی ترقی سے صرف اس لیے خائف ہے کہ جنت کی اہمیت
ہی نہیں رہ جاتی اور دنیا والوں کو اگر اس بات کا علم ہو جائے تو بے شمار منچلے دوزخ کی قصید
خوانی ہی کو اپنا شعار بنالیں گے۔ ویسے بھی باوجود جنت کی برتری کے دنیا میں بڑے بڑے
اہل فن نے اس کا مذاق ہی اڑا لیا ہے۔ حالی جو اتنا سب کچھ لکھ گئے، اب ان سے یہاں ہم
لوگ پوچھتے ہیں تو سر سے انکار ہی کرتے پھرتے ہیں کہ یہ شعر ان کا ہے ہی نہیں سہ

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جننی، جتنے ہیں سب ہم سے حد کرتے ہیں

وہ صاف مکر گئے، کہنے لگے استغفر اللہ۔ شعر اور حالی کا۔ اور خود اپنا شعر سنایا سہ

چھیڑ کر واعظ کو حالی خُلد میں
بستر اکیوں اپنا پھینکو اتے ہیں آپ

ہم نے کہا اس شعر میں بھی تو طنز ہے۔ حالی بڑے ہو گئے کہنے لگے مجھے پڑھنے والوں
نے پتہ نہیں دُنیا میں کس کس طرح تباہ کیا۔ اس شعر میں طنز و مزہ کچھ نہیں ہے۔ شعر بید حساس
ہے۔ مفہوم واضح ہے۔ حالی واعظ کی برگزیدہ شخصیت سے واقف ہے، اس کو چھیڑنے کا خیال
اس کے ذہن میں آیا ہے جو شیطان کا کرشمہ ہے لیکن حالی کہاں شیطان کی پکڑ میں آنے والا
وہ فوراً توبہ کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ واعظ کو چھیڑنے سے جنت میں جو ایک بستر حالی کے لیے
محفوظ ہے وہ واعظ چھینکو ا دیں گے۔ اس لیے وہ واعظ کو نہیں چھیڑتا۔ ظاہر ہے کہ حالی
نے اس شعر میں واعظ کے احترام کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اور جنت سے بے پناہ محبت کا اظہار
بھی کیا ہے کہ کہیں جنت سے بستر ا نہ چھینک دیا جائے۔ جہاں حالی بعد میں رہنا چاہتا ہے۔

اُجلی پرچھائیاں ہیں کو اکب کچھ...

جب لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو میں نے موقع کو غنیمت جان کر پوچھا۔ مولانا آپ یہ کیا مفہوم بیان کر رہے تھے۔ بہت رازدارانہ انداز میں انہوں نے جواب دیا۔ یہی مصلحت تھی تو کوئی چیز ہے؟ اور پھر لہجہ کوئی محفوظ کرنا تھا ہے تو بس ایک ہی جگہ جو ہاسٹل کہلاتی ہے۔ سو میں نے جنت کی اب کوئی تعریف کر دی۔ یہی ناکہ اس کو ہاسٹل کہہ دیا ہے۔ اب کیا تم اس کو بھی تعریف ہی سمجھو گی۔ میں بے اختیار ہنس پڑی اور وہ مسکرا کر تیرنے کے لیے چلے گئے دُنیا میں انہیں تیز ناہنیں آتا تھا وہ انتقاماً یہاں زیادہ تیرتے ہیں۔ ۵

شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

میں کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی اہل ارم خاص طور پر یہاں کی برگزیدہ ہستیاں دوزخ کی ہنگامہ آرائی پر بہت متفکر ہیں۔ پہلے جن مولانا کو دوزخ کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا وہ عالی کے وہی واعظ ہیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا تھا۔ لیکن یہ جنت آج تک نہیں لوٹے اس کے بعد ہندو قوم کی ایک بہت بڑی گتہستی نے اپنے اعتماد کی ایک ایسی شخصیت کو اس کام کے لیے مقرر کیا جس کی نسبت ان کو ناز تھا کہ یہ شخص اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کر سکا۔ ان صاحب کو ”نارو منی“ کہتے ہیں۔ گہروں میں اٹھایا یہ شخص ایک ستارے کے برابر ہی اعتماد سے یہاں سے روانہ ہوا۔ اس کے بعد پتہ ہے بے چارے کا شتر کیا ہوا؟ وہی جو ہونا تھا۔ کئی دن انتظار کرنے کے بعد جب یہاں سے یایوس ہو گئے تو اس برگزیدہ ہستی نے جس نارو منی کو اس کام پر متعین کیا تھا بہت دکھی ہو گئی۔ دوسری محترم ہستیوں نے انہیں تسلی دی۔ انہوں نے آخری کوشش کر دی تھی اور ایک میل کے درخت کے نیچے اکڑوں بیٹھ کر آنکھیں بند کیں اور کچھ پرحنا شہر و ح کیا۔ پندرہ منٹ، بیس منٹ، پچیس منٹ آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن اس علم کے زور پر بھی ”نارو منی“

آہلی پر چھایاں
 واپس آیا۔ وقت کے ساتھ ان کا فتنہ بھی بڑھنا گیا اور وہ یہ آواز بلند جھوم جھوم کر پڑھنے لگے۔ اب ایک گھنٹہ پورا ہونے ہی کو تھا کہ لوگوں نے دیکھا کہ ”ماروئی“ نے جو ستار سویتن سے اپنے ساتھ رکھا تھا وہ ہوا میں تیزی سے اڑتا ہوا آکر ان کے قدموں میں گر پڑا وہ انتہائی غصہ کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ماروئی موہ اور مایا کے جال میں پھنس گیا ہے۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو ”ماروئی“ کا دل بھی میری طرف راغب ہوا جب رغبت زیادہ ہوئی تو اس نے ستار چمک کر گیان شروع کیا لیکن جب میں نے اسے واپس بلالینا چاہا اور علم کے زور پر دوزخ سے اٹھا کر معلق کر دیا تا کہ یہاں اس کو کچھ لوں، تو بگخت نے ستار ہی ہوا میں اچھال دیا تا کہ گیان دھیان کی کیفیت ہی ختم ہو جائے۔ وہ تو فوڈ وہیں گر پڑا اور یہ ستار یہاں اڑ آیا۔ انہوں نے غیظ میں ستار کو ایک ٹھوکر لگا فی جُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن ہزار سے بڑے غلگین نغمے پھوٹ رہے تھے۔

میں یہیں تک پڑھ سکا تھا کہ مجھے پرشاد کا خیال آیا۔ کہیں حضرت بھی یہیں کے ہو رہے تو اپنی رتی کے محبت بحرے خط کا جواب اس کے توسط سے بھیج سکوں گا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا پرشاد غائب تھا۔ اس پاس کے ساتھیوں سے پوچھا۔ کہنے لگے جب تم خط پڑھ رہے تھے تو وہ بڑھا بہت خوش خوش اچھلا کودتا اس سمت جا رہا تھا۔ بار بار ایک ایک سے کہہ رہا تھا مجھے چکر نہ دو۔ یہ دوزخ نہیں ہے یہی تو دنیا ہے۔

میرے پیر کے پیچھے سے دوزخ نکل گئی۔ میں چلا یا پرشاد۔ پرشاد۔ دیوانوں کی طرح میں نے ہر طائر جھاگ جھاگ کر اس کو دیکھا۔ وہ کہیں بھی نہ تھا میں پچیس گھنٹوں کی پوری قوت سے چلا یا۔ پرشاد عجیب اور میری رتی پر رحم کرو۔ گہرا ہٹ میں بیوی آنکھ کھل گئی۔ واقعی مسیگر پیر کے پیچھے سے دوزخ نکل گئی تھی۔

اُجلی پر چھائیاں ہیں کو اکب کچھ...

ابو البشر کہنے لگا کہ ڈاکٹر بے چارے کبیر کی تھیں چھ کچھ خبری نہیں ملی۔
ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ یہ نہیں کتنی ہر نیوں کا خونِ ناقص اس کی گروں
پر ہے جو آج تک قیدِ تہائی کاٹ رہا ہے۔

زبیدہ نے مداخلت کی۔ یہ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر، تمہارے شیکھر صاحب کو تو وہی بات
پر زنا رہ کر ان کی بندوق نے کبھی کسی ہر نی کے سینے کو زخمی نہیں کیا۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو مسکرا کر دیکھا۔ ڈاکٹر زبیدہ سے کہہ رہا تھا۔
زبی وہ بندوق سے نہیں، اپنی آنکھوں سے بھی بے شمار شہری غزالوں کو شکار
کر چکا ہے۔ یہ اس کا ہنر ہے۔ اس کا فن ہے۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو بہت گھور کر دیکھا۔ ڈاکٹر تجھ گیا کہ اس نے بے موقع غلط بات کہہ دی ہے۔
ابو البشر نے پہل کی۔ اس کے اٹھتے ہی یکے بعد دیگرے تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

مینر خالی ہو گئی۔ چراسی نے بڑھ کو ٹپس سینٹا شروع کیں۔
لان پر اب بھی کرسیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ابو البشر نے یہاں بھی پہل کی۔ ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر اس نے پائپ جلا لیا

شیکھر نے چھالیہ کا ایک ٹکڑا اور لاپچی منہ میں ڈال لی اور گھلانے لگا۔

ڈاکٹر نے سگریٹ پیش کیا تو زبیدہ نے کہا کیوں ویسٹ کرتے ہو۔

لیکن شیکھر نے یہ کہتے ہوئے سگریٹ لے لی کہ سنہ زبیدہ کبھی تو میں شوق کر ہی لیتا ہوں۔
زبیدہ نے لائٹر سے اپنا سگریٹ جلا لیا اور جلتا ہوا لائٹر ہوا میں یہ کہتے ہوئے اچھا

دیا کہ اب فرشتے کی باری ہے۔

ایک قہقہہ پڑا۔ اور سب لائٹر پر چھپے

ابھی پرچھائیاں
ہیں کو اکب کچھ...
شیکھر نے اچھل کر لائٹر کو کھینچ لیا جو ابھی جل رہا تھا۔ اس کی ہتھیلی جل گئی لیکن اس
نے کسی کو محسوس ہونے نہ دیا۔ اپنا سگریٹ جلا چکا تو لائٹر کو گل کر کے اس نے اپنا کھلا
ہاتھ ڈاکٹر کے آگے بڑھا دیا۔

ہتھیلی پر داغ دیکھ کر ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا۔ ارے فرشتے بننے کی خواہش میں یہ کی کر لیا
شیکھر نے مسکرا کر کہا۔ اس کے باوجود بھی زبیدہ کو میرے فرشتہ ہونے پر شبہ ہے ڈاکٹر۔
ابوالبشر نے ہنسنے ہوئے کہا۔ شیکھر، زبیدہ تمہیں نہ صرف فرشتہ تحقیق ہیں بلکہ وہی عالی ظرف
فرشتہ تحقیق ہیں جو ایک معمولی سے پاپ کی خاطر انجینر کے ساتھ خون معاف کر دیتا ہے۔
تینوں ہنسنے رہے۔ زبیدہ جس کے متعلق ابوالبشر نے سوچا تھا کہ بہت خوش ہو گی مگر
مسکرا کر رہ گئی۔

شیکھر نے عالی ظرف کے لفظ کو دہرایا اور ابوالبشر کو پھر داد دی۔
رقیبوں کی تسلسل اسٹی ٹوٹا بھی نہ تھا کہ زبیدہ نے جاہیاں لینا شروع کر دیں۔ شیکھر نے ڈاکٹر
سے کہا۔ جناب ڈاکٹر صاحب گیل ہو چکا ہے۔ "بوریا بستر سمیٹے"
ڈاکٹر نے دیکھا، زبیدہ واقعی جاہیاں لے رہی تھی۔
کیا اب شکار کو نہیں چلو گی ربی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔
زبیدہ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ اس نے پھر ایک جاہی لی اور مسکرا کر رہ گئی۔

جب ابوالبشر نے اصرار کیا تو اس نے صرف اتنا کہا کہ بشر صاحب آپ کا اصرار ہے
تو میں ضرور چلتی ہوں لیکن نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں۔ سر میں کچھ دھمک سی ہے
آپ معاف ہی کر دیں تو بہتر ہو گا۔

ابوالبشر کچھ کہنے والا تھا کہ زبیدہ نے شیکھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ مسٹر شیکھر کا

اعلیٰ پر چھایاں
 بھی مل گیا ہے ہاتھ کی تکلیف سے زندگی میں پہلی بار کہیں ان کا نشانہ خطانہ ہو جائے۔
 شیکم نے کچھ جواب نہ دیا اور چپ چاپ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔
 ڈاکٹر اور زبیدہ بھی ذرا کی ذرا لالہ پر بیٹھ رہے۔

سگریٹ کا آخری کش لے کر زبیدہ نے سگریٹ پھینک دیا تو ابوالبشر نے کہا: شیکم ہوتا تو پھر
 ایک بار اپنے فرشتہ ہونے کا ثبوت دیتا۔

زبیدہ نے ہنس کر کہا۔ اور اس کوشش میں بیچارے فرشتے کو آگ سے کھیلنے کی
 پاداش میں ایک اور دماغ ہی ہاتھ آتا۔

ڈاکٹر مسکرایا اور زبیدہ کو کمرے میں لے چلنے کے لیے اس کی ہانپہ پکڑ لی۔
 چلو زبئی۔ اب سو رہیں۔

زبیدہ نے کہا۔ جی کمرے میں تو سویا نہیں جائے گا مجھ سے پھلی طرف کیپ
 کاٹس بھیچ کر آسمان تلے کیوں نہ سو رہیں۔

ڈاکٹر نے خوشامد کی۔ زبئی بوندہ ابامدی ہونے کا ڈر ہے۔ نیندا پاٹا ہو جائے
 تو سارا منہ اکر گرا ہو جائے گا۔

زبئی نے بھی ڈاکٹر کو ہچکارا۔ سوچو ڈاکٹر کس قدر حبس ہے کچھ برس بھی جائے
 تو فوراً کمرے میں جا کر پڑیں گے۔

ڈاکٹر کے حامی بھرنے سے پہلے ہی اس نے ملازم کو آواز دی اور کیپ کاٹس
 باہر نکالنے کے لیے کہہ دیا۔

ڈاکٹر بے چارہ بڑی حسرت سے زبئی کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھتا رہا۔

جب دونوں سونے کے لیے چلے گئے تو ابوالبشر نے دروازے پر میز پر اپنا

ابلی پچھائیاں
بستر لگو الیا کیوں کہ اپنی پرانی عادت کے سبب پلنگ پر اس کو نیند ہی نہ آتی تھی۔
اپنے اپنے بستر پر دراز ہوئے تو ڈاکٹر نے زہنی سے شکایت کی۔ آج اس قدر

مرغن غذائیں کھائے میں آئی ہیں اور تم نے کمرے میں سونے سے انکار کر دیا۔ کیا
تم نے میرے اصرار پر بھی کچھ نہیں سمجھا۔

زہنی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تو ڈاکٹر اور جل گیا۔ منہ چھلکا کر اس نے
کروٹ بدل لی۔ زہنی نے تار لیا کہ ڈاکٹر روٹھ گیا ہے۔ اس نے ڈاکٹر کے کان کی لولہ کی
کوٹھلی میں پکڑ کر چیڑا۔

ڈاکٹر نے اس چیڑے چھڑ کے تعلق سے زہنی کے پہل کرنے کو غنیمت جانا اور مسکرا کر
اس کو دیکھا تو زہنی نے جباہی لے کر کہا۔

کیا یہاں کسی نے تم پر میرے ٹھکانے میں جو تم اس قدر ادا اس ہو۔
ڈاکٹر نے زہنی کے ہاتھ کو جوڑتے ہوئے کہا۔ ڈرائنگ یہاں ”پرانی“ (PRIVACY)
کہاں ہے۔ سب کے سونے کا انتظار کرتے کرتے خود میری
ہی آنکھ لگ جائے گی اور تم تو جہاں یہاں لے رہی ہو۔

ڈاکٹر اسی باتوں کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اس نے دیکھا تو زہنی کی
آنکھیں مند رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی چلت پھرت ہل چل اور گھما گھی جیسے
خاموشیوں اور سننا ٹول کے سیکڑاں اور استغناء سمندریں دوپٹ گئی۔
گیم اگر ڈاکٹر نے آنکھ کھولی تو بارش کے موٹے موٹے قطرے ٹپا ٹپ گر رہے
تھے۔ زہنی بستر پر نہ تھی۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ وہ سونے کا انتظام کرنے کے لیے پہلے ہی
کمرے میں چلی گئی ہے۔ اپنا بستر سمیٹ کر اس نے بغل میں دبا اور چکر کاٹ کر ورائڈ

اُعلیٰ پر چھائیاں
ہیں کو اکب کچھ....
کی کٹنسر لپکا۔ برآمدے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ابوالبشر شیکمر کے کمرے کے
بھڑے ہوئے کواڑوں پر کان لگائے بہت غور سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا
ہے۔ پاؤں دبا کر ڈاکٹر اس کے قریب پہنچا تو ابوالبشر کو ڈاکٹر کی آمد کا
احساس تک نہ ہوا۔

تم نامردی کی حد تک مجھے ٹھکرا رہے ہو شیکمر۔ کمرے سے زبانی آواز صاف
سنائی دے رہی تھی جس میں پھری ہوئی شیرازی کا غصہ تھا۔
شیکمر کہہ رہا تھا۔ سوچو تو تم کہاں تک گر گئی ہو زبیدہ۔ جن باتوں کو خطوط
میں لکھتے ہوئے تم نے شرم محسوس نہیں کی آج اپنی زبان پر لاتے ہوئے بھی
تم مجھ نہیں ہو۔ میں جو کچھ ہوں بہر حال تمہارے لیے نہیں ہوں۔
تو پھر میرے خطوط لوٹا دو۔ زبیدہ رو ہانسی ہو کر کہہ رہی تھی۔
خطوط میرے ساتھ موجود ہیں۔ میں اسی وقت لوٹا سکتا ہوں۔ میں نے
سوچ لیا تھا کہ تم اب اپنی حرکتوں سے باز نہ آؤ گی تو تمہارے پانچوں خطوط ڈاکٹر
کے حوالے کر دیں گے۔

دروازہ کھول کر ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا تو شیکمر اپنی پتلون کی جیب
سے خطوط نکال رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ہاتھ بڑھا دیا تو شیکمر نے چپ چاپ
خطوط اس کے ہاتھ میں تمنا دیئے۔

زبیدہ جھپٹی تو شیکمر نے دھکا دے کر اس کو پرے ڈھکیل دیا۔
ڈاکٹر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خطوط کو گھورتا رہا۔ اس کا گلہ زندہ ہو گیا
تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ تم نے آج یہ کس دوزخ میں مجھے

مُجلی پر چھائیال
ڈھکیل دیا ہے زبانی جس کی آگ کو بجھا دینا کسی آدمی کے بس میں نہیں۔ اور
ہیں کو اکب کچھ.....
پھر میں اس قابل بھی تو نہ تھا۔
